قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

www.urducouncil.nic.in

اپریل 2022 قیمت 15₹

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ بچوں کی دنیا
دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس و ٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچّوں کا کتب خانہ

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ زبان شناسی

میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب

بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے　　سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرتعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

مشمولات

ماہنامہ اردو دنیا دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi
قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد: 24، شمارہ: 04، اپریل 2022

مدیر : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد
مشیر : حقانی القاسمی
معاونین: عبدالرشید اعظمی، یوسف رامپوری، نایاب حسن

ناشر اور طابع
ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:
ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/15 روپے سالانہ -/150 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ،
نئی دہلی-110025
فون: 49539000 شعبۂ ادارت: 49539009

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم نئی دہلی۔ 110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in
شاخ: 110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔ 500002
فون: 040-24415194

اداریہ

ہماری بات 4

خطوط

ربط و التفات — قارئین کے خطوط 5

لتا جی کی یاد میں

بھارت رتن لتا منگیشکر
میری آواز ہی میری پہچان ہے — ابرار رحمانی 8
لتا منگیشکر کا جانا ایک عہد کا خاتمہ ہے — صدر عالم گوہر 10
فضا میں ہر وقت گونجتی رہتی ہے
لتا جی کی آواز — فرحان حنیف وارثی 13
لتا منگیشکر کا ایک یادگار اردو سبق — محمد قاسم انصاری 16
اردو کا طلسم اور لتا منگیشکر — منتظر قائمی 18
لتا منگیشکر: ایک افسانوی حقیقت — پرارتھنا سنگھ 21
لتا منگیشکر — فیاض احمد وجیہ 24
لتا ایک عظیم شخصیت — محمد شارب 28
لتا جی کی گائیکی میں اردو تلفظ... — نازیہ 31

زبان و تعلیم

دوران تدریس بچوں کے
نفسیاتی مسائل اور حل — حنا آفریں 33

اردو زبان کا فروغ اور چند مسائل — اشتیاق عالم اعظمی 36

ادب: زاویے اور جہات

تعمیر وطن میں زبان اردو کا حصہ — غضنفر 39
اردو کے فروغ میں متھلانچل کے
غیر مسلم ادبا و شعرا کا حصہ — امام اعظم 41
گلزار نسیم میں ایہام گوئی کی شمیم رواں — سرور مہدی 44
اشک کی شاعری میں خوف اور تنہائی — غلام مصطفیٰ ضیا 47

سلسلہ صحافت

اخبار سحر سامری لکھنؤ — مخمور صدری 49
عالمی تناظر میں اردو میڈیا — امتیاز رومی 54

لعل و گہر

نساخ: حیات و خدمات — ابوالبرکات جیلانی 59

یادیں باتیں

پشکر ناتھ اور میں — نور شاہ 63

عربی ادبیات

متحدہ عرب امارات میں
عربی فکشن کا ارتقا — صہیب عالم 65

نیا آسماں نئے ستارے

ثنا احمد صبر — عبدالرحمٰن شافی 68

کتابوں کی دنیا

تعارف و تبصرہ — ادارہ 70

خبر نامہ

اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 81

ہماری بات

ایک آواز خاموش ہوئی تو ہر طرف سکوت اور سناٹا سا چھا گیا—

ایسا لگا جیسے ایک ساتھ دلوں کی دھڑکنیں اور سانسیں تھم سی گئی ہوں۔ یہ وہ آواز تھی جس میں سوز تھا، ساز تھا۔اس آواز سے صرف ہندوستان نہیں بلکہ پوری دنیا کا گہرا رشتہ تھا۔ وہ دنیا جو شیریں آواز اور سریلے نغموں کی دیوانی تھی۔اس آواز کو سن کر جینے کی تمنا جاگ اٹھتی تھی، اداسیوں کی دُھند چھٹ جاتی تھی۔صرف ہندوستان نہیں پوری دنیا میں یہ آواز گونجتی تھی اور دلوں پر ایک کیفیت طاری کرتی تھی۔اس آواز میں مسحورکن نغمگی تھی۔اس آواز کا ایک چہرہ تھا اور اس چہرے پر ایک چمکتا سا نام لکھا ہوا تھا— 'لتا منگیشکر' جس کی آواز کی شعلگی کو محسوس کرکے سبھی یہی کہتے تھے کہ

شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

لتا منگیشکر نے اپنی آواز کے ذریعے دلوں پر حکمرانی کی۔ان کی سلطنت کا کوئی محدود رقبہ یا علاقہ نہیں تھا، بلکہ جہاں جہاں نغموں کے شیدائی تھے وہاں وہاں اس آواز کی بادشاہت قائم تھی اور یہ بادشاہت سبھی کو بہت عزیز تھی کہ سیدھے دلوں پر اس کا اثر تھا۔ان مدھر گیتوں کے درمیان عوام کی صبح و شام گزرتی تھی اور ایسا بھی ہوا کہ جب دو ملکوں کے درمیان جنگ لڑی جارہی تھی تو اسی آواز نے لوگوں کے دلوں میں حب الوطنی، شجاعت اور بہادری کا جذبہ پیدا کیا اور بہت سے ٹوٹے دلوں کی مسیحائی بھی کی۔جب ہر طرف غم اور مایوسی کا اندھیرا چھایا ہوتا تو اس وقت یہ چمکتی، گونجتی اور ذہن و دل کی ساری تاریکیوں کو روشن کردیتی۔لتا کی آواز میں جب یہ گیت پورے ملک میں گونجا۔

اے میرے وطن کے لوگو ذرا آنکھ میں بھر لو پانی
جو شہید ہوئے ہیں ان کی ذرا یاد کرو قربانی

تو کتنی آنکھیں نم ہوگئیں، کتنی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے اور ملک کے لیے تمام باشندگانِ ہند کے جذبات موجزن ہوگئے۔

لتا منگیشکر واقعی سروں کی ملکہ تھیں، سرسوتی لتا منگیشکر کی آواز میں ہندوستان کی آتما گونجتی تھی۔وہ قدرت کا عظیم تحفہ تھیں۔ان کی گائیکی کی عظمت کا سبھی نے اعتراف کیا۔بلبل ہند لتا منگیشکر کی موت سے ایک خلا سا پیدا ہوگیا ہے۔ان کی سانسیں ضرور تھم گئیں مگر ان کی آوازوں کی سانسیں ہر ہندوستانی کے سینوں میں دھڑکتی رہیں گی۔ان کی آواز ہمیشہ زندہ رہے گی کہ ایسی آوازوں پر موت طاری نہیں ہوتی، بلکہ مرنے کے بعد اور بھی زندگی مل جاتی ہے۔ دنیا کا کون سا ایسا گوشہ ہے جہاں یہ آواز نہ گونج رہی ہو۔ ہر طرف لتا ہی کا نغمہ ہے، انہی کی آواز ہے اور صرف ایک زبان میں نہیں بلکہ 36 زبانوں میں 30 ہزار سے زائد نغموں کی صورت میں یہ آواز ملک کے اطراف و اکناف میں ہر لمحے، ہر پل گونجتی رہتی ہے۔

لتا جی کو بہت سے انعامات و اعزازات بھی ملے۔ بھارت رتن اور نہ جانے کتنے بڑے بڑے قومی اور بین الاقوامی ایوارڈ سے وہ سرفراز ہوئیں لیکن ان کے لیے سب سے بڑا وہ ایوارڈ تھا جو پوری دنیا کے عوام نے محبت کی صورت میں انھیں عطا کیا۔ چاہے کسی بھی مذہب، کسی بھی طبقے، کسی بھی ذات سے تعلق ہو ہر ایک نے لتا منگیشکر پہ اپنی محبت نچھاور کی۔ایسی محبتیں بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہیں جو لتا منگیشکر کو ان کی زندگی اور ان کی موت کے بعد حاصل ہوئیں۔ پورے ملک میں سوگ منایا گیا اور ہر دل نے کمی محسوس کی۔ یہ محبت اس لیے لتا جی کو ملی کہ انھیں خود اپنے ملک اور عوام سے بے پناہ محبت تھی۔وہ ایک مضبوط اور مستحکم ہندوستان کا خواب دیکھتی تھیں اور ہندوستان کی ترقی و خوشحالی کے لیے ہمیشہ دعائیں کرتی رہتی تھیں۔لتا جی کو اپنے ملک اور مٹی سے بے پناہ محبت تھی جو ان کی آواز اور ان کے نغموں سے صاف صاف جھلکتی تھی۔غزل گائیکی میں انھوں نے جو امتیازی شناخت قائم کی ہے وہ بہت کم فنکاروں کو ملتی ہے۔یقینی طور پر لتا جی ہمارے ملک اور عہد کی ایک عظیم علامت تھیں۔ ان کی وفات پر ماہنامہ 'اردو دنیا' کی طرف سے یہ خراج عقیدت ان کے شایان شان تو نہیں پھر بھی کوشش کی گئی ہے کہ اس عظیم گلوکارہ کو بھرپور خراج محبت پیش کیا جائے کیونکہ لتا جی خود بھی محبت اور خلوص کا ایک خوبصورت پیکر تھیں۔

شیخ عقیل احمد

ربط و التفات

ماهنامه 'اردو دنیا' میں 'ربط و التفات' کے تحت قارئین کے خطوط شائع کرنے کا قطعی مقصد نہیں ہوتا کہ محض ستائشی اور تحسینی کلمات لکھے جائیں بلکہ رسالے کے مشمولات کے حوالے سے نئے مباحث پر گفتگو کو آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ ماضی میں مکتوبات بہت سے مضامین سے بھی زیادہ بیش قیمت ہوتے تھے کہ ان میں مشمولہ مضامین کے تعلق سے نئے نکات، مباحث کی نشاندھی کی جاتی تھی۔

قارئین سے گذارش ہے کہ ماهنامه 'اردودنیا' کے مشمولات کے حوالے سے بحث انگیز خطوط ارسال کریں اور ان نئے موضوعات، عنوانات، شخصیات اور علاقوں کی نشاندھی کریں جنھیں نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ آپ کے خطوط ہمارے لیے بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، ان سے ہمیں رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ (ادارہ)

'اردو دنیا' مارچ کے اداریے میں مدیرِاعلیٰ نے بالخصوص اردو زبان کے موضوعاتی دائروں کو وسیع سے وسیع تر کرنے کی فوری ضرورت کو صحیح نشان زد کیا ہے اور ایک بار پھر نئے اور اہم موضوع کے مسئلے کی خط کشی کی ہے، جو کہ ہر ایک مدیر کا اول فریضہ ہوا کرتا ہے۔

'ربط و التفات' کے تحت شائع راقم الحروف کے خط میں ابراہیم اشک کے محولہ شعر کے دوئم مصرعے میں 'ہے' لفظ کی بجائے 'تو' لفظ درج کرنا تھا۔ ڈاکٹر یحییٰ نشیط نے اپنے مقالے میں اردو لفظیات میں تشدید و تکرار وغیرہ کا جائزہ لیتے ہوئے علمِ لسانیات میں گویا ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے، جو کہ لائق ستائش ہے۔

خواجہ میر درد کا مشہور و معروف شعر تھا: ''سیر کر دنیا کی غافل زندگانی پھر کہاں'' جناب ضیا الرحمٰن صدیقی نے اپنے تحقیقی مضمون میں اردو زبان کے متعدد سفرناموں کے فن و روایت کی طویل تاریخ کا محاکمہ پیش کیا ہے جو قابلِ مدح ہے۔

صابر علی سیوانی نے بہادر شاہ ظفر کے ہم عصر شاعر ظہیر دہلوی کی شعری کائنات کا مفصل محاسبہ پیش کیا ہے اور ان کی شاعری کے ساتھ مکمل انصاف کیا ہے۔ عوام میں زبان زد ہو چکے اس شعر نے استاد شیخ محمد ابراہیم ذوق کی یاد تازہ کر دی تھی: ''کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار......'' (ص 24) شعر میں 'محبت' لفظ کی بجائے 'الفت' لفظ بھی دستیاب ہے:
''کچھ تو ہوتے ہیں الفت میں جنوں کے آثار......'' ('خمخانۂ جاوید'، (5)، ص 486)

خواجہ حیدر علی آتش کی شاعری کی نئی قرأت پیش کرنے میں ڈاکٹر محمد نوشاد احمد نے اپنے مقالے میں کوئی بھی کور کسر نہیں چھوڑی ہے۔ ص 28 پر محولہ شعر ''بت خانہ توڑ ڈالیے، مسجد کو ڈھائیے...'' وغیرہ پڑھ کر اُس پنجابی شاعر بلّھے شاہ کی یہ سطور یاد آ جاتی ہیں، جن کو پنجابی زبان کے قومی گلوکار چنچل نے ہندی فلم 'بابی' میں گاتے ہوئے کہا تھا کہ: ''بیشک مندر مسجد توڑو بلّھے شاہ یہ کہتا، پر پیار بھرا دل کبھی نہ توڑو جس دل میں دلبر رہتا۔''

پروفیسر اسلم جمشید پوری نے اپنے تحقیقی مضمون میں سنہ 2021 کے فکشن اور اس کی تنقید پر ایک مفصل مضمون پیش کیا ہے، جو ان کی عرق ریزی کا ایک نمایاں ثبوت ہے۔ ڈاکٹر شہناز بیگم نے بھی ہندوستان میں فارسی زبان کی تاریخ رقم کیا ہے اور اس کے آغاز و ارتقا کا محاکمہ پیش کیا ہے۔ کلی طور پر یہ شمارہ وقیع ہے۔

ڈاکٹر کرشن بھاوک : کوٹھی نمبر 201-A، گورونانک نگر گلی نمبر 18-K، 201-A، پٹیالہ (پنجاب)

'اردو دنیا' دسمبر 2021 کا شمارہ موصول ہوا۔ اس شمارے میں کرامت علی کرامت نے 'دلی کا ایک گمنام شاعر منوہر لال ہادی' کی زندگی، ادبی کاوشیں اور خاص سانیٹ جو 14 مصرعوں والی نظم ہوتی ہے اس کی تشریح و تعبیر پیش کی ہے۔ حیات افتخار نے تمثیل ادب کا خلیل جبران کوی کو عبدالرحمٰن کا علمی و ادبی تعارف پیش کیا اور تقابل بھی کیا ہے۔ نیاز سلطانپوری نے اردو میں بین العلومی تنقید کے نقادوں کی مثالیں دی ہیں۔ اس کے علاوہ محمد احسن، محمد عظمت الحق وغیرہ کے مضامین بھی پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس شمارے میں سابق پرائم منسٹر اٹل بہاری واجپئی کی حیات اور شاعری کے تعلق سے پی پی سریواستو رند اور جگ موہن سنگھ کے مضامین قابلِ ستائش ہیں۔

جنوری 2022 کا شمارہ بھی موصول ہوا۔ زیرِ نظر شمارے میں معزہ قاضی دلوی نے اردو ادب میں خواتین کی نیرنگیاں 1857 کے بعد خواتین کی علمی و ادبی خدمات کو موضوع بنایا ہے۔ عمیر منظر کا تیج بہادر سپرو کی آگہی اور تہذیبی بصیرت کی تعلیمی خدمات اور تصور پر لکھا گیا اچھا مضمون ہے۔ نوشاد حسین نے تحقیق میں اخلاقیاتی ملفوظات کی مثالیں دے کر سمجھانے کی عمدہ کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ اس شمارے میں شاذیہ تمکین، ارشاد احمد، رضی شہاب، دلشاد حسین اصلاحی، زین البشر، صدف کلام وغیرہ کے مضامین بھی پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

فروری 2022 کا شمارہ اس حساب سے خاص ہے کہ اس میں قومی اردو کونسل کے ذریعے مالیگاؤں میں منعقدہ کتاب میلے کی جھلکیاں اس شمارے میں تصویروں کے ذریعے پیش کی گئی ہیں۔ نایاب حسن نے کتاب میلے کی عمدہ اور تفصیلی رپورٹ تیار کی ہے۔ اس کے علاوہ اسلم آزاد نے مخدوم کی شاعری میں تصورِ عشق کی حیثیت سے ان کی شاعری کا بہترین تجزیہ پیش کیا ہے۔ ریاض توحیدی کا پروفیسر ابوالکلام قاسمی کی تنقیدی بصیرت اور خسرو شناسی کے تعلق سے اچھا مضمون ہے۔ ان کے علاوہ سیدہ نسیم سلطانہ، جسیم الدین، مسرت جہاں، محمد شارب، فاطمہ خاتون، فیاض انور صبا، سمیرہ بانو، ذکی ممتاز، محمد توحید خان، محمد فاروق احمد وغیرہ کے مضامین بھی پڑھنے کے لائق ہیں۔

ڈاکٹر محمد ناظم علی: مکان نمبر 335-7-17، برہمن واڑی، یاقوت پورہ، حیدرآباد

پہلی تخلیق پہلا تاثر

ہندوستان میں اردو رسالوں کی تاریخ کے باب پر نظر دوڑائی جاتی ہے تو بے شمار رسالوں کے نام منصۂ شہود پر ابھرتے نظر آتے ہیں جن کی افادیت فی زمانہ خوب سے خوب رہی ہے اور آج بھی ان کے نقوش قائم ہیں مگر مبالغہ آرائی سے پرے قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو، نئی دہلی کا شائع کردہ رسالہ 'اردو دنیا' کو دیکھا جائے تو یہ رسالہ سابقہ تمام رسالوں سے منفرد ہے بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اسے تمام رسالوں پر فوقیت حاصل ہے کہ اتنا معیاری، خوبصورت اور دیدہ زیب رسالہ جو صوری اور معنوی اعتبار سے مزین اور کارآمد ہو، کسی رسالے کے حصے میں نہیں آئی۔ اللہ کرے اسے قیامت تک دوام حاصل ہو جائے۔

راقم سائنسی ادب کا شہسوار نہیں تو سائنس کا ادنیٰ طالب علم ضرور ہے اور سائنسی ادب پر مشاقی ہنوز کر رہا ہے۔ میرے سائنسی ادب کی دنیا میں داخل ہونے کی وجہ انجمن فروغ سائنس، نئی دہلی کے نظریات کا ترجمان رسالہ 'ماہنامہ اردو سائنس' ہے۔ بات 1995 کی ہے جب یہ رسالہ منظر عام پر آیا تو مدیر محترم جناب ڈاکٹر محمد اسلم پرویز (سابق وائس چانسلر: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی) نے چند کاپیاں تحفتاً بھیجیں۔ میں نے ایک مضمون 'نقیاً غورث۔ ایک مطالعہ' لکھ کر کے بغرض اشاعت بھیج دیا۔ انہوں نے میرے تعارف کے ساتھ مضمون کو مارچ 1995 کے شمارے میں شائع کر کے میرے جوابی خط میں لکھا کہ "مضمون اچھا ہے لیکن تشنگی کا احساس ہوتا ہے لیکن آپ لکھتے جائیے اور بھیجتے جائیے۔" بس یہ وہ جملہ جس وجہ سے میں سائنسی ادب میں شامل ہو گیا۔ لہٰذا مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی جھجھک نہیں کہ میرے لکھنے لکھانے کا اصل محرک ڈاکٹر محمد اسلم پرویز ہی ہیں۔ موصوف کے اس جملے نے میرے اندر تحریری برقی رو کا کام کیا اس کے بعد میں تواتر سے مضامین لکھتا رہا اور بھیجتا رہا اور وہ مضامین کی نوک پلک سنوار کر شائع کرتے گئے اس طرح سیکڑوں مضامین شائع ہو گئے۔

راقم کا لکھنے لکھانے کا سلسلہ چلتا رہا اور درمیان میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا رسالہ 'اردو دنیا' کا پابندی سے مطالعے میں رہا کہ معاً خیال آیا کہ کیوں نہ ایک مضمون 'اردو دنیا' میں بھیجا جائے لیکن رسالے کا معیار اور قد آور اور نامور مصنفین کی فہرست دیکھ کر خود کو بازیچہ اطفال سمجھنے لگا لیکن بار بار ہمت کرتا مگر ہمت نہ ہوئی۔ کئی دن یہ سوچتے بیت گئے کہ اس رسالے میں کون سا اور کس طرح کا مضمون بھیجوں۔ دفعتاً خیال آیا کہ ایسا مضمون بھیجا جائے جو بچوں کے گوشے (اس وقت اردو دنیا میں موجود تھا) کے لیے منفرد ہو ویسے بھی خاکسار بچوں کے ادب کا شروع سے ہی دلدادہ رہا ہے اور اب بھی اس میں بھرپور دلچسپی رکھتا ہے۔ اللہ کی مدد آئی اور میرے ذہن میں آیا کہ سائنسی مضمون کو مکالمے کا پیراہن پہنا کر تیار کیا جائے جس کی زبان سہل اور سلیس ہو اور اس کے اندر ادب کی چاشنی بھی ہو کیونکہ اس کے بغیر سائنسی ادب فضول ہے۔ اس سلسلے سے راقم کا دس سالہ پرائمری معلموں کی تربیت کا تجربہ بڑا کام آیا اور اب بھی آ رہا ہے جو پچھلے دس سالوں سے خاکسار 'بچوں کی نفسیات' پڑھاتا آ رہا تھا اور اب تو پڑھاتے ہوئے انتیس سال ہو گئے۔ میں نے بجلی کے سلسلے سے بنیادی معلومات پر مشتمل مضمون بعنوان 'بجلی رانی' لکھ کر رسالہ اردو دنیا کو دھڑکتے دل کے ساتھ بھیج دیا اور اللہ کے سامنے سربسجود ہوا کہ اللہ عزت بچا دینا۔ آخر وہی ہوا جو ہونا تھا عربی کے مقولہ 'من جد وجد' یعنی جس نے کوشش کی وہ کامیاب ہوا اور اکتوبر 1999 کے شمارے میں یہ مضمون من وعن شائع ہو گیا اور جیسا کہ ہوتا ہے میری بھی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا یہی نہیں بلکہ بشری تقاضے کی تحت اپنے اندر غرور بھی ابھر آیا کہ میرے اندر لکھنے کی صلاحیت موجود ہے اور ایسا غرور کوشش کے ساتھ کامیابی کی دلیل بھی ہے۔ بات یہیں ختم نہیں ہوئی۔ کچھ دنوں بعد ہی رسالے کی معاون مدیر ارجمند آرا نے جوابی پوسٹ کارڈ پر چند تعریفی جملے تحریر کر کے روانہ کیے اور مزید مضامین بھیجنے کی درخواست کی جو چنگاری کو شعلہ بنانے کے کام آیا۔ اس کے بعد میں اردو دنیا کے بچوں کے گوشے کے لیے پابندی سے مکالمے کے انداز بھی ایک نہیں کئی مضمون بھیجا جو سب کے سب شائع ہوئے۔

ان تمام مضامین کو قومی کونسل نے 'باتوں باتوں میں سائنس' کا نام دے کر 2017 میں کتابی شکل دی ہے۔ میں نے سائنسی ادب اطفال کے لیے نئی صنف کے لیے غوطہ لگانا شروع کیا کہ اچانک دل میں بات آ گئی کہ سائنسی مضامین مکتوب کی شکل میں پیش کیے جائیں اور 200 سائنسی مکتوب لکھنے میں کامیاب ہو گیا ان میں سے 36 خطوط کو یکجا کر کے ایک کتاب 'آؤ سائنسی خط لکھیں!' اور 35 مکتوب کو جمع کر کے دوسری کتاب 'آؤ سائنسی خط پڑھیں!' تیار کی۔ دونوں کتابوں کو قومی کونسل بالترتیب 2017 اور 2020 میں شائع کر چکی ہے۔ اللہ کے فضل سے 50 سائنسی مکتوب پر دو کتابیں تیار ہیں جو اشاعت کی منتظر ہیں۔

راقم نے سوچا کہ اب بچوں کے گوشے سے نکل کر رسالے کے دائیں صفحات میں جگہ بنائی جائے جہاں نامور شخصیتوں کا قبضہ تھا جو ان کا حق بھی تھا۔ لیکن اللہ نے یہاں بھی لاج رکھ لی اور چند مضامین اردو دنیا میں شائع ہوئے جن میں اردو ادب اور سائنس۔ مغربی بنگال کے حوالے سے (نومبر 2005)، اردو میں شائع ہونے والے سائنسی اور طبی رسالے (مئی 2010)، سائنس اور سیاست کی عظیم شخصیتیں (فروری 2011) اور معذور انسان اور کامیاب شخصیت وغیرہ شمارے کی زینت بنے۔

یہ حقیقت ہے کہ زبان و ادب کے فروغ میں رسائل کا نہایت ہی اہم مقام ہے جس کی اہمیت بعض اوقات کتابوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ کتابیں مختلف علوم پر تصنیف کی جاتی ہیں جب کہ رسالوں سے بیک وقت کئی علوم سے استفادہ کرنے کا موقع فراہم ہوتا ہے۔ سچ پوچھیے تو زبان و ادب کی گھر گھر رسائی رسالوں کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ آج الیکٹرانک رسالے بھی منصۂ شہود پر آ گئے ہیں مگر جو بات روایتی رسالوں میں ہے وہ الیکٹرانک رسالوں میں ہرگز نہیں ہے۔

رسالوں کی سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ فرد کے اندر پوشیدہ صلاحیت کا پتا لگاتے ہیں اور اسے اجاگر کرتے ہیں۔ نوآموز لکھنے والوں کو موقع بھی فراہم ہوتا ہے اور وہ لکھتے لکھتے مستقبل میں نامور قلمکار بن جاتے ہیں۔ آپ یقین کریں رسالے نہ ہوں تو نئی صلاحتیں، ذہانتیں اور فطانتیں منظر عام پر آنے سے قاصر رہتی ہیں۔ آپ کسی بھی بڑی تصنیفی شخصیت کی زندگی کی کتاب کے اوراق دیکھیں گے تو پتا چلے گا کہ انھوں نے رسالوں کی وجہ سے ہی اپنی پوشیدہ صلاحیتوں سے لوگوں کو روشناس کرایا۔ سب سے بڑی اور بنیادی بات یہ ہے کہ بچوں کے اندر ادب و احترام کے جذبے کتابوں سے کہیں زیادہ ادبی رسالوں سے ابھرتے ہیں۔ انہی سب وجوہات کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ بعض اوقات رسالوں اور جرائد کی اہمیت کتابوں سے کہیں زیادہ ثابت ہوتی ہے۔

راقم جب کوئی تیس سال پہلے کے رسالوں میں اپنے مضامین کو دیکھتا ہے تو اسے ہنسی بھی آتی ہے اور شرم بھی محسوس ہوتی ہے کہ اس کی تحریر کتنی بھونڈی اور غیر معیاری تھی لیکن یہ رسالوں کی ہی دین ہے کہ آہستہ آہستہ اب تک کم و بیش چار سو مضامین لکھنے میں کامیاب ہو گیا۔ متذکرہ سطور سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ رسالے نہ ہوتے تو نہ زبان کا عروج ہوتا اور نہ ہی ادب کو جائز مقام ملتا۔ اب رہی بات 'ماہنامہ اردو دنیا' کی تو اس رسالے کی افادیت، خدمات اور کارنامے اظہر من الشمس ہیں جو مستقبل میں آب زر سے لکھے جائیں گے۔

☆ **عبدالودود انصاری**: سابق پرنسپل اردو میڈیم گورنمنٹ پرائمری ٹیچرس ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ (مغربی بنگال)

ماہنامہ اردو دنیا کے کالم زبان اور زمینی صورت حال کے لیے سوال نامہ

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں مشاہیر ادب کے انٹرویوز شائع کیے جاتے تھے، یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔ بس اس کی شکل وصورت ذرا سی تبدیل کر دی گئی ہے تاکہ اردو کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کے بجائے قارئین اردو زبان کی حقیقی صورتِ حال سے آگاہ ہوسکیں۔

- زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟
- زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟
- زبان کا تہذیب وثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟
- کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟
- کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟
- موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟
- اردو کا مستقبل کیا ہے؟
- زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جا سکتی ہیں؟
- کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟
- کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟
- آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟
- آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟
- اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کیا جا سکتی ہیں؟
- دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہو سکتی ہیں؟
- کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟
- آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟
- غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟
- ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جا سکتی ہے؟
- سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں اسی سوالنامے کی روشنی میں ان لوگوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جو اردو زبان وادب سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں مگر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوالنامہ ہر اس فرد کے لیے ہے جو اردو کاز اور مشن سے جڑا ہوا ہے۔ اس سوالنامے کے ذریعے ہمیں اردو زبان کے تعلق سے حقیقی صورت حال کا علم ہوگا اور اسی کی روشنی میں فروغ اردو کے لیے ایک روڈ میپ تیار کیا جائے گا۔ اپنے جوابات کے ساتھ سوانحی کوائف مع تصویر درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں: ➢ editor@ncpul.in ➢ urduduniyancpul@yahoo.co.in

ابرار رحمانی

بھارت رتن لتا منگیشکر

میری آواز ہی میری پہچان ہے

بھارت رتن ہو، یا ہندوستاں کا لعل، سبھی فانی ہیں۔ اس لیے سبھی کو ایک دن موت کا مزہ چکھنا ہے۔ سو ہماری دیدی بھی ہم سے رخصت ہو کر چلی گئیں۔ رب دی مرضی، رب ہی جانے، ہم آپ اس میں کیا کر سکتے ہیں۔ لیکن انھوں نے جتنا اور جس قدر نغموں کو اپنی آواز دی ہے وہ انھیں لافانی بنانے کے لیے کافی ہیں۔ وہ آواز جوان کی پہچان ہے وہ آواز جسے وہ خود بھی پہچانتی تھیں اور دنیا بھی۔ جتنی بلندان کی آواز ہوتی تھی اس سے کہیں زیادہ اونچی ہماری سماعت ہوجاتی ہے۔ لتا دیدی کے ساتھ آنجہانی لکھتے ہوئے کلیجہ منھ کو آتا ہے۔ لیکن قدرت کا قانون اٹل ہے۔

خیر جب ہم فانی ٹھہرے اور اس حقیقت سے ہم سبھی بھلی بھانتی واقف ہیں تو شکایت کیسی بلکہ ہمیں خوش ہونا چاہیے کہ ہم جن کی آواز اور انداز کو پسند کرتے ہیں اور جس آواز پر نہ صرف ہمارے کان متوجہ ہوجاتے ہیں بلکہ اکثر و بیشتر ان کی آواز پر ہمارے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ لتا دی جب دیس بھگتی کے گانے گاتی ہیں یا جنگ آزادی سے متعلق یا پھر عام انسانیت کے گانے ہوں ان گانوں کے جب سُر بلند ہوتے ہیں تو اکثر ہم بے قرار اور بے خود ہوجاتے ہیں۔ ہماری آنکھیں خود بخود چھلک پڑتی ہیں۔ ہماری سنجیدگی ماحول کی سوگواری میں تبدیل ہونے لگتی ہے۔ مجروح سلطان پوری کہتے ہیں۔

ایک لمحے کو جو سن لیتے ہیں آواز تیری
پھر انھیں رہتی ہے جینے کی تمنا برسوں

وہ جب کوئی گیت گاتی تھیں اور اکثر وہ اردو کے ہی گیت و نغمہ گاتی تھیں۔ وہ اپنے گانوں کی زبان کو اردو ہی کہتی تھیں۔

سوگواری کے اس ماحول میں لوگ اپنے اپنے طور سے خراج عقیدت پیش کرتے رہے، کوئی پھول، تو کوئی گلدستہ پیش کر کے خراج عقیدت پیش کرتا رہا تو کوئی محض زبانی تحسینی کلمات کے ذریعے مرحومہ کے گھر والوں سے، مرحومہ کی خوبیاں بیان کر کے ان کی مغفرت کی دعا کرتا ہے اور متعلقین کو صبر کی تلقین کرتا ہے۔

لیکن لتا دی جیسی عظیم گلوکارہ کے تئیں جو خراج عقیدت مزمل حق نے جس طرح پیش کیا وہ دوسرے تمام شعبہ ہائے جات کے ارکان و افراد کے خراج عقیدت سے کہیں مختلف اور خوش نما اور قیمتی تھا۔ ان کے مرنے کے فوراً بعد لتا کے گانوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا جو اب تک جاری ہے اور نہ جانے کب تک جاری رہے گا۔ یوں بھی جب ان کی زندگی میں ہی پچھلی چھ سات دہائیوں سے یہ گانے سنے جارہے ہیں اور سر دھنے جارہے ہیں تو اب تو خراج تحسین اور خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے یہ ایک بہترین ذریعہ ہے۔ لیکن آئی، ٹی، بی، پی کے ایک جوان مزمل حق کا خراج عقیدت پیش کرنے کا کچھ اور ہی انداز تھا۔ اس نے لتا دیدی کے گائے ہوئے مشہور گیت۔

اے میرے وطن کے لوگو، ذرا آنکھ میں بھر لو پانی
جو شہید ہوئے ہیں ان کی، ذرا یاد کرو قربانی

کو مزمل حق نے سیکسوفون پر اس انداز میں پیش کیا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی ہماری آنکھیں نم ہو گئیں اور آنسو چھلک پڑے۔ مزمل حق کا یہ ویڈیو دومنٹ 19 سکینڈ کا تھا۔ جسے فیس بک پر بڑے پیمانے پر پیش کیا گیا۔ اور بڑے شوق سے سنا گیا۔ مزمل کا یہ انداز لوگوں کو بہت پسند آیا۔ سوشل میڈیا کے تمام ایپس انسٹاگرام، ٹیوٹر، واٹس ایپ اور گوگل وغیرہ پر خود لتا منگیشکر بھی عام طور پر اپنے مداحوں اور چاہنے والوں کو پیغام بھیجا کرتی تھیں۔ انھوں نے اپنے آخری پیغام میں یکم جنوری 2022 کو اپنے مداحوں اور فینس کے نام نیک خواہشات کی تھی۔ بلاشبہ لتا جی کے جانے سے فلم صنعت کے ایک زریں دور کا خاتمہ ہو گیا۔

لتا جی نے شادی نہیں کی۔ اس کی ایک بڑی وجہ تو یہ رہی کہ وہ فلمی دنیا میں بہت زیادہ مصروف رہیں۔ دوسرے یہ کہ شاید اوپر والے نے ان کی جوڑی ہی نہیں بنائی تھی۔ بچپن میں ہی پتا جی کے انتقال کے بعد پوری فیملی کی ذمے داری ان کے کاندھوں پر آ گئی تھی۔ اور وہ اس ذمے داری کو نبھانے میں شاید بھول گئیں کہ زندگی گزارنے کے لیے ایک ساتھی کی بھی ضرورت ہوتی ہے، لیکن انھوں نے خود کو نغمہ و سرود میں کچھ اس قدر ڈبو لیا تھا کہ انھیں یہ سوچنے کی فرصت ہی نہیں ملی کہ زندگی کا ایک اہم مرحلہ، ایک انتہائی اہم موڑ شادی ہے۔ انھوں نے شادی کی لیکن اپنے پروفیشن سے، اپنے کام سے۔ وہ اپنے کام اپنے پروفیشن کے تئیں کچھ اتنی وفادار رہیں کہ انھیں انسانی خواہش، طلب اور ضرورت کی شدت کا احساس ہی نہیں رہا۔ ان کے لیے ان کا پروفیشن یعنی گلوکاری عبادت بھی تھی اور ریاضت بھی، پوجا بھی اور سادھنا بھی۔ انھوں نے بے شمار فلموں کے لیے بے شمار شادی کے نغمے گائے ہوں گے اور شادیانے بجائے ہوں گے پھر بھی انھیں اپنی شادی کی نہ تو کبھی یاد آئی اور نہ ہی اس کے لیے تگ و دو کی۔

یوں بھی شاعر نے سچ کہا ہے۔

کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا
کہیں زمیں تو کہیں آسماں نہیں ملتا

انھوں نے کم و بیش اپنے 70 سالہ کیریئر میں کتنی فلموں میں کام کیا کتنوں میں اداکاری کی اور کتنی فلموں کے لیے گانے گائے، شاید انھیں خود یاد نہیں تھا۔ انھیں صرف فلم فلم اور صرف فلم کی یاد رہ گئی تھی۔ البتہ انھوں نے اپنے بھائی بہنوں کا نہ صرف کیریئر سنوارا بلکہ ان کی شادیاں بھی کرائیں۔ ان کے گھر میں بلکہ خاندان میں ان کی حیثیت ایک سرپرست اور ایک گارجین کی تھی۔ انھوں نے اسے اپنا فرض سمجھ کر بخوبی نبھایا۔

لتا منگیشکر کا جنم 28 ستمبر 1929 کو اندور کے ایک معمولی کھاتے پیتے گھرانے میں ہوا۔ گھر میں کسی قسم کی کوئی

تنگی نہ تھی لیکن انھوں نے ابھی ٹھیک سے ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا کہ ان پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ان کے پتا جی کا ان کے بچپن میں ہی انتقال ہوگیا اور ان کا خاندان تنگ دستی کا شکار ہوگیا۔ انھوں نے بچپن کے ان دنوں کو یاد کرتے ہوئے اپنی سوانح سُر گاتھا میں بتایا تھا کہ ہم پریشان حال تھے، ماں کے زیورات ایک ایک کرکے بک چکے تھے ناک میں صرف ایک کیل بچی تھی۔ چنانچہ لتا جی نے ان دنوں بہت جدو جہد کی اور جلد ہی ان کی محنت رنگ لائی۔ ان کی بدحالی اور تنگی کے دن بیت گئے اور وہ خوش حالی کی طرف گامزن ہوگئیں۔ انھوں نے سب سے پہلے اپنی ماں کے تمام زیورات ایک ایک کرکے ٹھیک اسی قدر بنوا کے ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اسے کہتے ہیں کوشش کرے انساں، تو کیا ہو نہیں سکتا اور جب 6 فروری 2022 کو ان کا انتقال ہوا تو وہ فلم انڈسٹری کے چند مالدار ترین لوگوں میں سے ایک تھیں۔ اوپر والا کب کسی کو نواز دے یہ وہی جانتا ہے۔ انسان کا کام محنت کرنا ہے؛ ایمانداری شرط ہے۔ ایک انسان کے اندر کون سی صلاحیت پوشیدہ ہے اس کی شناخت وہ خود کرسکتا ہے، لیکن اس کے لیے سنجیدگی، شرافت اور اطاعت لازم ہے۔ لتا جی کی انتر آتما نے اس بات کا بخوبی احساس کرادیا تھا۔ پھر فلمی دنیا میں ان کے خیر خواہ اور چاہنے والوں نے بھی ان کی رہنمائی کی۔ لتا منگیشکر کی یہ سوانح حیات خودنوشت نہیں۔ بلکہ یہ یتیندر مشرا کی لتا منگیشکر سے ایک طویل ترین گفتگو پر مبنی ہے۔ چونکہ لتا منگیشکر کے پاس فرصت نہیں تھی لہٰذا ایک ہی نشست میں یہ گفتگو مکمل نہیں ہوسکتی تھی۔ لہٰذا انھوں نے یہ ترکیب نکالی کہ کیوں نہ روزانہ کچھ وقت اس موضوع پر گفتگو کے لیے مختص کریں۔ سُر گاتھا کے نام سے یہ کتاب گوکہ لتا جی کی سوانح ہے لیکن اسے یتیندر مشرا نے اپنے الفاظ کا جامہ پہنایا ہے۔ اس کتاب میں ان کی زندگی کے شب و روز، دلچسپ واقعات اور موسیقی سے گہری واقفیت کی تفصیل ملتی ہے۔ کتاب کے مرتب ایک اچھے شاعر، ادیب، اور موسیقی کے رسیا یتیندر مشرا ہیں۔ ایک لمبے عرصے تک یتیندر مشرا لتا جی کے گھر جا کر تقریباً ایک گھنٹہ روز ان سے ان کی شخصیت اور فن کے بارے میں مختلف زاویوں سے گفتگو کرتے رہے اور جب وافر مواد جمع ہوگیا تو اسے تحریر کی شکل دی گئی۔

دلیپ کمار نے جب پہلی دفعہ ان کی آواز میں ایک گانا سنا تو بہت متاثر ہوئے لیکن لتا دی کے لہجے میں بوجوہ سلاست اور روانی نہیں تھی دراصل وہ مراٹھی تھیں اور وہ گانا اس زبان کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ چنانچہ دلیپ کمار نے لتا منگیشکر کو اردو سیکھنے کی تلقین کی۔ دلیپ کمار نے تعریف کرتے ہوئے کہا تھا کہ آپ گاتی بہت خوب ہیں لیکن آپ کے گانے میں صحیح تلفظ نہ ہونے کی وجہ سے کہیں کہیں دال بھات کی بو آتی ہے۔

اس وقت سے ہی لتا نے دلیپ کمار کے اس ایک مشورے کو مان کر اس پر عمل پیرا ہونے کے سبب انھیں فلمی زندگی میں بے شمار کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ لتا جی نے پھر تو انھیں اپنا بڑا بھائی اور دلیپ کمار نے لتا جی کو اپنی چھوٹی بہن مان لیا۔ لتا دیدی اپنے بڑے بھائی کو ہر سال پابندی سے راکھی باندھتی رہیں۔ کچھ اس تواتر، تسلسل اور پابندی سے ہر رکشا بندھن پر اس کا اہتمام کیا جاتا کہ لوگ دیکھتے رہ جائیں۔ فلم انڈسٹری کے لیے وہ ایک مثال بن گئے۔ مادیت پرستی کے آج کے اس دور میں ایسی مثالیں ملنا مشکل ہیں۔

دلیپ کمار کے بعد لتا جی کی پیشہ ورانہ زندگی میں جن دوسرے افراد نے کلیدی رول ادا کیا ان میں ایک سب سے بڑا نام میوزک ڈائرکٹر غلام حیدر کا ہے۔ موسیقی کے شعبے میں انھوں نے جس طرح رہنمائی کی تھی وہ لتا جی کی کامیابی کی ضامن بن گئی۔ نوشاد علی جو تب سے اب تک فلمی دنیا کی موسیقی میں سدا بہار نام ہے، انھوں نے لتا منگیشکر کو اس جگہ پہنچایا جہاں آخر تک جمی رہیں۔ اپنے فن کے تئیں جس طرح نوشاد ایماندار اور وفادار بنے رہے اسی طرح لتا منگیشکر نے بھی اپنے فن کے لیے خود کو وقف کر دیا۔

غلام حیدر اور نوشاد علی کی تربیت اور رہنمائی میں لتا نے اپنی آواز کو آراستہ و پیراستہ کرکے گانا شروع کیا تو فلم جگت میں دھوم مچ گئی اور دھیرے دھیرے وہ پوری فلمی دنیا پر چھا گئیں۔ اس غیرت ناہید کی آواز کچھ اس تیزی سے بلندی کو چھونے لگی کہ پرانے چراغوں کی روشنی مدھم پڑنے لگی۔ شاعر نے شاید ان کے لیے ہی یہ شعر کہا ہے۔

اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

اردو کو صحیح تلفظ کے ساتھ جو بولنا چاہتا ہے، وہ لتا جی کے گائے ہوئے نغموں کو سننے کی عادت ڈالے۔ بقول شخصے: پوری فلمی دنیا میں لتا منگیشکر سے اچھی اردو کسی اور کی نہیں۔ لتا جی کی زبان کی درستگی کا سہرا دلیپ کمار کو جاتا ہے، جو اس طرح کے کار خیر بہت کیا کرتے تھے۔

اردو سیکھنے کی تلقین پہلے پہل دلیپ کمار نے کی تھی جسے انھوں نے گرہ میں باندھ لیا اور اردو سیکھنے پر خاص توجہ دی اور جب اردو سیکھ کر گانا شروع کیا تو رشید حسن خاں جیسے ثقہ ادیب نے بھی لتا کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے ان کی تعریف کی۔ 1942 میں والد کے انتقال کے بعد گھر کی مالی حالت کے پیش نظر انھوں نے ہندی اور مراٹھی کی کچھ فلموں میں اداکاری کی تھی، لیکن ان کا اصل میدان گلوکاری ہی رہا۔ چنانچہ دو چار فلموں میں اداکاری کے بعد نغموں کو اپنے سروں سے سجانے اور سنوارنے لگیں۔

عام طور پر کسی بھی انسان کے گزر جانے کے بعد ماحول سوگوار ہوجاتا ہے اور لوگ غم کے اظہار کے لیے ماتمی ماحول بنالیتے ہیں۔ مرنے والے کی خوبیاں بیان کی جاتی ہیں اور مرحوم کے اقربا اور احباب رو لیتے ہیں۔ بعض سسکیوں سے کام چلا لیتے ہیں اور کچھ حضرات اظہار افسوس کرتے نہیں تھکتے۔ لیکن لتا جی کے ساتھ کچھ ایسا ہے کہ وہ اپنی عمر طبعی کو پہنچ چکی تھیں۔ ایک انسان کی زندگی میں 88 برس کم نہیں ہوتے۔ اس عمر میں عام طور پر ضعف کا شکار ہونے کے نتیجے میں امراض کا مجسمہ بن کر رہ جاتا ہے۔ اب اور جینے کا مطلب ہوتا کہ وہ اپنے گھر والوں کے لیے بوجھ بن جاتی۔ لہٰذا مرحومہ کا گزر جانا نہ صرف ان کے حق میں بہتر تھا بلکہ اہل خانہ اور متعلقین کے لیے بھی باعث طمانیت رہا۔

لتا جی کی پیشہ ورانہ زندگی کا عرصہ خاصا طویل ہے۔ اس طوالت کے باوجود نہ تو انھوں نے کبھی اکتاہٹ کا اظہار کیا نہ تھکاوٹ کا۔ ان کے فن کا کمال یہ ہے کہ وہ جوں جوں آگے بڑھتی گئیں ان کا فن اسی طرح روز افزوں سنورتا اور نکھرتا گیا۔ حد تو یہ ہے کہ جسمانی طور پر وہ بڑھتی عمر کے ساتھ جب ضعیفی اور بڑھاپے کی طرف بڑھنے لگیں تو ان کا فن اور جوان ہونے لگا ان کے پورے دور میں ان کے سامنے نئی نئی گلوکارہ کبھی ان کے سامنے ٹکتی نظر نہیں آتی۔ کمال یہ ہے کہ ایک سترہ اٹھارہ سال کی گلوکارہ جب گاتی تھی تو لگتا تھا کہ کوئی پچیس تیس سال کی لڑکی گا رہی ہے جب کہ لتا جی اس کے برعکس جب گاتی تھیں تو ایسا لگتا کہ کوئی پندرہ بیس سال کی نوعمر گلوکارہ کانوں میں رس گھول رہی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ لتا دی اپنی اخیر عمر تک ایک نوعمر لڑکی کی طرح گاتی رہیں۔ لیکن آخر کب تک اب جب کہ ان کے قویٰ مضمحل ہوگئے اور ان کی بڑھتی عمر نے لڑکھڑانے پر مجبور کر دیا تو انھوں نے خود کو سمیٹنا شروع کر دیا۔ پچھلے ایک سال سے انھوں نے گانا بند کر دیا تھا۔ اب ان کے بعد آنے والوں کے لیے موقع ہے کہ وہ محنت کریں اور ان سے آگے نکلنے کی کوشش کریں۔ ہندوستانی موسیقی اور ساز و آواز کو لتا جی نے جس مقام پر پہنچایا تھا اس سے آگے جانے کی چنوتی آپ کے سامنے ہے۔ خدا کرے آپ اس میں کامیاب ہوں۔

■

Dr. Abrar Rahmani
Tazyeen Apts. 179/22, Zakir Nagar
New Delhi - 110025
Tel.: 9911455508

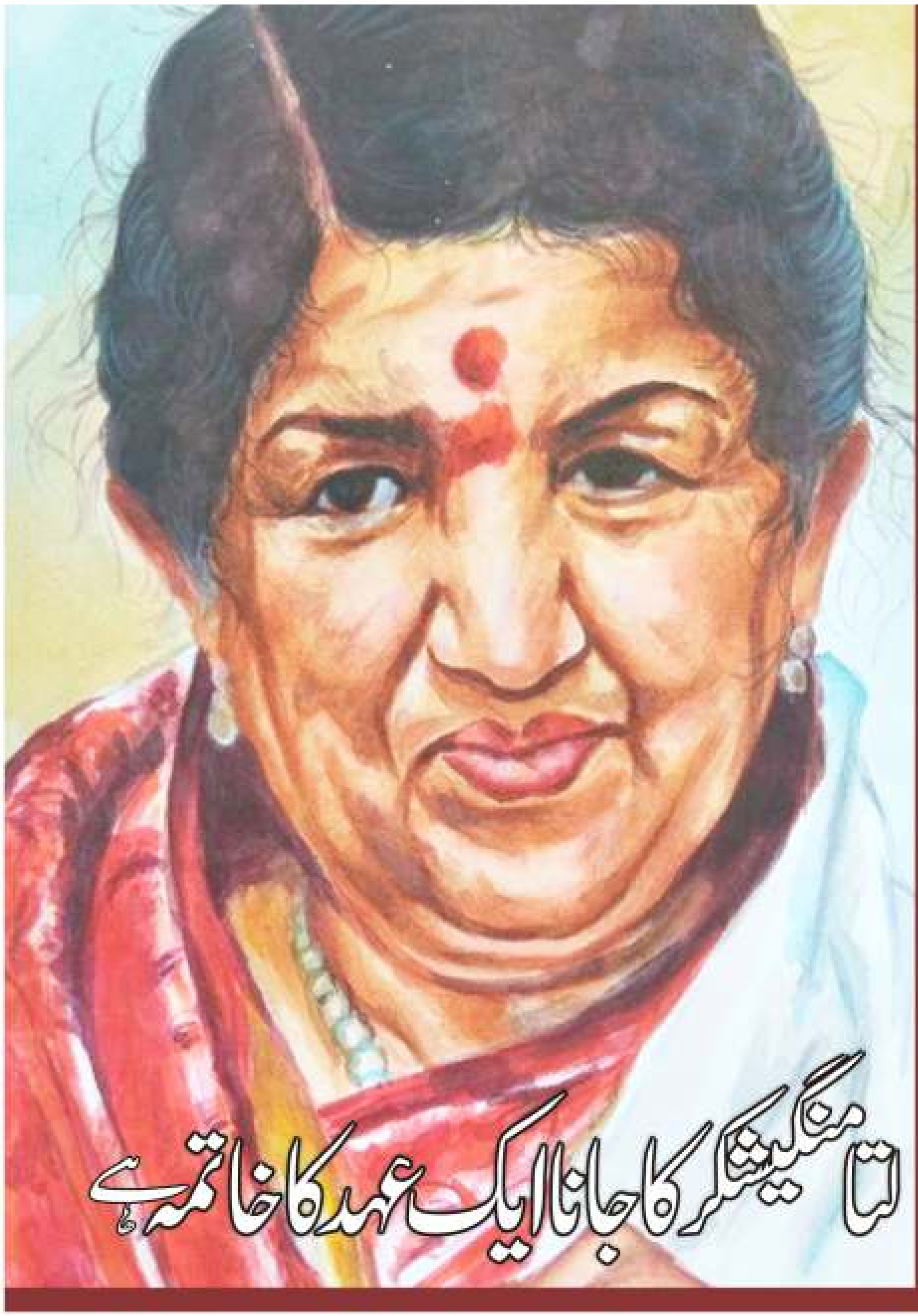

لتا منگیشکر کا جانا ایک عہد کا خاتمہ ہے

صدر عالم گوہر

ایک بار اور یہ خبر سوشل میڈیا پر کسی نے پھیلائی تھی کہ سروں کی ملکہ لتا منگیشکر کا انتقال ہو گیا۔ میں تو سکتے میں آ گیا تھا مگر پھر اسی خبر کے کمنٹ میں کسی نے لکھا تھا کہ میڈیا میں کہیں یہ خبر تو نہیں ہے۔ اتنی بڑی ہستی کا انتقال ہو جائے اور ریڈیو ٹی وی پر یہ خبر نشر نہ ہو یہ تو ممکن نہیں ہے۔ بعد میں یہ پتہ چلا کہ لتا جی کے انتقال کی خبر غلط تھی۔ سوشل میڈیا پر اس طرح کی بے سر پیر کی خبریں بلکہ یوں کہیے افواہیں وقتاً فوقتاً پھیلتی ہی رہتی ہیں۔ یا پھیلائی جاتی رہتی ہیں۔

ویسے یہ کہا جاتا ہے کہ جس شخص کی موت کی غلط خبر پھیلتی ہے اس کی عمر اور لمبی ہو جاتی ہے۔ میں نے جب لتا منگیشکر کی موت کی خبر سنی تھی اور بعد میں معلوم ہوا کہ یہ خبر غلط ہے تو میں نے دل میں سوچا کہ لتا جی کی عمر اور بڑھ گئی۔ لیکن پھر جب ایک مہینے کے بعد میرے ایک دوست نے خبر دی کی لتا منگیشکر کا انتقال ہو گیا تو میں نے دل میں سوچا کہ پھر ایک غلط خبر گشت کرنے لگی۔ میں نے ان سے کہا یہ افواہیں پھیلتی ہی رہتی ہیں ان پر دھیان نہ دیں۔ اس کے جواب میں انھوں نے کہا ٹی وی کھول کر دیکھیے یہ سوشل میڈیا کی خبر نہیں ہے۔ ریڈیو اور ٹی وی پر یہ خبر چل رہی ہے۔ میں نے پھر ٹی وی آن کیا تو دیکھا کہ ہر چینل پر یہی خبر چل رہی تھی۔ بہت افسوس ہوا اور یہ ماننے پر مجبور ہوا کہ اس بار کی خبر بالکل صحیح ہے۔ بہر حال موت تو ایک حقیقت ہے جسے بھلایا نہیں جا سکتا ہے۔ یہ ایک ایسا سچ ہے جسے قبول کرنا ہی پڑتا ہے۔

مجھے یاد آنے لگا لتا جی کا وہ پروگرام جو ممبئی کے برے بارن اسٹیڈیم (Brabourne Stadium) میں ہوا تھا۔ یہ اس وقت تک کا پہلا پروگرام تھا جو کسی ہال میں نہ ہو کر کرکٹ اسٹیڈیم میں ہوا تھا۔ یہ پہلا پروگرام تھا جس کے لیے خصوصی طور پر ممبئی لوکل ٹرین کو ساری رات چلایا گیا تھا تا کہ ساری رات لوگوں کو آنے جانے کی سہولت مہیا ہو سکے۔ نہیں تو ممبئی کی لوکل ٹرین رات میں 1:40 کی آخری لوکل ہوتی ہے۔ اس پروگرام میں سارا برے بارن اسٹیڈیم کھچا کھچ بھرا تھا۔ ساری فلم انڈسٹری امڈ پڑی تھی۔ موسیقار، گلوکار اور نغمہ نگار کے علاوہ عام لوگ جو لتا منگیشکر کے درشن نہیں کر پاتے تھے۔ مگر اس رات برے بارن اسٹیڈیم میں ممبئی کی ساری عوام کو لتا منگیشکر کو دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سارا اسٹیڈیم بھر گیا تھا کہیں تل رکھنے کی جگہ نہیں تھی۔ دلیپ کمار جب اسٹیج پر تشریف لائے تو انھوں نے لتا منگیشکر کا تعارف اپنے اسی مخصوص انداز میں کرایا جو انہیں کا خاصہ تھا۔ انھوں نے کہا، ''لتا منگیشکر میری چھوٹی سی ننھی سی بہن ہے۔'' اور اس کے بعد انھوں نے مخصوص انداز میں اپنی بات کہی۔ سارا اسٹیڈیم تالیوں سے گونج اٹھا۔

رفیع صاحب کے انتقال کے بعد میل سنگر میں ایک گلوکار کی انٹری ہوئی تھی اور دوگانے کے لیے جو رفیع لتا کو ذہن میں رکھ کر موسیقار دھنیں تیار کرتے تھے۔ اس کے لیے رفیع صاحب کے نہ ہونے کی وجہ سے شبیر کمار کو متعارف کیا گیا تھا۔

شبیر کمار اپنی پہلی فلم 'بیتاب' سے سرخیوں میں آ گئے تھے۔ رفیع صاحب کا نعم البدل نہ پیدا ہوا تھا اور نہ پیدا ہو سکے گا۔ مگر شبیر کمار اس وقت رفیع صاحب کی یاد تو ضرور دلاتے تھے۔ 'بیتاب' کے نغمے ہٹ ہوئے تھے۔ اور اسی فلم کا ایک دوگانا تھا۔ ''جب ہم جواں ہوں گے

، جانے کہاں ہوں گے۔'' اس گانے کو فلم میں آواز دی تھی لتا منگیشکر اور شبیر کمار نے۔ اس لتا نائٹ میں اس گانے کو بھی عوام کے سامنے اسٹیج پر لتا منگیشکر اور شبیر کمار نے گا کر عوام سے خوب داد و تحسین پائی۔

اس پروگرام میں میں نے پہلی بار ایک نئے اناؤنسر کو سنا اور دیکھا اور وہ اناؤنسر تھے، ہریش بھیمانی۔ لتا نائٹ کو کمپیئر کیا تھا ہریش بھیمانی نے اور اس پروگرام سے ہریش بھیمانی سرخیوں میں آ گئے۔ نہیں تو اس سے پہلے اناؤنسر کا مطلب امین سایانی ہوتے تھے۔

یہ شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہو کہ لتا منگیشکر کا اصل نام لتا نہیں تھا۔ لتا منگیشکر کے لتا بننے کے پیچھے بھی ایک قصہ ہے۔ لتا منگیشکر کا اصل نام ہیما منگیشکر تھا۔ مگر لتا منگیشکر نے بچپن میں ایک ڈرامے میں ایک چھوٹا سا کردار نبھایا تھا۔ اس کردار سے ان کے والد اتنے متاثر ہوئے کہ ان کے اصل پیدائشی نام کو چھوڑ کر ان کے والد نے ہیما نام کو بدل کر لتا نام ہی رکھ دیا اور اس طرح بعد میں چل کر وہ ہیما سے بدل کر لتا ہو گئی اور خود کو لتا منگیشکر ہی کہلوانا پسند کیا اور اپنا نام لتا منگیشکر لکھنے لگی۔ پتہ نہیں لتا منگیشکر نام میں کیا مستقبل لتا منگیشکر کے والد نے دیکھا اور لتا منگیشکر نام رکھا جو ان کی دعاؤں کی وجہ سے لتا منگیشکر کا نام بعد میں شہرت کی بلندیوں پر پہنچا۔ مگر افسوس کہ لتا منگیشکر کے والد دینا ناتھ منگیشکر اس نام کی برکت اور شہرت کو اپنے جیتے جی نہ دیکھ سکے۔ اور لتا منگیشکر کے بچپن میں ہی ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ لیکن ان کی دور اندیشی اور دعاؤں نے لتا منگیشکر کو بھارت رتن جیسے ایوارڈ تک پہنچایا۔ کوکل کی آواز جیسے خطاب سے نوازا۔ لتا منگیشکر کے لیے، ''لتا منگیشکر جیسی نہ کوئی تھی نہ ہے نہ ہو گی'' جیسے جملے لکھے اور کہے گئے۔

ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا کہ کسی فلمی ہستی کے انتقال پر ہندوستان کا وزیر اعظم اس فلمی ہستی کی آخری رسومات میں شامل ہوا ہو۔ فلمی ہستیوں کی وفات پر وزیر اعظم تعزیتی پیغام ارسال کر دیتے تھے۔ اپنے رنج و غم کا اظہار کرتے تھے۔ لیکن ہندوستان کی تاریخ میں پہلی بار فلمی ہستی لتا منگیشکر کے انتقال کرنے کے بعد ان کی آخری رسومات میں ہندوستان کے وزیر اعظم نریندر مودی بذات خود شریک ہوئے۔

فلمی ہستیوں کو شہری اعزاز Civilian Award کا سلسلہ پرانا ہے، پدم شری، پدم بھوشن اور پدم وبھوشن تک تو چند گنے چنے لوگ پہنچے مگر لتا منگیشکر واحد فلمی ہستی تھیں جو سب سے بڑے شہری اعزاز (Civilian Award) بھارت رتن تک پہنچی۔ اس اعزاز کے ملنے سے فلمی ہستیوں کا سر فخر سے بلند ہو گیا۔

لتا منگیشکر کا فلمی کیریر سات دہائیوں سے زیادہ پر پھیلا ہوا ہے۔ ویسے تو ان کے ذریعے گائے جانے والے نغموں کی ایک لمبی فہرست ہے جس کے لیے یہاں گنجائش نہیں ہے۔ تاہم چند مشہور و معروف نغمے جو لتا منگیشکر کی شہرت، عزت اور وقار میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں جیسے۔ 1949 میں لتا منگیشکر کی آواز میں اس نغمے نے ہندوستانی فلم انڈسٹری کو پوری شدت سے اپنی طرف متوجہ کیا وہ نغمہ تھا، 'آئے گا آنے والا' جو فلم محل کا نغمہ تھا۔ اس نغمے سے سارے فلمی موسیقار لتا منگیشکر کی طرف متوجہ ہوئے۔ جن موسیقاروں نے لتا منگیشکر کی آواز کو یہ کہہ کر نظر انداز کر دیا تھا کہ لتا منگیشکر کی آواز بہت پتلی (باریک) ہے۔ ان موسیقاروں کو یہ احساس ہو گیا کہ وہ لوگ غلط تھے۔ لتا منگیشکر کی آواز باریک نہیں سریلی ہے اور بہت کشش ہے اس آواز میں اس آواز کا جادو ایسا سر چڑھ کر بولا کہ سارے موسیقاروں کی پہلی پسند لتا منگیشکر ہو گئیں۔ اب جس موسیقار کو دیکھیے وہ اپنے نغمے لتا منگیشکر سے گوانا چاہتا تھا۔ ادھر سارے موسیقاروں کی میل سنگر یعنی مردانہ آواز میں پہلی پسند محمد رفیع ہو گئے۔ اور فیمیل سنگر یعنی نسوانی آواز میں پہلی پسند لتا منگیشکر ہو گئیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس وقت جتنے ڈوئٹ دوگانے فلمی موسیقار بناتے وہ اپنے ذہن میں محمد رفیع اور لتا منگیشکر کو رکھ کر دھنیں ترتیب دیتے۔ یہی وہ وقت تھا جب فلموں سے شمشاد بیگم اور زہرہ بائی امبالے والی کی آواز فلموں میں کم ہونے لگی۔ اور لتا منگیشکر کی آواز کا طوطی بولنے لگا۔

1962 میں لتا منگیشکر کی آواز میں گایا جانے والا ایک غیر فلمی نغمہ اتنا مقبول ہوا کہ بہت سے فلمی نغموں پر بھاری پڑا۔ اس نغمے کو سن کر اس وقت کے وزیر اعظم جواہر لعل نہرو کی آنکھیں نم ہو گئیں اور اس نغمے نے وہ مقبولیت حاصل کی کہ ہندوستان کے قومی تہوار یعنی یوم آزادی 15 اگست اور یوم جمہوریہ 26 جنوری کو بجائے جانے والے قومی گیتوں میں اپنا ایک مقام حاصل کر لیا اور ہمیں آج تک 15 اگست اور 26 جنوری کو یہ نغمہ سننے کو ملتا رہتا ہے۔ حب الوطنی سے بھرپور اور ہماری سرحدوں کے نگہبان فوجی جوانوں کی شہادت یاد دلانے والا یہ نغمہ ہماری حب الوطنی اور ملک و قوم کے لیے جی جان لٹانے کے جذبے کو تقویت دیتا ہے۔ اور ہمارے فوجی شہیدوں کے لیے ایک خراج عقیدت پیش کرتا ہے۔ وہ نغمہ ہے،

''اے میرے وطن کے لوگو، ذرا آنکھ میں بھر لو پانی۔''

1969 میں فلم 'انتقام' کا نغمہ 'آجان جاں' ہندوستان کے گوشے گوشے میں ریڈیو پر بجنے والا مقبول نغمہ تھا۔ جو فلم بینوں اور فلمی شائقین کو اپنی طرف متوجہ کرتا تھا۔

1972 میں ویسے تو لتا منگیشکر کے اور بھی بہت سے نغمے شہرت کی بلندیوں تک پہنچے مگر فلم پاکیزہ کا غلام محمد کی موسیقی کی دھنوں پر پرویا گیا نغمہ ''یوں ہی کوئی مل گیا تھا سر راہ چلتے چلتے۔'' تو شہرت کی بلندیوں پر پہنچ گیا اور ہندوستان کے طول و عرض میں جہاں دیکھیے اسی نغمے کی دھوم تھی۔ ریڈیو پر دن رات یہ نغمہ سنائی دیتا تھا۔ اور لوگ اپنی فرمائش، اس گانے کے لیے بھیجتے تھے۔

1973 میں ایک نغمہ اور لتا منگیشکر کی آواز میں چاروں طرف خوب گونجنے لگا۔ حالانکہ لتا منگیشکر ایسے نغمے کم ہی گاتی ہیں مگر کبھی کبھی اس طرح کے نغمے بھی انھوں نے گائے جس میں ایک طرح کا وقار قائم تھا اور ایک رومانی نغمہ تھا۔ جیسے یہ نغمہ ''بانہوں میں چلے آؤ تم سے صنم کیا پردہ۔'' یہ فلم انامیکا کا نغمہ تھا۔ جو کافی چرچے میں رہا۔

1981 میں لتا منگیشکر کا ایک اور نغمہ شہرت کی بلندیوں پر تھا اور ایک نیا ٹمیسٹ تھا اس نغمے میں۔ کیونکہ اس نغمے میں لتا منگیشکر کے ساتھ ایک اور پرکشش آواز فلموں کے معروف اداکار امیتابھ بچن کی بھی تھی اور وہ نغمہ فلم 'سلسلہ' کا تھا۔ ''یہ کہاں آ گئے ہم یوں ہی ساتھ ساتھ چلتے چلتے'' اس فلم میں فلموں کے لیے ایک نئی موسیقار جوڑی شیو ہری کی موسیقی تھی اور جاوید اختر نے اس فلم سے نغمہ نگاری کی ابتدا کی تھی۔ یہ نغمہ اپنے وقت کا کافی مقبول نغمہ تھا۔ اور اس کی کامیابی کا سہرا یقیناً لتا منگیشکر کو جاتا ہے۔

لتا منگیشکر نہ صرف موسیقار کی پہلی پسند تھیں۔ بلکہ کچھ معروف فلم پروڈیوسر اور ڈائریکٹر کی بھی پہلی پسند تھیں۔ جیسے راج کپور کی پہلی اور آخری پسند لتا منگیشکر تھیں۔ اس کی ایک مثال میرے سامنے ہے۔ جب میں موسیقار جوڑی لکشمی کانت پیارے لال کے پیارے لال کا انٹرویو لے رہا تھا اور فلم 'بابی' کا ذکر آیا تو ایک دلچسپ بات لتا منگیشکر سے متعلق پیارے لال نے مجھے بتائی تھی۔ پیارے لال نے کہا، ''جب ہم لوگ فلم بابی کی موسیقی کمپوز کر رہے تھے۔ تو اسی وقت ایک آواز نے ہم لوگوں کو بہت متاثر کیا تھا۔ چونکہ فلم بابی میں راج کپور صاحب تقریباً ہر چیز نئی لے رہے تھے۔ جیسے ہم لوگ پہلی دفعہ راج کپور صاحب کے ساتھ کام کر رہے تھے اور ان کی فلم کی موسیقی دے رہے تھے۔ اس فلم کا ہیرو نیا تھا رشی کپور جو راج کپور کا لڑکا تھا۔ اس فلم کی ہیروئن نئی تھی ڈمپل کپاڈیا۔ اس فلم میں پہلی دفعہ ایک نئی آواز کو متعارف کروایا گیا تھا۔ رشی کپور کی آواز کے لیے اور وہ آواز تھی شیلیندر سنگھ کی۔

ہم لوگوں نے سوچا کہ کیوں نہ اسی فلم میں ایک نئی نسوانی آواز کو متعارف کروایا جائے اور اس لیے ہم لوگوں نے گلوکارہ 'ریشما' کی آواز میں گانا ریکارڈ کروایا تھا۔

''انکھیوں کو رہنے دے انکھیوں کے آس پاس دور
سے دل کی بجھتی رہے گی پیاس۔''

گانا بہت پر سوز تھا۔ ریشماں کی آواز میں درد بھی بہت تھا۔ سچویشن سے میل کھاتا ہوا یہ پر سوز نغمہ تھا اور ہاں نغمہ نگار آنند بخشی بھی پہلی دفعہ راج کپور کی فلم کے لیے نغمے لکھ رہے تھے، مگر بعد میں راج کپور صاحب نے ریشماں کی آواز میں اس نغمے کو منظوری نہیں دی اور اس نغمے کو لتا منگیشکر کی آواز میں ریکارڈ کروا کر فلم میں رکھا۔ راج کپور لتا منگیشکر کی آواز کے کتنے بڑے مداح تھے اس کی یہ ایک بڑی مثال ہے۔

لتا منگیشکر کی آواز کے جادو کا ایک دوسرا واقعہ بھی مجھے یاد آ رہا ہے۔ ایک بہت ہی مشہور فلم تھی۔ ''جب جب پھول کھلے۔'' جو کشمیر اور ڈل جھیل کے آس پاس گھومتی ہے۔ اتفاق کی بات یہ ہے کہ جب میں لتا منگیشکر پر یہ مضمون لکھ رہا ہوں تو میں بھی کشمیر میں ہوں اور ڈل جھیل کے پاس ہی ایک ہوٹل میں یہ مضمون لکھ رہا ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ فلم ''جب جب پھول کھلے کا ٹائٹل سانگ

''پردیسیوں سے نہ انکھیاں ملانا۔ پردیسیوں کو ہے
ایک دن جانا،
باغوں میں جب جب پھول کھلیں گے۔ تب تب
یہ ہرجائی ملیں گے۔

یہ نغمہ اس فلم کا سب سے معروف اور متاثر کرنے والا نغمہ ہے۔ بلکہ یوں کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ یہ نغمہ اس فلم کی جان ہے۔ اس نغمے کے سلسلے میں یہ واقعہ اور وہ منظر ابھی بھی میری نظروں کے سامنے ہے کہ جب میں معروف فلمی گلوکارہ مبارک بیگم کا انٹرویو لے رہا تھا۔ تو مبارک بیگم نے مجھے بتایا تھا کہ فلم 'جب جب پھول کھلے' کا ٹائٹل سانگ 'پردیسیوں سے نہ انکھیا ملانا' پہلے کلیان جی آنند جی نے مجھ سے گوایا تھا اور میری آواز میں ریکارڈ ہوا تھا۔ مگر جب فلم ریلیز ہوئی تو میں نے دیکھا کہ یہ نغمہ لتا منگیشکر کی آواز میں تھا۔'' میں نے موسیقار جوڑی کلیان جی آنند جی کے آنند جی کا بھی انٹرویو لیا تھا مگر افسوس کہ میں نے ان سے یہ نہیں پوچھا کہ یہ نغمہ فلم کے پروڈیوسر، ڈائریکٹر یا کس کے کہنے پر مبارک بیگم کی آواز کے بدلے میں لتا منگیشکر کی آواز میں ریکارڈ کیا گیا۔ خیر جو بھی ہو لیکن یہ تو لتا منگیشکر کی آواز کا جادو ہی تھا۔ جو پہلے سے ریکارڈ کیے گئے نغمے کو دوبارہ لتا منگیشکر کی آواز میں ریکارڈ کیا گیا اور اس نغمے کی مقبولیت یہ ثابت کرتی ہے کہ شاید اس نغمے کے لیے لتا منگیشکر سے اچھی کوئی دوسری آواز ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

اب تو فلمی دنیا میں اردو تلفظ کا بیڑا ہی غرق ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔ ساری فلم اسکرپٹ رومن میں لکھ کر دی جاتی ہے۔ سارے نغمے بھی رومن میں گلوکار لکھواتے ہیں۔ وہ تو بھلا ہو انگریزی Z اور J کا جو گلوکاروں سے ج اور ز کا صحیح مخرج نکلوا لیتے ہیں اور GH جو غ کا مخرج کسی حد تک نکلوا لیتے ہیں۔ نہیں تو اردو کی ساری خوبصورتی غرق ہو جاتی، لیکن ایک زمانہ تھا کہ جب دلیپ کمار سے کسی نے لتا منگیشکر کو متعارف کروایا کہ یہ فلموں میں گلوکاری کے لیے آئی ہیں۔ تو دلیپ کمار نے کہا یہ مراٹھی ہیں یہ کیا اردو کے نغموں کو گا سکیں گی۔ اس کا اثر لتا منگیشکر نے ایسا لیا کہ ایک مولوی صاحب کو رکھ کر اردو سیکھی اور اردو زبان کی نزاکت اور لطافت کا وہ حق ادا کیا کہ دنیا دیکھتی رہی۔ کسی زاویے سے لگتا ہی نہیں تھا کہ یہ مراٹھی بولنے والی تھیں اور اردو کے نغمے گا رہی تھیں اردو کی جو خوبیاں ہیں۔ جو حسن ہے اس کو ہمیشہ برقرار رکھا اور ایسا لگا کہ یہ کسی اردو داں کا ہی گایا ہوا نغمہ ہے۔ اردو داں کا ہی ادا کیا گیا تلفظ ہے۔ اردو کا حق ادا کر دیا لتا منگیشکر نے۔

میں جب بھی کسی فلمی موسیقار کا انٹرویو لیتا تھا تو محمد رفیع اور لتا منگیشکر کے بارے میں ضرور چند سوالات کرتا تھا۔ کیونکہ میں نے تقریباً زیادہ تر پرانے موسیقاروں سے انٹرویو لیا ہے۔ جو لتا منگیشکر کے ساتھ کام کر چکے ہیں اور جو لتا منگیشکر کو بخوبی جانتے ہیں۔ اور جن کی موسیقی میں لتا منگیشکر نے بیشتر نغمے گائے ہیں۔ جیسے موسیقار خیام صاحب، موسیقار روی صاحب، موسیقار کلیان جی آنند جی کے آنند جی صاحب، لکشمی کانت پیارے لال کے پیارے لال جی صاحب موسیقار جے دیب صاحب وغیرہ۔

موسیقار جے دیب صاحب سے جب میں نے پوچھا کہ لتا منگیشکر کے بارے میں کچھ بتایئے۔ تو انھوں نے کہا محمد رفیع، مکیش، منا ڈے، کشور کمار، آشا بھوسلے اور لتا منگیشکر یہ سب اپنے وقت کے سورج ہیں ان سے کسی کو Comparison نہیں کیا جا سکتا۔

موسیقار جوڑی لکشمی کانت پیارے لال کے پیارے لال نے کہا ''لتا جی (لتا منگیشکر) نے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کی ہم لوگوں کو اپنے بچے کی طرح مانتی تھیں۔ اپنے فلمی کریئر میں لتا رفیع کے سب سے زیادہ گانے ہم لوگوں نے ہی گوائے۔

موسیقار روی سے جب میں نے پوچھا کہ لتا جی کے بارے میں بتایئے۔ کیونکہ ایک البم لتا منگیشکر نے مرحومین گلوکاروں کی یاد میں نکالے تھے۔ جس میں جتنے گلوکار لتا منگیشکر کے ساتھ گانے گائے تھے یا ابتدائی دور کے فلمی گلوکار تھے ان سبھوں کے ایک ایک نغمے لتا منگیشکر نے اس البم میں گائے تھے۔ اس میں لتا منگیشکر نے ہیمنت کمار کی آواز میں گائے گئے ایک نغمے کا انتخاب کر کے اس البم میں گائے تھے اور ہیمنت کمار کے بارے میں لتا منگیشکر نے گانے سے پہلے دو جملے کہے تھے۔ کہ میں جب بھی ہیمنت کمار جی کو دیکھتی تو لگتا کہ جیسے کوئی پجاری مندر بھجن گا رہا ہو۔ اور اس البم میں جس گانے کا انتخاب لتا منگیشکر نے کیا تھا وہ بھی اسی مناسبت سے نغمہ تھا۔'

''چھپا لو یوں دل میں پیار میرا کہ جیسے مندر میں لو
دیے کی۔''

چونکہ لتا منگیشکر بھی ہیمنت کمار سے بہت متاثر تھیں اور موسیقار روی بھی ہیمنت کمار کے ہی اسسٹنٹ تھے۔ جو بعد میں خود ایک معروف موسیقار ہوئے۔ اس لیے جب میں نے موسیقار روی سے پوچھا کہ لتا جی کے بارے میں کچھ بتایئے۔ تو انھوں نے کہا میں ایک دن ہیمنت کمار جی کے یہاں بیٹھا تھا تو لتا جی آئیں۔ تب میں موسیقار بن گیا تھا۔ لتا جی نے پیار بھری شکایت کی ہیمنت کمار جی سے یہ تو مجھے گواتے ہی نہیں۔ میں نے جواب دیا میں مجبور رہا تھا کہ میں نیا ہوں اس لیے آپ میری موسیقی میں گائیں گی نہیں۔ اس کے بعد سے جب بھی میں نے لتا جی سے کسی گانے کی بات کی وہ فوراً راضی ہو گئیں۔ میری موسیقی میں لتا جی کے بہترین نغموں کی ایک فہرست ہے۔ فلم دو بدن۔

لو آ گئی ان کی یاد وہ نہیں آئے۔
فلم ایک محل ہو سپنوں کا۔
دل میں کسی کے پیار کا جلتا ہوا دیا۔
دنیا کی آندھیوں سے بھلا یہ بجھے گا کیا

اسی طرح کے بہت سے نغمے ہیں جو لتا منگیشکر کی آواز نے میرے نغموں میں چار چاند لگا دیے۔

لتا منگیشکر کے تعلق سے باتیں بہت سی ہیں مگر مضمون طویل ہوتا جا رہا ہے۔ آخر میں میں یہی کہوں گا۔

یوں تو دنیا میں سبھی آتے ہیں مرنے کے لیے
موت اس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس

■

Sadre Alam Gauhar
1138, 1155 New Islamabad Nalapar
Bhiwandi
Distt.: Thane - 421302 (MS)
Mob.:7715980144

لتا جی کی آواز

فضا میں ہر وقت گونجتی رہتی ہے

فرحان حنیف وارثی

'رہیں نہ رہیں ہم، مہکا کریں گے، بن کے کلی، بن کے صبا، باغِ وفا میں، رہیں نہ رہیں ہم...'

اشوک کمار، سچترا سین اور دھرمیندر کی اداکاری، اوراسیت سین کی ہدایتکاری سے سجی فلم 'ممتا' (1966) میں لتا جی کی سحر انگیز آواز میں شامل مذکورہ نغمہ آج ایک مثال بن چکا ہے۔ ملکۂ ترنم لتا منگیشکر نے تقریباً آٹھ دہائیوں تک اپنی لازوال گلوکاری سے بالی ووڈ کے ساتھ ساتھ اپنے مداحوں کے دلوں پر بھی راج کیا۔ اتوار 6 فروری 2022 کی صبح 8 بج کر 12 منٹ پر عروس البلاد ممبئی کے بریچ کینڈی اسپتال میں انھوں نے آخری سانس لی۔

92 سالہ لتا جی کورونا پازیٹیو پائے جانے کے بعد 8 جنوری سے زیر علاج تھیں۔ انھیں اسی دن شام ساڑھے چھ بجے دادر کے شیواجی پارک میں جم غفیر کی موجودگی میں سپردِ آتش کیا گیا۔

کووڈ 19 کی پہلی اور دوسری لہر کے دوران لتا جی نے اپنی رہائش گاہ کے ایک مخصوص کمرے میں خود کو آئسولیشن میں رکھا تھا۔ لوگوں سے ملنا جلنا بالکل بند کر دیا تھا۔ پیڈر روڈ کی پربھو کنج نامی عمارت میں کئی کمروں پر مشتمل عالیشان فلیٹ میں ان کی بہن اوشا منگیشکر اور مینا کھادیکر کے علاوہ ان کے بھائی ہردے ناتھ منگیشکر کی فیملی رہتی ہے۔ وہ ان سے بھی ملنے سے کتراتی تھیں۔ انھیں کورونا سے متاثر ہونے کا شدید ڈر تھا، لیکن ان کی قسمت میں کورونا کے سبب فوت ہونا لکھا تھا۔ ان کی چھوٹی بہن آشا بھوسلے بھی کورونا سے محفوظ رہنے کی خاطر ممبئی کی رہائش گاہ سے لوناولہ کے بنگلے میں منتقل ہوگئی تھیں۔ اس قدر احتیاط کے باوجود آشا جی کو بھی کورونا وائرس نے دبوچ لیا تھا۔ آشا بھوسلے علاج کے بعد صحت یاب ہوگئی تھیں، اور بریچ کینڈی اسپتال جا کر اپنی بڑی بہن کی عیادت بھی کی تھی۔ ڈاکٹر پرتیت صمدانی کے زیر نگرانی لتا جی کی صحت میں بہتری کی علامتیں ظاہر ہونے لگی تھیں۔ اس بیچ انھیں نمونیا ہوگیا۔ 27 جنوری کو انھیں وینٹی لیٹر سے ہٹا دیا گیا۔ سنیچر کو ان کی صحت میں پھر گراوٹ محسوس کی گئی اور انھیں دوبارہ وینٹی لیٹر پر رکھا گیا۔ بریچ کینڈی اسپتال کے سی ای او ڈاکٹر این شانتا نم نے اتوار کی صبح ان کی موت کی تصدیق کی۔ ڈاکٹر این شانتا نم کے مطابق لتا جی میں پہلے سرعت تنفس اور اختلاج قلب کی شکایت پیدا ہوئی اور آہستہ آہستہ ان کے اعضائے رئیسہ نے کام کرنا بند کر دیا۔ اس کے بعد خون کی گردش متزلزل ہونے اور لوتھڑے بننے سے جسم میں سوجن آگئی۔ غرض کہ آخری وقت میں انھیں بے حد تکلیف برداشت کرنی پڑی۔

بھارت کا شاید ہی کوئی شہری ایسا ہوگا، جس کو یہ پتہ نہیں ہوگا کہ لتا منگیشکر کون تھیں؟ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے، روزانہ لتا جی کا کوئی نہ کوئی نغمہ ضرور سنا ہے۔ اگر میں یہ دعوی کروں تو بھی صحیح ٹھہرایا جاؤں گا کہ وطن عزیز میں دو گائیک ایسے گزرے ہیں، جن کی آواز فضا میں ہر وقت گونجتی رہتی ہے، اور کشمیر سے کنیا کماری تک موسیقی اور سریلے گانوں کے مداحوں کو لطف اندوز کرتی رہتی ہے، وہ ہیں محمد رفیع اور لتا منگیشکر۔ دونوں ہی ساری دنیا میں ملک کی پہچان بن چکے ہیں اور انھیں فراموش کرنا ممکن نہیں ہے۔

بھارت رتن لتا منگیشکر کی گلوکاری کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ انھوں نے فلمی ہستیوں کی تین نسلوں کے ساتھ سُروں کا سفر طے کیا ہے۔ ان نسلوں میں گلوکار ہی نہیں، بلکہ فلموں کی اداکارائیں بھی شامل ہیں جن کے لیے لتا جی کی آواز چہکی ہے۔ گلوکار مکیش کی پہچان ان کے درد بھرے گانوں کی وجہ سے ہے۔ مکیش کے ساتھ لتا جی نے متعدد گانے ریکارڈ کیے، جو آج بھی بڑی رغبت سے سنے جاتے ہیں۔ ان کے بیٹے نتن مکیش کے ساتھ بھی لتا جی نے بہت سے ہٹ گیت گائے ہیں، وہیں مکیش کی تیسری نسل، یعنی ان کے پوتے نیل نتن مکیش کی فلموں میں بھی لتا جی نے گلوکاری کی ہے۔ ہر دور کی اداکاراؤں کے لیے ان کی آواز موزوں تھی۔ انھوں نے شوبھنا سمرتھ کی بیٹیوں تنوجا اور نوتن کے لیے متعدد گانے گائے، جو آج بھی مقبول ہیں، اور وہیں تنوجا کی بیٹی اور اداکارہ کاجول کے لیے بھی اپنی آواز کے پھول کھلائے۔

لتا جی کا تعلق کلاسیکی گائیکی کے بھنڈی بازار گھرانے سے تھا۔ جنوبی ممبئی کے اس علاقے میں مراد آباد کے نزدیک واقع بجنور سے 1890 میں ہجرت کر کے آنے والے استاد ولاور حسین خان اور ان کے تین بیٹوں استاد نذیر حسین خان، چھجو خان اور خادم حسین خان نے بھنڈی بازار گھرانے کی بنیاد رکھی تھی۔ ان کے بعد چھجو خان کے بیٹے استاد امان علی خان اور انجانی بائی مالپیکر نے اس گھرانے کی روایت کو آگے بڑھایا تھا۔ استاد امان علی خان سے لتا منگیشکر نے کلاسیکی گائیکی میں ید طولی حاصل کیا تھا۔ لتا جی کے علاوہ استاد امان علی خان کے شاگردوں میں آشا بھوسلے، وسنت راؤ دیشپانڈے، مہندر کپور اور مناڈے قابل ذکر ہیں۔ بھنڈی بازار گھرانے کے شاگردوں کی ایک طویل فہرست ہے اور فرداً فرداً سب کے نام یاد رکھنا مشکل ہے، پھر بھی چند گائیکوں کے نام مجھے اس وقت یاد آرہے ہیں اور میں ان ناموں کو یہاں درج کرنا چاہوں گا، تاکہ شائقین موسیقی ان سے نابلد نہ رہیں۔ بیگم اختر، نینا دیوی، کشوری امونکر، مکند ویاس، سنگیتا پنڈھر پورکر، سبھاش دیسائی، پنکج اوداس، سمن کلیان پوری، جتندر ابھیشیکی، چتن پٹیل اور متالی سنگھ وغیرہ نے شعبۂ موسیقی اور گلوکاری کے میدان میں اپنی شناخت قائم کی۔

لتا منگیشکر نے ایک مسلم استاد سے اردو سیکھی تھی۔ بڑی دلچسپ داستان ہے۔ ہریش بھیمانی نے اپنی کتاب 'لتا دیدی: عجیب داستان ہے یہ' میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔

لتا جی نے اردو زبان سیکھنے کے لیے ایک مولوی صاحب سے ٹیوشن لیا۔ پھر نوشاد صاحب نے کچھ دنوں تک اردو سکھائی، مگر مصروفیت کے سبب یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ نوشاد صاحب کے اردو کے استاد الطاف حسین لطف سے مراسم تھے۔ انھوں نے لتا منگیشکر کو مہاراشٹر کالج (بیلاسیس روڈ) کے مقابل الیگزنڈر سنیما کے عقب کی ورسوا اسٹریٹ میں بھیجا جہاں لطف صاحب کا قیام تھا۔ لتا جی کو استاد الطاف حسین لطف نے آگے کی اردو پڑھائی۔ نوشاد علی، شیام سندر، سی رام چندرن، مدن موہن، سلیل چودھری، ایس ڈی برمن، شنکر جے کشن، لکشمی کانت پیارے لال اور دیگر نے اپنی موسیقی اور شعرا کے کلام کو لتا جی کی آواز سے اس طرح ہم آہنگ کیا کہ بہت سے گیت شہکار بن گئے۔ ان کے گیتوں کی مقبولیت کی ایک وجہ آواز اور دوسری وجہ ان کا تلفظ تھا۔ انھوں نے اپنے شین کاف اور عین غین کو اس طرح نکھارا تھا کہ بہت سے اردو جاننے والے بھی اتنا شفاف تلفظ ادا کرنے سے قاصر تھے۔

سال 1963 لتا جی اور منگیشکر خاندان کے لیے پریشان کن رہا تھا۔ ایک مرتبہ ریکارڈنگ کے وقت جب انھوں نے اونچا سُر لگایا تو آواز کی ہڈی میں تکلیف کا احساس ہوا، اور آواز پھٹتی ہوئی لگی۔ لتا جی کو فکر لاحق ہوگئی کہ ایسا کیوں ہوا؟ سروں کی ملکہ کو کھانے کی اشیا میں ملا کر دھیما زہر دیا جا رہا تھا جس کے سبب وہ دن بہ دن نحیف ہوتی جا رہی تھیں۔ بستر سے اٹھنے میں بھی دقت محسوس کر رہی تھیں۔ ایک دن انھیں پیٹ میں بے چینی کا احساس ہوا اور پھر قے ہونے لگی۔ الٹی کا رنگ سبز تھا۔ وہ ہل نہیں سکتی تھیں لہٰذا گھر میں ہی ان کے تمام ٹیسٹ کیے گئے۔ جب رپورٹ آئی تو ڈاکٹروں نے منگیشکر خاندان کو بتایا کہ کوئی انھیں دھیما زہر دے رہا ہے۔ لتا جی اور ان کے اہل خانہ کو معلوم پڑ گیا تھا کہ کون انھیں دھیما زہر دے رہا تھا، مگر کوئی ثبوت دستیاب نہیں تھا۔ دراصل لتا جی کے یہاں ایک نیا باورچی آیا تھا۔ وہ کسی کے اشاروں پر یہ حرکت کر رہا تھا۔ جب لتا جی کو دھیما زہر دینے کا راز کھلا تو وہ باورچی اچانک اپنی تنخواہ لیے بغیر غائب ہو گیا تھا۔ یہ راز اب بھی راز ہی ہے کہ آخر وہ کون تھا جس نے لتا جی سے ان کی آواز چھیننی یا پھر انھیں مارنے کی سازش رچی تھی۔ منگیشکر خاندان نے ہمیشہ اس بارے میں کچھ بھی کہنے سے اجتناب کیا۔ نسرین منی کبیر کو ایک مرتبہ انٹرویو دیتے ہوئے لتا جی نے کہا تھا: 'ہمیں نہیں معلوم کہ کس نے ملازم کو ایسا کرنے کے لیے کہا تھا، لیکن میں تین مہینے تک بستر پر پڑی رہی۔'

استاد امیر خان صاحب نے انھیں ایک سال تک مائیکروفون سے دور رہنے اور مون برت رکھنے کا مشورہ دیا تھا۔ اس وقت ان کی عمر 33 سال تھی۔ لتا منگیشکر تین ماہ تک علیل رہیں اور انھوں نے گلوکاری چھوڑ دی تھی۔ اس دوران انھوں نے ہومیوپیتھ سے رجوع کیا اور انھیں فائدہ ہوا۔ مجروح سلطان پوری روزانہ ان کی عیادت کے لیے پربھو کنج جایا کرتے تھے۔ اس دوران مجروح صاحب یا تو

لتا جی نے اردو زبان سیکھنے کے لیے ایک مولوی صاحب سے ٹیوشن لیا۔ پھر نوشاد صاحب نے کچھ دنوں تک اردو سکھائی، مگر مصروفیت کے سبب یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ نوشاد صاحب کے اردو کے استاد الطاف حسین لطف سے مراسم تھے۔ انھوں نے لتا منگیشکر کو مہاراشٹر کالج (بیلاسیس روڈ) کے مقابل الیگزنڈر سنیما کے عقب کی ورسوا اسٹریٹ میں بھیجا جہاں لطف صاحب کا قیام تھا۔ لتا جی کو استاد الطاف حسین لطف نے آگے کی اردو پڑھائی۔ نوشاد علی، شیام سندر، سی رام چندرن، مدن موہن، سلیل چودھری، ایس ڈی برمن، شنکر جے کشن، لکشمی کانت پیارے لال اور دیگر نے اپنی موسیقی اور شعرا کے کلام کو لتا جی کی آواز سے اس طرح ہم آہنگ کیا کہ بہت سے گیت شہکار بن گئے۔

انھیں اردو کی شاعری سناتے یا پھر انھیں اردو سکھاتے۔ لتا جی نے ٹھیک ہونے کے بعد پہلا گانا 'کہیں دیپ جلے کہیں دل' ریکارڈ کیا تھا اور اس گانے کو فلم فیئر ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔ اس دور میں لتا جی کے لیے جو کھانا تیار ہوتا تھا اسے پہلے مجروح صاحب چکھتے تھے اور ان کی اجازت کے بعد لتا جی اس کھانے کو تناول کرتی تھیں۔ اس واقعے سے منگیشکر خاندان سے مجروح سلطان پوری کی قربت کا اندازہ ہوتا ہے۔ پدما سچدیو کی کتاب 'ایسا کہاں سے لاؤں' میں اس سانحے کا مفصل تذکرہ ہے۔ لتا جی کو بنانے اور سنوارنے میں جن لوگوں نے کلیدی کردار ادا کیا، وہ سب مسلم ہی تھے۔

گلوکارہ کرکٹ کی بھی شوقین تھیں۔ خالی اوقات میں ریڈیو پر کمنٹری سنا کرتی تھیں۔ وہ انڈیا انگلینڈ اور انڈیا ویسٹ انڈیز کے مقابلوں سے لطف اندوز ہوتی تھیں۔ انھیں ٹیسٹ کرکٹ ہی اصلی کرکٹ لگتا تھا۔ وہ اکثر ٹیسٹ میچ دیکھنے ممبئی کے وانکھیڈے اسٹیڈیم پہنچ جایا کرتی تھیں۔ انھوں نے پہلی بار 1946 میں ممبئی کے وانکھیڈے اسٹیڈیم میں انڈیا اور آسٹریلیا کا مقابلہ دیکھا تھا۔

1979-80 میں انڈیا اور پاکستان کے مابین ممبئی میں ٹیسٹ منعقد ہوا تھا، اور لتا جی نے اسٹیڈیم کی پہلی صف میں بیٹھ کر میچ دیکھا تھا۔ اس مقابلے میں انڈیا نے 27 سال کے بعد پاکستان کو شکست دی تھی۔ میچ ختم ہونے کے بعد لتا جی اور آشا بھوسلے نے راج سنگھ ڈونگر پور کے روم میں آ کر کھلاڑیوں کو مبارک باد پیش کی تھی۔ تیز گیند باز کرشن گھاوری کو آج بھی یاد ہے کہ اس وقت آشا بھوسلے نے کھلاڑیوں کو تحفے میں پانچ ہزار روپے دیے تھے۔ انھیں ایک مرتبہ انگلینڈ کے اول میدان میں انگلینڈ اور پاکستان کے میچ میں بھی دیکھا گیا تھا۔ لتا جی کی والدہ کہتی تھیں کہ 'مائی' کو کرکٹ کا جنون ہے۔ انھیں پالی امریگر اور چنٹن تنڈولکر کا کھیل بھی پسند تھا۔ سنیل گاوسکر کے اسٹریٹ ڈرائیو (Straight Drive) اور گنڈپا وشوناتھ کے اسکوائر کٹ (Square Cut) کی وہ دلدادہ تھیں۔

یہ سچ ہے کہ منگیشکر خاندان نے بڑی غربت دیکھی تھی۔ 1942 میں دینا ناتھ منگیشکر کی موت ہوگئی تھی اور بڑی بیٹی ہونے کے سبب گھر چلانے کی ذمے داری لتا جی کو سنبھالنی پڑی تھی۔ تیرہ سال کی عمر میں انھوں نے پیسوں کے لیے چھوٹی چھوٹی فلموں میں اداکاری کی تھی۔ انھوں نے 1942 میں اداکاری کی شروعات Pehli Mangala Gaur فلم سے کی تھی۔ اس فلم میں انھوں نے ہیروئین اسنیہ پربھا پردھان کی چھوٹی بہن کا کردار نبھایا تھا۔ بعد ازاں انھوں نے چمو کلا سنسار (1943)، ماجھے بال (1944)، گجا بھاؤ (1944)، جیون یاترا (1946) اور 'بڑی ماں' (1945) جیسی فلموں میں کام کیا تھا۔

لتا منگیشکر کو کیریئر کے شروعاتی دنوں میں مایوسی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ کئی لوگوں نے ان کی آواز کو پتلی اور کمزور بتا کر خارج کر دیا تھا۔ ان کی آواز کو رد کرنے والوں میں سرفہرست نامور فلم ساز ایس مکھرجی تھے۔ ایک بار لتا جی کے استاد غلام حیدر صاحب نے فلم ساز ایس مکھرجی کو دلیپ کمار اور کامنی کوشل کی فلم 'شہید' کے لیے لتا جی کی آواز سنائی۔ بتایا جاتا ہے کہ ایس مکھرجی نے پہلے تو دھیان سے ان کا گانا سنا اور بعد میں کہا کہ وہ اپنی فلم میں انھیں گانا نہیں دے پائیں گے، کیونکہ ان کی آواز کچھ زیادہ ہی پتلی ہے۔

1948 میں فلم 'محل' ریلیز ہوئی تو گیتا رائے چودھری (گیتا دت) کو چھوڑ کر لتا جی کے مقابلے کی تمام گلوکارائیں مثلاً شمشاد بیگم، زہرہ بائی، پارول گھوش اور امیر بائی کرناٹکی ایک ایک کر کے ان کے راستے سے ہٹتی چلی گئیں۔ 1950 میں جب انھوں نے 'آئے گا آنے والا' گایا تو آل انڈیا ریڈیو پر فلمی گانوں کو بجانے کی منظوری نہیں تھی۔ ہندوستان کے شہریوں نے پہلی مرتبہ ریڈیو گوا پر لتا منگیشکر

کی آواز سنی تھی۔ گوا اس وقت پرتگال کے قبضے میں تھا۔ 1961 میں گوا کو آزادی ملی تھی۔ یتندر مشرا کی کتاب 'لتا: سُر گاتھا' میں پنڈت جسراج کا ایک دلچسپ قصہ درج ہے۔ پنڈت جی بتاتے ہیں: 'ایک بار میں بڑے غلام علی خان صاحب سے ملنے امرتسر گیا تھا۔ ہم باتیں کر رہے تھے کہ ٹرانسسٹر پر لتا کا گانا 'یہ زندگی اسی کی ہے، جو کسی کا ہوگیا، پیار ہی میں کھو گیا' سنائی دیا۔ خان صاحب بات کرتے کرتے ایک دم سے خاموش ہوگئے اور جب گانا ختم ہوا تو بولے 'کمبخت کبھی بے سُری نہیں ہوتی'۔ ان کے اس جملے میں والد جیسا پیار بھی تھا اور ایک فنکار کا رشک بھی۔' بڑے غلام علی خاں صاحب نے انھیں 'استادوں کی استاد' کا خطاب دے رکھا تھا اور ان کی والدہ شیونتی منگیشکر انھیں 'دیوتا کا پرساد' مانتی تھیں۔

لتا جی کے سب سے معروف نغموں میں سے ایک 'اے میرے وطن کے لوگو!' ہے۔ حب الوطنی پر مبنی اس گانے کو کوی پردیپ نے 1962 میں ہندوستان اور چین جنگ میں شہید ہونے والے ہندوستانی فوجیوں کو خراج عقیدت پیش کرنے کی غرض سے لکھا تھا۔ شروع میں لتا جی نے جب اس گانے کے بول سنے تو رو پڑیں تھیں۔ انھوں نے مشورہ دیا تھا کہ اس گانے کو سولو کی بجائے ڈوئیٹ میں گانا چاہیے۔ دوسری طرف کوی پردیپ چاہتے تھے کہ لتا جی اسے سولو پیش کریں۔ لتا جی کی تمنا تھی کہ ان کے ساتھ آشا بھوسلے بھی اس گانے میں اپنی آواز دیں۔ انھوں نے ایک شرط رکھی تھی کہ پردیپ جی ریہرسل کے وقت موجود رہیں گے۔ دونوں بہنوں نے ساتھ میں ریہرسل بھی کی، مگر بعد میں نہ جانے کیوں آشا بھوسلے نے اس گانے سے خود کو الگ کرلیا تھا۔ 27 جنوری 1963 کو پہلی بار یوم جمہوریہ کے موقع پر نئی دہلی کے نیشنل اسٹیڈیم میں صدر جمہوریہ ایس رادھا کرشنن اور وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی موجودگی میں لتا جی نے اکیلے ہی اس گانے کو بخشی اور یہ گانا ہمیشہ کے لیے یادگار بن گیا۔ وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو اس گیت کو سنتے وقت اتنے جذباتی ہوگئے تھے کہ ان کی آنکھیں اشکبار ہوگئی تھیں۔ بالی ووڈ کی جانب سے اس پروگرام کا اہتمام فوجیوں کی بیواؤں کی مالی مدد کے لیے کیا گیا تھا۔

اسی طرح 1971 میں ہندوستان اور پاکستان کی جنگ کے دوران بالی ووڈ بنگلہ دیش کی جدوجہد آزادی کے ساتھ کھڑا تھا۔ لتا جی نے بنگالی مہاجرین کی مالی مدد کے لیے منعقد ہونے والے پروگراموں میں اپنی گلوکاری کا مظاہرہ کیا تھا۔ انھوں نے اداکار سنیل دت کے ساتھ ہندوستانی فوج کے طیاروں کے ذریعے مختلف مقامات کا دورہ کیا تھا اور اپنے گانوں سے ہندوستانی فوجیوں کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ گلوکارہ نے خود مختار بنگلہ وائرلیس سینٹر کے قیام کے سلسلے میں اپنی جانب سے فنڈ بھی دیا تھا۔ ان کے علاوہ دیگر فنکاروں جیسے محمد رفیع، آشا بھوسلے، سندھیا مکھرجی، کشور کمار، ہیمنت کمار، منا ڈے اور سلیل چودھری وغیرہ نے کنسرٹس میں گلوکاری سے بنگلہ دیش کے لیے فنڈ اکٹھا کیے تھے۔

وزیر اعظم اٹل بہاری واجپئی اور لتا جی کے درمیان خوشگوار رشتہ تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی قدر کرتے تھے۔ اٹل جی انھیں اپنی بیٹی مانتے تھے اور لتا جی انھیں دادا کہتی تھیں۔ دونوں کا ایک دلچسپ قصہ ہے۔ لتا منگیشکر نے اپنے والد سے منسوب دینا ناتھ منگیشکر ہاسپٹل کی افتتاحی تقریب میں اٹل بہاری واجپئی کو بھی مدعو کیا تھا۔ اٹل جی نے اپنی تقریر کے دوران کہا تھا: 'آپ کا ہاسپٹل اچھا چلے، میں ایسا آپ سے نہیں کہہ سکتا۔ ایسا کہنے کا مطلب ہے کہ لوگ بہت بیمار پڑیں'۔ ایسا سن کر لتا جی حیران رہ گئی تھیں۔

ان کی گلوکارہ نور جہاں سے گہری دوستی تھی۔ نور جہاں بٹوارے کے بعد پاکستان چلی گئی تھیں۔ 1952 میں لتا جی امرتسر گئی ہوئی تھیں۔ ان کا دل نور جہاں سے ملنے کی خاطر بے چین ہوگیا۔ لاہور دو گھنٹے کے فاصلے پر تھا۔ دونوں نے فون پر تقریباً ایک گھنٹے تک گفتگو کی، لیکن لتا جی کا دل بھرا نہیں۔ موسیقار سی رامچندرن کو جب پتہ چلا تو انھوں نے اپنے سفارتی تعلقات کا استعمال کرکے 'نو مین لینڈ' پر دونوں کی ملاقات طے کروائی۔ جیسے ہی نور جہاں نے لتا جی کو دیکھا تو وہ دوڑتی ہوئی آئیں اور انھیں اپنے گلے سے لگا لیا۔ دونوں کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے، اور وہاں موجود سی رامچندرن اور دونوں ملکوں کے افسران اور فوجی بھی ان کی محبت دیکھ کر رونے لگے تھے۔ نور جہاں لاہور سے لتا جی کے لیے مٹھائی اور بریانی لائی تھیں۔ نور جہاں کے ساتھ ان کے شوہر اور لتا جی کے ساتھ ان کی بہنیں اوشا منگیشکر اور مینا کھاڈیکر تھیں۔ نور جہاں کو لتا جی اور لتا جی کو نور جہاں کی گائیکی پسند تھی۔ انھوں نے ایک مرتبہ مہدی حسن کے تعلق سے کہا تھا کہ مہدی حسن کے گلے میں بھگوان بولتا ہے۔ اسی طرح وہ نصرت فتح علی خان اور غلام علی کی گلوکاری سے متاثر تھیں۔

لتا منگیشکر نے گلوکاری کے ساتھ ساتھ اپنے تمام شوق قائم رکھے تھے۔ انھیں فوٹوگرافی میں بھی دلچسپی تھی۔ پرانی اسٹائل کا ریل والا کیمرہ پسند تھا۔ ایک مرتبہ وہ شیواجی کے قلعے پر تصاویر اتارنے میں مصروف تھیں کہ اچانک ان کے ہاتھ سے کیمرہ چھوٹا اور نیچے کھائی میں گر گیا۔ ایک کسان کو وہ کیمرہ ملا تھا۔ کئی دنوں کے بعد اس نے لتا جی کو ان کا کیمرہ لوٹایا، مگر وہ استعمال کے قابل نہیں تھا۔ انھیں ڈیجیٹل فوٹوگرافی سے اتنا لگاؤ نہیں تھا۔ وہ ریڈیو کو یاد کرکے بتاتی تھیں کہ انھوں نے پیسے جوڑ کر اپنا پہلا ریڈیو خریدا تھا اور جب اس ریڈیو پر اس دور کے اسٹار گائیک کندن لال سہگل کی موت کی خبر آئی تو انھوں نے ریڈیو بند کرکے رکھ دیا تھا۔ ریڈیو سے ان کی وابستگی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ریڈیو کے پروگراموں کے لیے فرمائشی پوسٹ کارڈ بھیجا کرتی تھیں۔

سروں کی ملکہ کے ساری دنیا میں پرستار موجود تھے، لیکن انھوں نے خود کبھی اپنا گانا نہیں سنا۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر میں اپنے نغموں کو سنوں گی تو مجھے اپنی گائیکی میں سو خامیاں نظر آئیں گی۔ انھوں نے اپنے کیریئر کے دوران تقریباً سبھی موسیقاروں کے ساتھ کام کیا تھا، لیکن انھیں سب سے زیادہ مدن موہن کی موسیقی پسند تھی۔ انھیں کبھی موسیقار او پی نیئر کے ساتھ گلوکاری کا موقع نہیں ملا۔ وہ لندن کے مشہور البرٹ ہال میں پرفارم کرنے والی پہلی ہندوستانی فنکار تھیں۔ لتا جی کو ہیروں کی انگوٹھی اور سونے کی پائل پہننے کا شوق تھا۔ وہ جاسوسی کتابوں کا مطالعہ کرتی تھیں، اور ان کے پاس شرلاک ہومز کی ڈھیروں کتابیں موجود تھیں۔ انھیں پرفیوم سے بڑا لگاؤ تھا اور انھوں نے دنیا بھر سے پرفیوم اور پرفیوم کی خالی شیشیاں جمع کر رکھی تھیں۔ ایک کمپنی کو جب اس بات کا پتہ چلا تو اس نے 'لتا' نامی پرفیوم تیار کیا تھا۔ جدوجہد کے دنوں میں مُرمُرے، سیو اور چنے کھا کر گذارا کرنے والی عظیم گلوکارہ کو مٹھائیوں میں گلاب جامن اور جلیبی، اندور کے دہی بڑے، گوا کی کری اور سمندری جھینگے، قیمے کے سموسے، لیموں کا اچار اور جوار کی روٹی پسند تھی۔

لتا منگیشکر اندور میں 28 ستمبر 1929 کو پیدا ہوئی تھیں۔ ان کا پیدائشی نام ہیما تھا۔ ان کے والد کے ایک میوزیکل ناٹک میں لتیکا نامی ایک دوشیزہ کا کردار تھا جس سے متاثر ہوکر ان کا نام لتا پڑا تھا۔ جب موسیقی جدید تکنیک کا لبادہ اوڑھ کر آسان ہوگئی، تو بھی لتا جی پہلے جتنا ہی ریاض کرتی رہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ مجھے اپنی کلا سے زیادہ محنت پر اعتماد ہے۔ ان کی موت سے موسیقی کے ایک دور کا خاتمہ ہوگیا، لیکن ان کی آواز کا جادو رہتی دنیا تک شائقین موسیقی کو لطف اندوز کرتا رہے گا۔ آنے والی نسلیں انھیں ہندوستانی ثقافت کی ایک باوقار شخصیت کے طور پر یاد رکھیں گی جن کی سریلی آواز میں لوگوں کو مسحور کرنے کی بے مثال صلاحیت تھی۔

■

Farhan Hanif Warsi
Post Box No: 4546, Mumbai Central Post Office
Mumbai- 400008
Mob.:9320169397
Email.: farhanhanifwarsi@gmail.com

محمد قاسم انصاری

لتا منگیشکر کا ایک یادگار اردو سبق

اردو زبان کی چند نمایاں خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ اردو شیریں اور میٹھی زبان ہے اسی لیے اردو جیسی حسین، خوبصورت اور دلکش زبان سے محبت کرنے والے ملک کے طول و عرض میں موجود ہیں۔ یہی نہیں بلکہ سرحدوں کے پار بھی اس زبان کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ اردو شاعری بالخصوص اردو غزل کی مقبولیت اس کی سب سے روشن مثال ہے۔ اردو کے لاتعداد شعرا کے کلام اور انکے اشعار زبان زد خاص و عام ہیں۔ ملک کی مختلف محفلوں، مشاعروں اور بڑے بڑے پروگراموں میں اردو اشعار بکثرت پڑھے اور سنے جاتے ہیں۔ گلی کوچوں، محلوں اور بازاروں سے لے کر ایوان بالا اور قصر شاہی تک اردو اشعار کی جلوہ گری دیکھی جا سکتی ہے۔ غزل سرائی کے کنسرٹس اور غزل گلوکاروں نے اردو کو عوام میں مقبول بنانے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ بڑے غلام علی خان، مہدی حسن، بیگم اختر، جگجیت سنگھ، طلعت عزیز، غلام علی، پنکج ادھاس، ہری ہرن، چترا سنگھ کے علاوہ درجنوں نام ہیں جنھوں نے اردو غزل کو شہرت دوام بخشا۔ اس پس منظر میں استاد داغ دہلوی نے کچھ غلط نہ کہا تھا کہ

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

اس تمہید کو پیش کرنے کا مقصد فقط اتنا ہے کہ سروں کی ملکہ، فخر ہندوستان اور اس کائنات کی ایک عظیم گلوکارہ لتا منگیشکر کی سریلی، شیریں اور سحر انگیز آواز کو دلکشی، غنائیت و موسیقیت عطا کرنے میں اردو کا نمایاں کردار ہے۔ قدرت نے انھیں آواز کا انمول تحفہ تو عطا کیا ہی تھا اس میں مزید نکھار پیدا کرنے کے لیے انھیں اردو زبان کی جانب مائل کر دیا۔ ان کے جادوئی گلے سے نکلی آواز میں اردو الفاظ کی مٹھاس اس طرح رچ بس گئی کہ ان کے گیتوں کی پہچان ان کی آواز کے ساتھ اردو زبان بھی بن گئی۔

یوں تو لتا جی کی مادری زبان مراٹھی تھی اور اپنے کیریئر کا آغاز انھوں نے مراٹھی فلموں سے ہی کیا لیکن اس مراٹھی گلوکارہ نے اپنے فن کو جلا بخشنے کے لیے اردو زبان بھی سیکھی۔ یہ خوبصورت زبان سیکھنے کے پیچھے ایک بڑا دلچسپ واقعہ ہے جسے اکثر لوگ نہیں جانتے۔ اس واقعہ کو نسرین منی کبیر نے اپنی کتاب بعنوان 'لتا منگیشکر' میں کچھ اس طرح بیان کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

''بات 1948 کی ہے جب لتا منگیشکر انل بسواس کے ساتھ ٹرین میں سفر کر رہی تھی۔ اس ٹرین میں شہنشاہ جذبات دلیپ کمار صاحب بھی تھے۔ سفر کے دوران انل بسواس نے لتا کا تعارف دلیپ صاحب سے کرایا اور کہا کہ یہ نئی لڑکی ہے یقیناً آپ کو اس کی آواز پسند آئے گی۔ انھوں نے گذارش کی کہ وہ اس مراٹھی لڑکی سے فقط ایک نغمہ سن لیں۔ لتا کی نغمگی اور دلکش آواز سننے کے بعد دلیپ صاحب نے ان کی خوب تعریف اور حوصلہ افزائی کی۔ تلفظ اور اردو الفاظ کی ادائیگی میں کچھ کمی نظر آئی تو بطور مشورہ و اصلاح یہ تلقین کی کہ وہ اردو زبان اور سیکھ لیں تاکہ آواز کی مٹھاس کے ساتھ اردو کی شیرینی اس میں مزید شامل ہو جائے۔ کیونکہ آپ کے گانے میں صحیح تلفظ کی ادائیگی نہ ہونے کی وجہ سے کہیں کہیں دال بھات کی بو آتی ہے۔ لتا جی نے دلیپ کمار صاحب کی اس نصیحت پر بھرپور عمل کیا اور آواز کی اس ملکہ نے اردو زبان سیکھنی شروع کر دی۔ نسرین کہتی ہیں کہ لتا جی نے یہ واقعہ محمد شفیع نامی شخص کو بتایا جو ہندی فلموں میں اردو زبان کی اہمیت سے بخوبی واقف تھے۔ محمد شفیع نوشاد اور انل دا کے معاون بھی تھے۔ لتا جی کے اصرار پر انھوں نے محبوب نامی شخص کو اردو سکھانے کے لیے مقرر کیا۔ گویا محبوب لتا جی کے اردو استاد مقرر ہوئے اور کچھ عرصے تک انھوں نے اردو زبان سکھائی۔ اس کتاب میں لتا کہتی ہیں کہ وہ اردو زبان بہت اچھے طریقے سے نہیں بول پاتی تھیں لیکن نغموں میں اردو الفاظ کی ادائیگی پورے اعتماد کے ساتھ کرتی تھیں۔ بعض مشکل الفاظ کو وہ ناگری میں لکھ لیا کرتی تھیں۔ اس طرح انھوں نے اردو زبان سیکھی۔ آگے چل کر دلیپ صاحب اور لتا جی کا یہ رشتہ بہن بھائی کے رشتے میں تبدیل ہو گیا۔ وہ انھیں ہمیشہ اپنی چھوٹی بہن تصور کرتے رہے اور لتا جی بھی ہمیشہ دلیپ صاحب کی کلائی میں راکھی باندھ کر اس مقدس رشتے کی پاسداری کرتی رہیں۔

لتا کی اردو زبان سے وابستگی اور ان کے اعتماد کی تعریف اس عہد میں نرگس کی ماں جدن بائی نے بھی کی۔ لتا کہتی ہیں کہ ایک مرتبہ وہ فلم محل کے نغمہ 'آئے گا آنے والا' کی ریکارڈنگ کے لیے اسٹوڈیو گئی تھیں۔ ساتھ والے کمرے میں نرگس اور ان کی ماں جدن بائی موجود تھیں۔ ریکارڈنگ کے دوران جدن بائی نے لتا کا پورا نغمہ سنا۔ پھر انھیں بڑی شفقت سے اپنے قریب بلایا اور ان کا نام پتہ پوچھا۔ جدن بائی نے لتا کی آواز اور اردو الفاظ کی ادائیگی کی خوب ستائش کی۔ لتا نے جدن بائی سے مزید کہا کہ وہ ابھی اردو زبان سیکھ رہی ہیں۔ لتا اردو زبان سیکھنے سے متعلق مزید کہتی ہیں کہ جو بھی نغمہ انھیں گانے کے لیے دیا جاتا تو وہ نغمہ کے الفاظ اور اس کے تلفظ کی خوب مشق کرتی اور ان کی ادائیگی پر زور دیتی تھیں۔ ایک مرتبہ جب وہ کسی نغمے کے بول سنتی تو اس کے تلفظ اور صوتی آہنگ کو ناگری رسم خط میں بھی لکھ لیا کرتی تھیں۔

یہ اور اس قسم کی متعدد باتیں لتا جی اور اردو زبان سے متعلق اس کتاب میں ملتی ہیں۔ انھوں نے اردو کی مقبول ترین صنف غزل میں بھی اپنی آواز کی جلوہ گری اور اس کی سحر انگیزی دکھائی ہے۔ اردو کے شہرہ آفاق شاعر مرزا غالب کی غزلوں کو ترنم بخشا جو ان کے غیر فلمی ریکارڈس میں درج ہے۔

رونے سے اور عشق میں بے باک ہو گئے
نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا
پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا/ کوئی امید بر نہیں آتی

بازیچہ اطفال اور ہزاروں خواہشیں ایسی وغیرہ غزلوں کو اپنی مسحور کن آواز بخشی۔ اپنے پورے کیریئر میں لتا نے ہندی اردو فلموں کے علاوہ دیگر زبانوں کے تقریباً تیس ہزار نغمات کو اپنی آواز بخشی۔

اردو کے ممتاز شاعر مجروح سلطانپوری نے اپنی ایک نظم کا عنوان 'لتا منگیشکر' کے نام دیا ہے اس نظم میں لتا جی کے فن اور ان کی عظمت کا اعتراف جس انداز میں مجروح صاحب نے کیا ہے وہ اعتراف اردو کے حوالے سے ہندی سنیما کی تاریخ میں دور دور تک نظر نہیں آتا۔ مجروح لکھتے ہیں۔

میرے لفظوں کو جو چھو لیتی ہے آواز تیری
سرحدیں توڑ کے اڑ جاتے ہیں اشعار میرے
تجھ کو معلوم نہیں، یا تجھے معلوم بھی ہو
وہ سیاہ بخت جنھیں غم نے ستایا برسوں
ایک لمحے کو جو سن لیتے ہیں نغمہ تیرا

پھر انھیں رہتی ہے جینے کی تمنا برسوں
جس گھڑی ڈوب کے آہنگ میں تو گاتی ہے
آیتیں پڑھتی ہیں سازوں پہ صدا تیرے لیے
دم بدم خیر مناتے ہوئے تیری چنگ و رباب
سینہ نے سے نکلتی ہے دعا تیرے لیے
نغمہ و ساز کے زیور سے رہے تیرا سنگار
ہو تیری مانگ میں تیرے ہی سروں کی افشاں
تیری تانوں سی تیری آنکھ میں کاجل کی لکیر
ہاتھ میں تیرے ہی گیتوں کی حنا ہو رقصاں
میرے لفظوں کو جو چھو لیتی ہے آواز تیری
سرحدیں توڑ کے اڑ جاتے ہیں اشعار میرے

مجروح صاحب نے ہندی فلموں کے لیے لاتعداد نغمے تخلیق کیے لیکن انھیں قبول عام لتاجی کی آواز سے ہی نصیب ہوا۔ یہ بات فقط مجروح صاحب کے ساتھ ہی مختص نہیں بلکہ لاتعداد اردو اور ہندی کے شاعروں کے نغمات کو ابدی آہنگ لتا جی نے ہی عطا کیا لیکن مجروح نے جو منظوم خراج عقیدت پیش کیا ہے وہ لتا منگیشکر کی عظمت کا ہی خاصہ ہے۔

ہندی سنیما کی اس عظیم گلوکارہ کا فلمی سفر تقریباً سات دہائیوں پر محیط ہے۔ اس پورے سفر میں انھوں نے ہزاروں اردو ہندی نغمات کو آواز دی۔ گویا فن گلوکاری میں لتا جی خود میں ایک ایسی انجمن و دبستان تھیں جہاں سے اس فن کے بہت سے چشمے پھوٹے اور آج کی نئی نسل ان چشموں سے خوب فیضیاب و سیراب ہو رہی ہے۔ آواز کی جادوگری اور نغمہ سرائی کی کوئی ایسی محفل اور کوئی ایسا منچ نہیں جہاں انھیں نہ یاد کیا جاتا ہو۔ قدرت نے انھیں جو سحر انگیز آواز عطا کی تھی وہ ہندی سنیما میں کسی اور گلوکار و گلوکارہ کو میسر نہ آسکی۔ اسی لیے ملک کے ہر بڑے اعزاز سے انھیں نوازا گیا۔ بھارت رتن، دادا صاحب پھالکے ایوارڈ، پدم بھوشن و پدم وبھوشن جیسے باوقار اعزازات کے ساتھ بلبل ہند اور سروں کی ملکہ کے خطابات اور متعدد اعزازات، انعام و اکرام سے انھیں سرفراز کیا گیا لیکن پھر بھی ہر ایک کو یوں لگتا ہے کہ ان کی آواز اور ان کے فن کا مقام کچھ اور ہی ہے۔

28 ستمبر 1929 میں لتا منگیشکر مدھیہ پردیش کے اندور شہر میں پیدا ہوئیں۔ فن موسیقی اور گلوکاری کی تعلیم گھر میں ہی ملی۔ ان کے والد پنڈت دینا ناتھ منگیشکر خود ایک گلوکار اور اداکار تھے۔ لتا کا بچپن غربت میں گزرا۔ لتا کے والد گھر میں بچوں کو موسیقی اور گانے کی تعلیم دیتے تھے۔ لتا خوب دلچسپی کے ساتھ والد کے درس کو سنا کرتی تھیں۔ ایک مرتبہ لتا کے والد گھر پر نہیں تھے اور وہ کلاس نہیں لے سکے۔ کہتے ہیں کہ اس دن ان کی جگہ ننھی لتا نے وہ کلاس لے لی۔ والد اپنی بیٹی کی خوبیوں سے بخوبی واقف تھے انھوں نے یہ پیش گوئی بھی کی تھی کہ ایک دن اس کی آواز پورے افق پر چھا جائے گی لیکن اس دن وہ لتا کی اس کامیابی کو دیکھنے کے لیے موجود نہیں ہوں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا لتا کو کامیاب دیکھنے سے قبل ہی اس کے والد کا انتقال ہو گیا۔ لتا گھر میں سب سے بڑی تھیں۔ آشا بھونسلے اور اوشا منگیشکر ان کی چھوٹی بہنیں ہیں جو اس میدان میں ایک منفرد مقام رکھتی ہیں۔ ہردے ناتھ منگیشکر لتا کے چھوٹے بھائی ہیں۔ اپنے ابتدائی دور میں انھوں نے سخت محنت و جدو جہد کی۔ والد کے انتقال کے بعد اپنے مستقبل کو سنوارنے سے لے کر گھر کی ذمے داریاں انھیں کے کاندھوں پر تھیں اور انھوں نے بحسن خوبی اسے انجام دیا۔ لتا جی نے کلاسیکی موسیقی و گلوکاری کی تعلیم اور اس کی باریکیاں استاد امانت علی خان سے سیکھیں۔ استاد کے پاکستان ہجرت کر جانے کے بعد انھوں نے اس سلسلے کو جاری رکھا۔ بڑے غلام علی خان کے شاگرد پنڈت تلسی داس شرما سے فیض حاصل کرتی رہیں۔

لتا جی نے اپنے فلمی سفر کا آغاز 1948 میں کیا۔ انھوں نے فلم ساز غلام حیدر کی فلم مجبور کے لیے نغمے گائے اس فلم کا دل میرا توڑا جیسا نغمہ بے حد مقبول ہوا۔ 1949 میں فلم محل اور انداز منظر عام پر آئیں اس طرح وہ اپنے معاصرین شمشاد بیگم، امیر بائی کرناٹکی جیسی صف اول کی گلوکاراؤں میں شامل کی جانے لگیں۔

بلبل ہند لتا منگیشکر کو جب شہرت ملنی شروع ہوئی تو ان کے مخالفین و حاسدین بھی پیدا ہونے لگے۔ ایک مرتبہ وہ سخت بیمار پڑ گئیں۔ ڈاکٹر نے دیکھنے کے بعد یہ انکشاف کیا کہ انھیں کھانے میں زہر دیا جا رہا ہے نیز یہ سلسلہ کافی دنوں سے جاری ہے۔ ڈاکٹر کے انکشاف کے بعد چھان بین اس بات کی شروع ہوئی کہ انھیں کون زہر دے رہا ہے اور کب سے دے رہا ہے؟۔ بالآخر گھر کے ملازم بالخصوص طباخ کی چھٹی کر دی گئی۔ یہ راز پوری طرح افشا نہ ہو سکا کہ انھیں زہر کون اور کیوں دے رہا تھا۔ وجہ صاف تھی کہ وہ معاصرین کی نظروں میں کھٹکنے لگی تھیں۔ لتا جی اس وقت کی ملکہ ترنم نور جہاں کو اپنا گرو مانتی تھیں۔ وہ غیر منقسم ہندوستان کی سب سے مشہور گلوکارہ تھیں۔ نور جہاں بھی لتا کی عظمت کا اعتراف کرنے لگی تھیں۔

1950-60 لتا منگیشکر کے کیریئر کا اہم موڑ ہے۔ اس عہد میں انھوں نے پلے بیک سنگنگ میں اپنا منفرد مقام بنایا۔ یہ ایسا دور تھا کہ فلم انڈسٹری کا ہر بڑے سے بڑا فلم ساز لتا جی کو اپنی فلموں میں ترجیح دیتا۔ بیجو باورا، مغل اعظم اس دور کی سب سے یادگار فلمیں ہیں۔ ان فلموں کو شاہکار بنانے میں لتا جی کی آواز کو بہت بڑا دخل ہے اور انھیں متعدد فلم فیئر ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اسی طرح 80 کی دہائی میں شنکر جے کشن، نوشاد، ایس ڈی برمن، مدن موہن، سی رام چندر، سنیل چودھری، خیام اور سجاد حسین کے ساتھ موسیقی کی دوسری نسل میدان میں آچکی تھی۔ اب لکشمی کانت پیارے لال، آر ڈی برمن اور کلیان جی آنند جی جیسے بڑے موسیقار آچکے تھے۔ لتا جی نے ان تمام موسیقی کاروں کی دھنوں کو لازوال بنا دیا۔ کہتے ہیں اسی دوران ہند چین جنگ ہوئی تو فوج کے جوانوں میں جوش و ولولہ پیدا کرنے کے لیے ایک گیت کی ضرورت شدت سے محسوس کی گئی۔ چنانچہ پردیپ جی کو ایک نغمہ تخلیق کرنے کی ہدایت کی گئی۔ انھوں نے موقع کی مناسبت سے بڑی جانفشانی سے اے میرے وطن کے لوگو! جیسا بیش قیمت نغمہ خلق کیا اور اسے لتا جی نے جب اپنی آواز بخشی تو پورا گانا سننے کے بعد اس وقت کے وزیر اعظم پنڈت نہرو نے کہا تھا کہ بیٹی تو نے مجھے رلا دیا۔ 90 کی دہائی میں لتا جی کی عمر بڑھ رہی تھی لیکن اس بڑھتی عمر میں بھی ان کی آواز ماند نہ پڑی۔ اسی تازگی کے ساتھ وہ فلموں میں گاتی اور کروڑوں دلوں کو مسحور کرتی رہیں۔ ہندی سینما کی لاتعداد اداکاراؤں کو انھوں نے اپنی آواز بخشی۔ مینا کماری۔ مدھوبالا، نندا، وجینتی مالا، مالا سنہا، آشا پاریکھ، سائرہ بانو، شرمیلا ٹیگور، ہیما مالنی وجیا بچن سمیت درجنوں ایکٹریس سے لے کر شری دیوی، جیا پردہ، مادھوری دکشت، رانی مکھرجی پریتی زنٹا و عہد حاضر کی لاتعداد اداکاراؤں کو اپنی آواز بخشی۔ انھوں نے اپنے کیریئر میں سب سے زیادہ نغمے محمد رفیع کے ساتھ گائے۔ لتا اور رفیع کی جوڑی نے ایک عرصے تک لوگوں کے دلوں پر حکمرانی کی۔ رفیع کے بعد لتا جی نے کشور کمار کے ساتھ 327 نغمے گائے جبکہ مکیش کے ساتھ 161 گانے گائے۔ اسی طرح منا ڈے، مہندر کپور، طلعت محمود، ہیمنت کمار، سی رام چندر، سریش واڈیکر، شبیر کمار، امت کمار، نتن مکیش محمد عزیز، محمد، اودت نارائن، کمار شانو، سونو نگم کے علاوہ موجودہ گلوکاروں کے ساتھ بھی نغمے گائے اور ہندی سنیما کو بلندی عطا کی۔ لتا جی کی گائیکی کا یہ طویل سفر اردو دوستی اور اردو زبان سے محبت کا بھی مظہر ہے۔ آج وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن ان کے لازوال نغمے فضاؤں میں گونجتے اور ہمارے کانوں کو مسحور کرتے رہیں گے۔ وہ ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ انھوں نے خود ہی کہا تھا کہ 'تم مجھے یوں بھلا نہ پاؤ گے'۔ ان کی سنگنگ کا ذکر جب جب اور جہاں کہیں ہوگا اس میں ان کی آواز کی عظمت کے ساتھ اردو کا مذکورہ سبق بھی یقیناً یاد رکھا جائے گا۔

■

Dr. Mohd Qasim Ansari
Asst. Prof. Dept of Urdu, BHU,
Varanasi (UP), Mob.: 8112967265

اردو کا طلسم اور لتا منگیشکر

منظر قاسمی

فن یا آرٹ انسان کو جاودانی زندگی عطا کرتا ہے انسان کو موت تو آجاتی ہے مگر موت اس کی شخصیت اور فن کو ختم نہیں کرسکتی۔ فن ایک ایسا جادو ہے جو دلوں میں اتنا اثر کرجاتا ہے کہ دنیا فن کار کے قدموں میں دکھائی دیتی ہے۔ ملک، مملکت، ریاست اور سیاسی وجغرافیائی سرحدیں بھی فن کی خوشبو کو قید نہیں کرسکتیں۔ کچھ ایسا ہی عالم لتا منگیشکر کی سریلی اور سحر انگیز آواز کا ہے جس کی خوشبو سے پورا برصغیر ہی نہیں بلکہ دنیا میں جہاں جہاں بھی ہندوستانی نغموں کے شائقین اور پرستار بستے ہیں لتا منگیشکر کی آواز کی رسائی وہاں وہاں تک ہے۔ ہمارے جیسے نہ جانے کتنے ہی لوگ ہوں گے جو لتا منگیشکر کی آواز سنتے سنتے بڑے ہوئے اور جوان ہوئے اور جب تک زندہ رہیں گے اسی آواز اور لہجے کے سحر میں مبتلا رہیں گے۔ اب جب کہ وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن اپنے گیتوں، غزلوں، بھجنوں اور قوالیوں کے ذریعے ہمارے درمیان ہمیشہ موجود رہیں گی۔ انھوں نے جس لفظ کو اپنے سُر، ساز اور آواز سے چھو لیا اس میں ایک تابانی اور درخشانی بھردی۔ جس طرح لغت کو مردہ الفاظ کا ایک مقبرہ کہا جاتا ہے جس میں شاعر، ادیب اور انشاء پرداز لوگ معنی ومراد کی جان ڈال دیتے ہیں اسی طرح الفاظ کو بھی اگر سُر، ساز اور آواز سے آراستہ وپیراستہ کردیا جائے تو اس کی چمک اور مہک بہت دیر تک اور بہت دور تک جاتی ہے۔ ہندوستان کی دھرتی سے سروں کا ایک ایسا سورج چمکا جس کی تابانی اور ضیا پاشی سے دنیا کا گوشہ گوشہ منور ہوگیا۔ لتا منگیشکر کو قدرت نے سُر، ساز اور آواز کی وہ بیش قیمتی دولت عطا کہ جس کو انھوں نے موسیقی کے پرستاروں اور عاشقوں میں خوب لٹائی۔ موسیقی کی تاریخ پر جب ہم نظر کرتے ہیں تو ہندوستان کے کلاسکی میوزک کا پورے عالم میں ڈنکا بجتا ہوا نظر آتا ہے۔

سنگیت اور شاعری ہندوستان کی رگ وپے میں خون بن کر رواں دواں ہے۔ انسانی زندگی کی کوئی بھی تقریب خواہ وہ خوشی ہو یا غم، شعروشاعری اور سنگیت کے بغیر ادھوری اور بے کیف معلوم ہوتی ہے۔ انسان شدت غم والم میں مبتلا ہے تو موسیقی اس کو راحت پہنچاتی ہے اور خوشی کو دوبالا کرتا ہے تب بھی موسیقی انسان کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ گزشتہ عہد سے لے کر دور حاضر تک تاریخ شاہد ہے کہ بڑے سے بڑے شہنشاہ، بادشاہ، حکمراں اور والیانِ ریاست وسیاست اپنی درباری، انتظامی وانصرامی مصروفیتوں کی تکان مٹانے کے لیے سنگیت کا سہارا لیتے رہے ہیں۔ محاذ جنگ پر فوجوں اور فوجیوں میں جنگ، جوش، ولولہ، جواں مردی اور حب الوطنی کا جذبہ بھرنے کے لیے موسیقی کا ہی سہارا لیا جاتا ہے۔ انسان اپنی فرصت اور تنہائی گزارنے کے لیے موسیقی پر گزر بسر کرتا ہے۔ گیت سنگیت کی قدردانی اور حوصلہ افزائی درباروں سے لے کر ہر قسم کی خاص وعام محفلوں اور جلسوں میں دیکھی گئی ہے۔

ہندوستان کی سرزمین پر گلوکار تو بہت آئے اور گئے مگر جو شہرتِ دوام لتا منگیشکر کے حصے میں آئی وہ شاید کسی اور فنکار کے حصے میں نہیں آئی۔ ملک کا شاید ہی کوئی اعزاز ہو جو ان کی جھولی میں نہ ڈالا گیا ہو۔ پدم بھوشن، پدم وبھوشن، دادا صاحب پھالکے ایوارڈ اور بھارت رتن جیسے گراں قدر اعزازات تو سرفہرست ہیں لیکن ایسے ہی نہ جانے کتنے ہی اعزازات سے ان کی عزت افزائی کی گئی۔ انھوں نے ہندوستان کی بیس زبانوں میں تقریباً چالیس ہزار گانے گاکر گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ قائم کیا۔ مسلسل چھ دہائیوں تک نغموں کے بازار میں سکہء رائج الوقت بنے رہنا کسی طلسمی داستان سے کم نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ لتا جی کی سریلی آواز کا سحر تین نسلوں تک پھیلا ہوا ہے۔ قدرت نے اپنی فیاضی دکھاتے ہوئے انھیں سروں کی مملکت قائم کرنے کے لیے جی بھر کر مہلت دی۔ وہ کسی میوزک اسکول کی پروردہ نہیں تھیں بلکہ ان کی تعلیم کا سلسلہ بھی کوئی بہت خاطر خواہ نہیں تھا۔ مراٹھی کنبہ میں پیدا ہونے کے سبب ان کی مادری زبان مراٹھی تھی لیکن فلمی دنیا کی زبان ہندی۔ اردو تھی یا ہندوستانی اس لیے انھوں نے دیگر زبانوں کو بڑی محنت اور لگن سے سیکھا جن میں اردو زبان بھی ہے۔ اپنی اردو دانی کے سلسلے میں لتا منگیشکر نے مکالمہ نگار اور نغمہ نگار جاوید اختر سے ایک انٹرویو میں بتایا کہ:

”ایک دفعہ میں ہدایت کار انل بسواس اور یوسف خان یعنی دلیپ کمار کے ساتھ ایک لوکل ٹرین میں گورے گاؤں سفر کررہے تھے تب انل بسواس نے دلیپ صاحب سے لتا کا تعارف کراتے ہوئے کہا تھا کہ یہ بہت اچھا گاتی ہے تو یوسف خان نے پوچھا کہ کیا نام ہے میں نے کہا کہ لتا منگیشکر تو انھوں نے کہا مراٹھی؟ میں نے کہا ہاں تب انھوں نے کہا کہ مراٹھی لوگوں کے بول چال میں زبان تھوڑا دال چاول جیسی ہوتی ہے۔“

(جاوید اختر سے لتا کا انٹرویو، بی این این نیوز کے لیے، 2008، یوٹیوب)

یہ بات لتا منگیشکر کو کھٹک گئی اور انھوں نے گھر واپس آکر اردو سیکھنے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت میوزک ڈائریکٹر نوشاد کے اسسٹنٹ محمد شفیع ہوا کرتے تھے جن سے لتا کے بڑے قریبی روابط تھے اور ان کو وہ بھیا کہہ کر مخاطب کیا کرتی تھیں۔ ایک دفعہ انھوں نے کہا کہ شفیع بھیا کچھ کیجیے مجھے کوئی اردو زبان سکھانے والا بتایئے۔ پھر انھوں نے ایک مولوی صاحب جن کا نام محبوب تھا ان کو اردو زبان سکھانے پر مامور کیا اور لتا نے بڑی لگن سے اردو سیکھنا

شروع کر دیا کیوں کہ دماغ میں دلیپ کمار کا تھوڑا دال چاول والا جملہ گونج رہا تھا۔ مولوی صاحب بھی لتا منگیشکر کو اردو زبان کے اشعار خوب سنایا کرتے تھے اور اس کے ساتھ یہ بھی واضح کرتے تھے کہ غالب نے یہ کہا ہے، ذوق نے ایسے کہا ہے اور میر تقی میر نے یوں کہا ہے۔ اس طرح زبان کے ساتھ ساتھ مولوی صاحب لتا منگیشکر کے ادبی ذوق وشوق کی آبیاری کرتے تھے۔ بعد میں مولوی صاحب نے سُروں کی ملکہ کو ان شعرا کی کتابیں بھی لاکر دیں۔ وہ اپنے متعلق یہ بھی کہتی ہیں کہ کسی بھی نئی چیز کو وہ بہت جلد سیکھ لیتی تھیں اس لیے دن دن بھر کی فلمی گانوں کی ریکارڈنگ کی مصروفیت کے باوجود اردو زبان اور اس کا تلفظ انھوں نے بہت جلد سیکھ لیا۔ لتا منگیشکر کے تمام انٹر ویو اور باتوں کو سن کر ایسا لگتا ہے کہ مراٹھی ہونے کے باوجود گفتگو اور طرز تکلم میں ایک شائستہ، مہذب، متانت، سنجیدگی اور بڑی ہی رچی بسی ہوئی زبان کا استعمال کرتی ہیں۔ ان کی زبان، لہجہ انداز اور ذوق پر سنیما کے طلائی دور کی چھاپ بالکل صاف نظر آتی ہے۔ اپنے اردو تلفظ کا ایک اور واقعہ سناتے ہوئے لتا جی نے پاکستانی نیوز اینکر کامران شاہد کو بتایا کہ فلم 'محل' کے ہدایت کار کمال امروہوی کے لیے انھوں نے ایک بڑا ہی دلچسپ گانا گایا جس کی ریکارڈنگ بھی بڑی فنی اور تکنیکی ہنرمندی سے کی گئی وہ گیت تھا

'آئے گا آنے والا.....'۔ اس زمانے میں ایکو سسٹم نہیں تھا اس کے لیے مجھے دور سے مائک کے پاس گاتے ہوئے آنا تھا۔ بنا سانس چڑھے میں نے ایک ہی دفعہ میں وہ کر دکھایا۔ میں بہت مطمئن ہو کر فلم اسٹوڈیو سے باہر آگئی کہ چلو میرا گانا اشوک کمار جی کو پسند آگیا جو کہ فلم اسٹوڈیو کے مالک تھے۔ میں جیسے ہی باہر آئی تو دیکھا وہاں فلم اداکارہ نرگس کی والدہ جدن بائی اور نرگس دونوں ہی موجود تھے انھوں نے مجھ سے کہا بیٹا یہاں آؤ کیا نام ہے تمھارا؟

میں نے کہا لتا منگیشکر۔

مراٹھن ہو؟

میں نے کہا۔ ہاں....

انھوں نے کہا 'دیپک بغیر کیسے پروانے جل رہے ہیں....' میں بغیر کیسے ادا کیا؟

میں نے کہا ہو گیا...

انھوں نے کہا بہت اچھا ادا کیا ہے۔

تلفظ کی ادائیگی پر میری خوب تعریف کی۔

(راجیو منسد سے لتا منگیشکر کا انٹرویو، سی این این آئی بی این، 2007، یوٹیوب)

کامران شاہد سے ایک انٹرویو کے دوران لتا منگیشکر نے بتایا کہ پچاس کے عشرے میں جس وقت انھوں نے فلمی دنیا میں خصوصاً موسیقی کی دنیا میں قدم رکھا تو اس وقت فلموں میں اردو کی بے حد ضرورت تھی کیونکہ اس وقت اگر شین قاف درست نہیں ہے تو میوزک ڈائریکٹر، ہدایت کار اور اداکار سب نکتہ چینی کرتے تھے۔ آج شین قاف کی اتنی ضرورت نہیں ہے۔ ایک چیز اور دھیان دینے لائق ہے کہ ان کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اپنے پورے گائیکی کے کیریئر میں انھوں نے کہیں پر بھی شین قاف کی غلطی نہیں کی۔ جب لتا کا تلفظ درست ہو گیا اس وقت یہ بھی کہا گیا کہ اب مولوی صاحب کی چھٹی کر دیجیے تو لتا جی نے انکار کر دیا اور یہ بھی سننے میں آتا ہے کہ تا عمر مولوی صاحب کو نذرانہ پیش کرتی رہیں۔ لتا منگیشکر کے تلفظ اور مخرج پر انتہائی گرفت کو دیکھ کر بہت سے دیگر نغمہ گویوں نے اردو زبان کو سیکھا اور اپنے نغموں کے لہجے میں خاطر خواہ لچک، کھنک، چمک، ملائمیت، جاذبیت، دلکشی اور سحر آفرینی پیدا کی۔ ملکہ ترنم نور جہاں کا ذکر کرتے ہوئے ایک پروگرام میں انھوں نے اعتراف کیا کہ میں نے لفظ 'محبت' کہنا اپنی دیدی یعنی نور جہاں سے سیکھا ہے۔

شروعات میں لتا منگیشکر کے ساتھ ایک اور سانحہ پیش آیا اور ان کی آواز کو بہت پتلی آواز کہہ کر مسترد کر دیا گیا۔ ہوا یوں کہ جس وقت فلم 'شہید' بن رہی تھی اس میں دلیپ کمار اور کامنی کوشل بطور مرکزی کردار ہیرو اور ہیروئن تھے۔ اس میں ایک نغمہ کامنی کوشل پر فلمایا جانا تھا اس وقت فلمستان کے مالک ایس مکھرجی صاحب کی ہدایت کاری میں بن رہی اس فلم میں میوزک ماسٹر غلام حیدر صاحب کا تھا جب انھوں نے لتا کا گانا سنا تو کہا کہ اس کی آواز بہت پتلی ہے اور اس کا گانا میری ہیروئن کو سوٹ نہیں کرے گا۔ یہ بڑا ہی صبر آزما لمحہ تھا لیکن اس میں بھی انھوں نے امید اور رجائیت کا دامن تھامے رکھا اور حالات کا مقابلہ کرتی رہیں۔

معروف ہدایت کار اور قلم کار ضیا سرحدی کے حوالے سے لتا نے بتایا کہ ایک دفعہ ضیا صاحب کولھاپور تشریف لائے جو ان کی فلم 'بڑی ماں' کا شوٹنگ لوکیشن تھا اور وہ اس فلم کے مکالمہ نویس تھے۔ کولھاپور میں اس وقت لتا منگیشکر پرفل پکچرز میں ماسٹر ونائک کے یہاں کام کرتی تھیں۔ اس میں اپنے زمانے کی ایک بڑی ہیروئن اور ملکہ ترنم نور جہاں بھی بطور ہیروئن کام کر رہی تھیں اور اسی سلسلے سے کولھاپور تشریف لائیں۔ ضیا صاحب نے میرا گانا سن کر کہا کہ بیٹا تم ذرا اپنا تلفظ درست کر لو۔ میں نے کہا کہ میں تو مہاراشٹرین ہوں یہاں کولھاپور میں میرا تلفظ کیسے ٹھیک ہو سکتا ہے۔ ضیا صاحب نے کہا گھبراؤ نہیں 'ہم آپ کو بتائیں گے'۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔' جس فلم اسٹوڈیو میں یہ شوٹنگ چل رہی تھی اس میں ایک دفعہ میں ایک گانا ریکارڈ کروا رہی تھی۔ ماسٹر ونائک جی نے ملکۂ ترنم نور جہاں سے کہا کہ یہ لڑکی بہت اچھا گاتی ہے (اس وقت لتا کی عمر محض تیرہ یا چودہ برس کی تھی) تو انھوں نے کہا کہ بیٹا ذرا گا کر سناؤ میں نے ایک دو کلاسیکل گانے اور ایک دو گانے نور جہاں کو سنایا تو انھوں نے دعائیہ انداز میں کہا کہ 'بیٹا دل لگا کر ریاض کرو اللہ تم کو بہت کامیابی دے گا۔'

(کامران شاہد (پاکستان) کے ذریعے لتا منگیشکر کا انٹرویو، عید کے خصوصی موقع پر، 2018، یوٹیوب)

اردو زبان وادب کے حوالے سے لتا منگیشکر نے ایک اور اہم بات کہی کہ جس زمانے میں انھوں نے اپنا فلمی سفر شروع کیا اس زمانے میں ہر ایک میوزک ڈائریکٹر کا اپنا ایک الگ اسٹائل ہوا کرتا تھا اور گیت یا نغمے بھی بہت اچھے انداز میں لکھے ہوئے آتے تھے۔ اب اتنا ان سب باتوں پر توجہ نہیں دی جاتی ہے اور یہ بدذوقی اور بھدا پن فقط میوزک میں ہی نہیں ہے بلکہ گانوں اور ان کی زبان میں بھی نظر آتا ہے۔ اس وقت شنکر جے کشن، خیام، نوشاد، مدن موہن وغیرہ تھے جن کا طرز ہی نرالا تھا اور سب کی موسیقی کی بنیاد میں کلاسیکی سنگیت ہوا کرتی تھی۔ اب وقت اور حالات بدلنے کے ساتھ ساتھ دوسروں کی نقل یا غیروں کی کاپی خوب رائج ہے۔ لوگ موسیقی یا گیت سنگیت پر اتنی محنت مشقت نہیں کرتے ہیں جتنا پہلے کے زمانے میں کیا کرتے تھے۔ تکنیکی اعتبار سے اب نئے نئے ساؤنڈ، ساز، وائلن، پیانو جیسے ساز آگئے ہیں۔ جہاں پتلی آواز کو موٹا اور موٹی آواز کو پتلی کرنے کی بہت سی تکنیک ہے۔ آج کل کے نغموں میں گانے والے کی آواز کی بہت زیادہ ضرورت نہیں ہے بلکہ سارا انحصار موسیقی پر ہے۔ جس قسم کی آواز اور ساز کی ضرورت ہے کمپیوٹر کی مدد سے وہ ایفیکٹ پیدا کیا جا سکتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ نئے زمانے کا سنگیت بھی خاصا شور مچانے والا ہے جس کو سن کر نوجوان لوگ موج مستی میں جھوم اٹھیں، تھرک جائیں۔ پہلے ایسا نہیں تھا ایک تبدیلی یہ بھی دیکھنے میں آئی کہ پہلے گانے والے کی آواز پیش منظر میں رہتی تھی اور موسیقی و دیگر ساز کی آواز پس منظر میں ہوتی تھی لیکن آج کل معاملہ اس کے برعکس ہے یعنی موسیقی اور سازوں کی آواز پیش منظر میں اور گانے والے کی آواز پس منظر میں چلی گئی ہے۔ اس تعلق سے لتا منگیشکر یہ مانتی تھیں کہ ہم اتنے زیادہ کاروباری ہو گئے کہ ہم نے ان کی پسند

بدل ڈالی ہے یا خراب کی ہے۔

ادیب یا فن کار کا سروکار فقط پیسہ ہی کمانا نہیں ہوتا بلکہ وہ سماج اور معاشرے کی مثبت تعمیر کا خواب بھی دیکھتا ہے۔ اس لیے اسے صارف یا تاجر پیشہ دنیا سے نبرد آزما بھی ہونا پڑتا ہے۔ اس مقام پر ایک بات یہ بھی ذہن نشین کرا دی جائے کہ جس طرح ایک زمانے میں فلمی نغموں کی دنیا میں ساحر لدھیانوی کا سکہ چلتا تھا اس وقت بھی فلمی پردے پر نغمہ نگار کا نام نہیں جاتا تھا۔ ساحر نے اس کے لیے باقاعدہ لڑائی لڑی اور ایک فلم میں اس شرط پر ہی نغمہ نگاری کی کہ پردے پر نغمہ نگار کے بطور ان کا بھی نام جائے گا تب انھوں نے اس فلم میں گانا لکھا۔ اسی طرح لتا منگیشکر نے بھی پلے بیک سنگر کے بطور پردے پر نام دیے جانے کے لیے ایک لمبی لڑائی لڑی تب کہیں جا کر فلم کے پروڈیوسر اس بات پر راضی ہوئے کہ پلے بیک سنگر کا نام بھی پردے پر جائے گا۔ فلم 'محل' کو یاد کرتے ہوئے ایک مقام پر انھوں نے بتایا کہ جس وقت یہ فلم ریلیز ہوئی اور اس کے گانے مقبول ہوئے تو ریڈیو پر جب اس کے نغمے سنے گئے تو سامعین نے گانے والے کی چھان بین کرنا شروع کی۔ لتاجی نے بتایا کہ اس وقت گانے کی فرمائش پر ہزاروں خطوط لکھے گئے اور یہ بھی سوال کیا گیا کہ اس کا پلے بیک سنگر کون ہے؟ اس وقت ریڈیو والوں نے ایچ ایم وی (HMV) کے دفتر فون کر کے پوچھا کہ 'محل' فلم کا سنگر کون ہے تو وہاں سے جواب ملا لتا منگیشکر۔ 'محل' فلم کی کاسٹنگ میں پلے بیک سنگر کی جگہ کامنی آتا ہے اور فلم کی ہیروئن کا نام بھی کامنی (مدھوبالا) ہے اس لیے یہی نام دے دیا گیا۔ اس کے لیے لتا جیسے فن کاروں نے بڑی جد وجہد کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس وقت فلم 'برسات' آئی تو اس میں پردے پر باقاعدہ پلے بیک سنگر کے بطور گانے والوں کا نام بھی نظر آنے لگا۔ ورنہ اس سے قبل سنگر کی کوئی اہمیت ہی نہیں تھی یعنی کہ گانا گایا اور اس کے عوض پروڈیوسر نے نذرانہ دیے اور کام ختم۔ فلمی گانوں کے ریکارڈ کی رائلٹی کو لے کر بھی لتا منگیشکر نے ایک لمبی جد و جہد کی ہے تب کہیں جا کر ان کو بازار میں فروخت ہونے والے میوزک میں کچھ حصہ پلے بیک سنگرز کو دیا جانے لگا۔ ہندوستانی سنیما کے شو مین کہلانے والے راج کپور سے ان کی لڑائی اسی مسئلے پر ہوئی تھی اور یہ کافی لمبی چلی۔ لتا منگیشکر نے ان کی فلموں میں گانا گانے سے منع کر دیا اور راج کپور نے بھی میوزک کاروبار میں رائلٹی دینے سے منع کر دیا اور کہا کہ ہم انڈسٹری میں کاروبار کرنے آئے ہیں تو لتا منگیشکر نے بھی جواباً کہا کہ تو ہم لوگ دوسرا کام کرنے آئے ہیں۔ آخر کار جب لتا کا کوئی دوسرا متبادل نہیں ملا تو تھک ہار کر وہ لتا کے پاس آئے اور شرطیں بھی مان گئے۔ اس طرح پلے بیک سنگر کو رائلٹی بھی ملنا شروع ہوگئی۔

لتا منگیشکر کے متعلق ایک بات اور کہی جاتی ہے کہ ان کی آواز ہر ایک سچویشن پر بہت موزوں یا فٹ بیٹھ جاتی تھی خواہ وہ پہاڑوں، جھرنوں جھیلوں، باغوں یا میلوں ٹھیلوں کے مناظر ہوں یا کسی اور مقام کے ہر ایک جگہ اور ہر ایک اداکارہ پر لتا کی آواز جچ جاتی تھی اب اداکارہ مدھوبالا، مینا کماری ہو یا دور حاضر کی کرینہ کپور۔ ماہرین تو یہاں تک کہتے ہیں کہ جس بھی لوکیشن پر ان کا گانا ریکارڈ کیا گیا اس لوکیشن سے ان کی آواز ہم آہنگ ہوگئی یعنی اگر لوکیشن پہاڑوں کی ہے اور ہیروئن پہاڑوں کی وادیوں میں ہے تو ان کی آواز پہاڑوں سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ اگر نغمہ نگار نے موسم کی بات کی ہے تو ان کی آواز سے موسم کے مزاج کا پتہ چل جاتا تھا۔ کبھی ایسا محسوس ہی نہیں ہوا کہ یہ ہیروئن نہیں بلکہ کوئی پلے بیک سنگر نغمہ سرا ہے۔ سنیما کے شروعاتی دنوں سے لے کر اب تک میوزک کے علاقے میں بھی بڑا انقلاب آیا بڑی تبدیلیاں آئیں مگر ان سب کے درمیان صرف ایک شے مسلسل بنی رہی اور وہ لتا منگیشکر کی آواز تھی۔ اس بات کے متعلق ان کا کہنا تھا کہ جیسے جیسے میوزک یعنی موسیقی میں تبدیلیاں ہوتی رہیں میں نے اپنی آواز اور لہجے کو بھی انھیں کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی۔ اس کے علاوہ میوزک کی تعلیم اور اس کی باریکیاں سمجھنے میں اور اسے اپنے فن میں اتارنے میں سہگل صاحب اور ملکہ ترنم نور جہاں کا وہ نام لیتی ہیں۔ ان کا موسیقی کے متعلق یہ بھی کہنا ہے کہ ہر وہ شخص جس سے میں نے ذرہ برابر بھی اگر کچھ سیکھا ہے تو وہ میرے لیے محترم، لائق احترام اور استاد کا درجہ اور مرتبہ رکھتا ہے۔

سُروں کی ملکہ کی زندگی بڑی ہی صاف، شفاف، شائستہ اور مہذب رہی ہے۔ طبیعت اور مزاج میں بلا کی سادگی، معصومیت، خودداری اور ایمانداری تھی۔ اپنے پیشے میں انھوں نے ایک اصول بنا رکھا تھا کہ وہ ہمیشہ بھونڈے، فحش اور غیر مہذب قسم کے گانوں کو (جنھیں وہ سوقیانہ کہتی ہیں) گانے سے صاف منع کر دیتی تھیں۔ یہ والدین اور استادوں کی تربیت اور تہذیب کا اثر تھا جو ان کو ورثے میں ملا تھا جس کو فلم انڈسٹری کی چکاچوندھ بھری زندگی میں فراموش نہیں کیا بلکہ ان اقدار کو تاعمر گلے سے لگا کر رکھا۔ کامیابی کی اتنی بلندیوں پر پہنچ کر انھوں نے بھی خود کو عظیم یا آفاقی بتانے کی کوشش نہیں کی بلکہ اپنی کامیابی میں والدین سے لے کر بڑے ولایت خاں اور بڑے غلام علی خاں وغیرہ کو اپنی تمام تر کامرانیوں کا ضامن بتانا ہی ان کی عاجزی اور انکساری کی دلیل ہے۔ ٹی وی اخبارات، رسائل اور میگزین کی زینت بننا ان کو قطعی پسند نہیں تھا۔ وہ عظیم فن کارہ ہوتے ہوئے بھی بڑی بڑی فلمی پارٹیوں، تقریبوں، جلسوں اور نمائش گاہوں میں بہت کم جاتی تھیں۔ بار بار ٹی وی اور کیمرے کے سامنے آنا، بات چیت کرنا اور موج مستی جیسے مشاغل سے وہ بہت دور رہتی تھیں۔ اس کا لوگ غلط مطلب نکالتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ لتا شہرت اور مقبولیت کے سبب بہت مغرور ہیں اس لیے لتا منگیشکر کو بھکتی اور روحانی چیزوں میں بڑا سکون ملتا ہے۔ میرا کے بھجن، بھگوت گیتا وغیرہ سننے سے بڑی توانائی ملتی ہے۔ بھجن اور کلاسیکل سنگیت ان کا پسندیدہ علاقہ ہے جس کے تحت وہ پنڈت روی شنکر، بڑے ولایت خاں، بڑے غلام علی خاں، پنڈت جسراج اور بھیم سین جوشی وغیرہ کو خوب سنتی ہیں۔

قوالی کے شہنشاہ نصرت فتح علی خاں کے بھانجے اور خاں صاحب کی موسیقی کی وراثت کو آگے لے جانے والے راحت فتح علی خاں نے لتا منگیشکر کے انتقال پر بڑی ہی جذباتی اور حساس بات کہی۔ ان کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ:

''گزشتہ چوبیس سالوں سے وہ گا نہیں رہی تھیں لیکن فن موسیقی پر ان کا سایہ تھا جیسے ایک ماں کا بچوں پر سایہ ہوتا ہے اسی طرح سنگیت کے تمام سُر ان کی چھاؤں میں رہتے تھے۔ آنے والی نسل کی بھی وہ سنگر رہیں گی مگر ان کی بدقسمتی یہ ہوگی کہ وہ ان ریکارڈیڈ دیکھیں گی۔''

جب کوئی فن کار عظمت اور مقبولیت کی بلندیوں کو چھو لیتا ہے تو وہ کسی ملک اور قوم تک محدود نہیں رہتا بلکہ اس کا فن جغرافیائی، نسلی، ذاتی اور بین الاقوامی دائروں سے بھی بالاتر ہو جاتا ہے اسے عالمی ورثہ تصور کیا جانے لگتا ہے لتا جی کی گائیکی عالم انسانیت کی میراث بن چکی ہے۔ ان کے متعلق جاوید اختر نے انٹرویو میں کہا کہ اس دنیا میں ایک سورج، ایک چاند اور ایک لتا ہے۔ اپنے انٹرویو میں کامران شاہد نے کہا تھا کہ میں یہ بات بڑی ذمہ داری سے کہہ رہا ہوں کہ پاکستان میں لتا منگیشکر کے نغموں کے ریکارڈ جتنا فروخت ہوئے اتنا یہاں کے مقامی فن کاروں کے ریکارڈ نہیں فروخت ہوئے یہ بھی اپنے آپ میں ایک اعزاز ہے۔

■

Dr. Muntazir Qaimi
Dept of Urdu, FAA Govt. PG College
Mahmudabad (Awadh)
Sitapur (UP)
Mob.:08127934734

پرارتھنا سنگھ

لتا منگیشکر

ایک افسانوی حقیقت

> لتا کی آواز کا جادو اس حد تک سر چڑھ کر بولا کہ شاہ رخ خان جیسے سپر اسٹار نے بھی یہ حسرت ظاہر کی کہ کاش میرا بھی ایک گیت لتا جی کی آواز میں ہوتا......

ہندوستانی روایت میں موسیقی کو برہمانند سہودر (برہمانند کی ہمشیرہ) کا مرتبہ عطا کیا گیا ہے۔ یعنی موسیقی سے اس عنصر کو حاصل کیا جاسکتا ہے جس کے ذریعے عشق مجازی سے عشق حقیقی کی جانب گامزن ہوسکتے ہیں۔ روح کی اندرونی لہروں کا یہ زیروبم جس قدر موسیقی سے ممکن ہے اتنا فوک میوزک سے بھی ممکن ہے۔ ہندوستانی سنیما نے فوک میوزک کو گھر گھر پہنچانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ جس کو سنگیت کے سُر، لے، تال، راگ وغیرہ کی سمجھ نہیں تھی وہ بھی اپنے من کی ہلچل، جذبے اور احساس کو موسیقی سے ہم آہنگ کر لے گیا۔ ہندوستانی فلمی موسیقی کو عوام سے جوڑنے کا سہرا لتا منگیشکر کو جاتا ہے۔ وہ آج ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن وہ اپنے جیتے جی ایک افسانوی حقیقت بن چکی تھیں۔ اپنی نغمگی سے انھوں نے ایک دو نسل نہیں بلکہ پانچ پانچ نسلوں کو مسحور ومحظوظ کیا ہے۔ سنگیت کے تئیں لوگوں میں دیوانگی جگانے، دلچسپی ابھارنے، سریلاپن کے علاوہ لے اور تال کی سمجھ کو لوگوں میں عام کرنے میں لتا منگیشکر نے بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ ان سب کے پس پردہ لتا جی کی آواز کا سحر ہے۔ 'نام گُم جائے گا.....'، 'چہرہ یہ بدل جائے گا.....'، 'میری آواز ہی میری پہچان ہے.....'، 'گر یاد رہے.....' جیسے دل میں اتر جانے والے لازوال نغمے عوام الناس میں لتا کی مخملی آواز کو ایک پہچان دے گئے اور لوگ بول اٹھے کہ ہمارے پاس ایک سورج ایک چاند اور ایک لتا ہے'۔ یا ہمارے پاس تاج محل اور لتا منگیشکر جیسی وراثت ہے۔ لتا کی آواز کا جادو اس حد تک سر چڑھ کر بولا کہ شاہ رخ خان جیسے سپر اسٹار نے بھی یہ حسرت ظاہر کی کہ کاش میرا بھی ایک گیت لتا جی کی آواز میں ہوتا.....

یوں ہی کوئی لتا منگیشکر نہیں بنتا۔ لتا بننے کے لیے مسلسل زندگی کی جدوجہد سے دوچار ہونا پڑتا ہے جس میں ریاض، مشق، یکسوئی اور اپنے ہدف کے تئیں لگن بے حد ضروری ہے۔ لتا نے ایک رزمیہ زندگی گزاری ہے جس میں نہ صرف یہ کہ روزانہ کی مشکلیں شامل تھیں بلکہ ناخدا بن کر اپنے کنبے کی کشتی کو بھی حالات وحادثات سے محفوظ رکھتے ہوئے ایک تابندہ ساحل تک پہنچایا۔ ہندوستانی سنگیت کو نئی سمت عطا کرنے والی سُروں کی ملکہ اندور میں 28 ستمبر 1929 کو دینا ناتھ منگیشکر اور شیوتی منگیشکر کے یہاں جنمی۔ والد خود بھی ایک پلے بیک سنگر اور ڈرامہ اداکار تھے۔ محض پانچ برس کی عمر سے ہی لتا کی سرگم کی تعلیم شروع ہوئی اور نو برس کی عمر میں ہی انھوں نے اپنا پہلا اسٹیج شو کیا لیکن لتا کو ابھی سونے کی طرح تپ کر اور کھر اہونا تھا۔ دینا ناتھ کی بے وقت موت نے محض تیرہ برس کی لتا کے کندھوں پر ان کی خالہ سمیت پورے کنبے کی ذمے داری ڈال دی۔ وہ اپنے کنبے میں اولادِ اول تھیں۔ ساٹھ روپے ماہانہ پر لتا نے ماسٹر وناٹک کی 'پرفل پکچرز' میں نوکری کی جس کے تحت انھوں نے 'راجا بھاؤ'، 'پہلی منگل گور' اور 'چمک سنسار' جیسی فلموں میں چھوٹا موٹا رول ادا کیا۔ لیکن لتا کا جنم اداکارہ بننے کے لیے نہیں ہوا تھا اور اس نے اپنے ہدف کو کبھی اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیا تھا۔ 52-1944 میں لتا جس وقت ممبئی آئیں تو ناناچوک پر دو کمرے کا مکان کرائے پر لیا۔ سامنے ہی مہادیو کا مندر تھا جس سے متصل ایک چوپال تھا جہاں وہ گھنٹوں بیٹھ کر کوئی بھجن گنگناتی رہتی تھیں۔ دوپہر یا شام کے وقت جب پجاری اپنی کہانی سناتے اس وقت بھی وہ اونچے سروں میں ریاض کرتی رہتی تھیں۔ شاید بھگوان کا آشیرواد ان کی معنوی دختر پر ثمر آور ہوا۔ ملک وبیرون ملک بھی مندروں اور شیوالوں میں نئے بھکتی گیت کے روپ میں سنگیت ارچنا (ریاضت) ریکارڈنگ کے روپ میں خوب مقبول ہوئی۔ یہ لتا کا آغاز تھا اور سمت کا تعین ہوگیا تھا لیکن ابھی تو پورا سفر باقی تھا۔

فلمی دنیا میں لتا کے گاڈ فادر موسیقار ماسٹر غلام حیدر تھے جنھوں نے ششی دھر مکھر جی سے سفارش کی (جاگرتی، ایک مسافر ایک حسینہ، لیڈر) لیکن لتا کی آواز پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا کہ آواز بہت پتلی ہے اور میری ہیروئن کو جچ نہیں رہی ہے۔ دراصل ابھی پلے بیک سنگنگ کی روایت کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ ہیرو ہیروئن اپنا گانا خود ہی گاتے تھے۔ راگ راگنیاں اصلی روپ میں ملتی تھیں اور انھیں بنا چھیڑے اسی مخملی انداز میں پیش کیا جاتا تھا۔ مغنیہ اپنی ناک کی آواز سے مردانہ طرز میں ہی گاتی تھی۔ اس زمانے کی نغمہ گویوں میں کانن دیوی، امیر بائی کرناٹکی، زہرہ بائی، امبالہ دیوی، ثریا، نور جہاں اور شمشاد بیگم جیسی ہستیاں شامل ہیں۔

محنت کش لتا کے لیے قسمت نے شاید کوئی اور ہی مقام طے کر رکھا تھا۔ تاریخی اور سیاسی منظر نامے نے جب کروٹ بدلی تو اس تبدیلی نے نہ صرف یہ کہ ہندی فلمی موسیقی کی سمت و رفتار طے کردی بلکہ ایک نئی اور آزادانہ موسیقی رچنے کا راستہ ہموار کر دیا۔ 1947 میں ہندوستان کی آزادی کا نشاۃ الثانیہ کا عہد شروع ہو چکا تھا جس کے ایک خوشگوار حادثے کے روپ میں لتا منگیشکر کی آمد تھی۔ اسی سال ملکۂ ترنم نور جہاں تقسیم کے بعد پاکستان چلی گئیں۔ 1948 میں استاد غلام حیدر نے 'بے درد تیرے درد کو سینے سے لگا کے ...' (پدمنی) ایک رات پاکستان روانہ ہوگئے۔ یہ ان کا ہندوستان میں لتا کے ساتھ آخری گانا تھا۔ جانے انجانے میں حالات نے ایک نئے ماحول کو رچ دیا جس کی اہم وجہ لتا بنیں۔ محض اتفاق ہی سہی لیکن لتا منگیشکر ہی آزادی کے بعد اس تبدیلی کو اپنی آواز کے ذریعے پیش کرنے کے قابل رہیں۔ آواز کا نیا پن، سُریلا پن اور نئی توانائی کی ہندوستان کو بے حد ضرورت تھی جس کا گواہ موسیقار استاد غلام حیدر کی ہدایت میں مکیش کے ذریعے گایا گیا وہ نغمہ ہے جس کے بول کچھ یوں تھے:

اب ڈرنے کی بات نہیں انگریز چھورا چلا گیا
وہ گورا گورا چلا گیا

اس نغمے نے لتا کے اندر چھپی ہوئی صلاحیت کو ابھار دیا اور ان کو کھیم چندر پرکاش، انل وسواس اور نوشاد جیسے موسیقاروں کی سنگت نصیب ہوئی۔ 1949 تک 'محل'، 'بڑی بہن'، 'لاڈلی'، 'انداز' اور 'برسات' ان کے حصے میں آگئی جن میں محل کا نغمہ 'آئے گا آئے گا.....' آنے والا پہلا سپر ہٹ نغمہ بنا اور برسات نے تو یہ طے کر دیا کہ آنے والا کل لتا کا ہی ہے۔ کامیابی کا لطف اٹھانے کے بعد بھی لتا نے اپنا ریاض برقرار رکھا۔ انھوں نے یہ تسلیم کیا کہ ان کی آوز کے سریلے پن میں پچھتر فی صد سحر خدا کی دین ہے اور باقی مشق اور ریاض۔ سُریلی لتا کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش تھی کہ استاد بڑے غلام علی خاں کی طرح گاؤں لیکن قدرت کا کرشمہ دیکھیے کہ اسی استاد نے لتا کو یہ کہہ کر مقبول کر دیا کہ 'کم بخت کبھی بے سُری نہیں ہوتی'۔ استاد بڑے غلام علی خاں کے متعلق ایک قصہ مشہور ہے کہ ایک دفعہ وہ ایک کنسرٹ میں راگ یمن گانے والے تھے کہ صبح کے ریاض میں خلل پڑ گیا۔ پاس کے فلیٹ میں ریڈیو پر لتا کا گانا 'جارے بدرا، بیرا، جارے جارے' چل رہا تھا۔ استاد نغمے میں ایسا ڈوبے کہ پھر نہ راگ یمن سادھ سکے اور نہ ہی شام کو راگ یمن گا سکے۔ یہ کسی نغمہ گو کا نقطۂ عروج ہے کہ کوئی استاد خود کو بھلا بیٹھے۔ لتا کی ٹھمریوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ بڑے غلام علی خاں کو انھوں نے کیسے اپنایا۔ فلمی سنگیت کے تئیں عوام میں دیوانگی کو دیکھتے ہوئے 1958 میں پلے بیک سنگنگ میں بھی فلم فیئر ایوارڈ کی شروعات ہوئی اور لتا کو اس زمرے کا پہلا اعزاز فلم 'مدھومتی' میں گانے کے لیے دیا گیا جس کے بول 'آجا رے پردیسی....' تھے۔ اس زمرے میں جو اعزازات کا سلسلہ شروع ہوا تو 1970 کے بعد انھوں نے فلم فیئر اعزاز کے لیے منع کر دیا اور کہا کہ اب یہ انعام نئے لوگوں کو دیا جانا چاہیے۔ دو درجن سے زیادہ زبانوں میں ہزاروں نغمے گانے والی لتا نے جس زبان میں نغمہ سرائی کی اس زبان کا لہجہ، انداز اور تلفظ اپنے اندر بسا لیا اور سننے والے یہ بول اٹھے کہ لتا تو ہماری زبان کی نغمہ گو ہے۔

لتا منگیشکر نے اردو زبان مولوی محبوب سے اور ہندی زبان ماسٹر لیکھ راج شرما سے سیکھا جنھوں نے لتا کو منشی پریم چند کی کتابیں دیں اور بنگلہ زبان کے ادیب شرت چند کی ہندی ترجمہ والی کتابیں بھی دیں۔ لتا نے ہندی زبان کی جو پہلی کتاب پڑھی وہ منشی پریم چند کی 'نرملا' تھی۔ لیکھ راج انھیں کتاب پڑھ کر لکھنے کو دیتے کہ کون سا کردار کیسا ہے۔ میوزک ڈائریکٹر انل وشواس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ ہندی فلم کی موسیقی میں آرکیسٹرا اور کورس کو متعارف کرانے کا سہرا انھیں کے سر جاتا ہے انھوں نے لتا کو گانے میں سانس لینے اور چھوڑنے کی باریکی سمجھائی تا کہ سانس کی آواز مائک پر نہ جا سکے اور سننے والا محسوس بھی نہ کر پائے کہ گانے والا کب سانس لے رہا ہے اور کب چھوڑ رہا ہے۔ 'آج اچانک ٹوٹ گئے کیوں من وینا کے تار' میں لتا کی آواز میں اتار چڑھاؤ پر حیرت انگیز قابو دکھائی دیتا ہے۔ مشہور موسیقار نوشاد نے ان سے کہا کہ گانا تم خود لکھو پھر پڑھوا کر وہ سنتے تھے اور تلفظ کی باریکیاں اور سُر کے اتار چڑھاؤ میں تال میل بٹھاتے تھے۔ استاد غلام حیدر تو ان کے استاد ہی ٹھہرے وہ لتا کو ہر قدم پر یہ سمجھاتے تھے کہ تم جو گانا گا رہی ہو وہ کس کے لیے ہے۔ موقعہ محل اور کردار کو سمجھو اور اس میں کھو کر گاؤ کیونکہ احساس کے جذبے کا کوئی مقابلہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح غلام حیدر نے یہ بھی بتایا کہ جہاں سم (تال کا پہلا تھاپ) آتا ہے وہاں زور دینا ہے تا کہ گانا اٹھ سکے۔ انھیں چھوٹی موٹی ہدایتوں کو دھیان میں رکھ کر لتا نے اتنا حساس گانا گایا کہ اداکارہ ظنی جیونت نے ایک دفعہ کہا کہ جب گائیکی میں لتا ہوں تو اداکاری کی کوشش نہیں کرنا پڑتی بس گانے کے بول گنگنا دیجیے اس کا مطلب خود بخود ابھر آئے گا۔ اسی ضمن میں ایک واقعہ اور ملتا ہے جس میں گوڑ سارنگ پر رچے گیت 'اللہ تیرو نام' (ہم دونوں 1961) سے جیسے عقیدت کا جذبہ پھوٹ پڑتا ہے۔ یہ گیت ہندوستان کی جمہوریت اور آپسی میل جول کا میزان بن چکا ہے۔ پنڈت جسراج بھی یہ قبول کر چکے ہیں کہ اس بھجن کو سن کر وہ آدھی رات میں نیند سے جاگ اٹھے اور فرط جذبات میں ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔

چترپٹ سنگیت کی زبردست مقبولیت کا سہرا کمار گندھرو لتا کے سر باندھتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ اگر عام سامع کو لتا کا لہجہ سنایا جائے اور پلے بیک سنگنگ کو سنایا جائے تو سننے والا لتا کا لہجہ ہی پسند کرے گا۔ عام سامع تو پلے بیک سنگنگ کے اصول وضوابط سے واقف نہیں ہے اس لیے وہ اس کی گہرائیوں تک نہیں پہنچ سکتا مگر لتا کی گائکی میں وہ تمام عنصر موجود ہیں جو سامع کو مسحور و محظوظ کر دیں۔ لتا کا لہجہ بڑا ہی پاک، صاف، شگفتہ، مخملی اور ریشمی ہے۔ لتا کی زندگی میں جو سادگی، سچائی اور ایمانداری ہے وہی ان کے گیتوں میں بھی جھلکتی ہے۔ انڈسٹری میں یہ بات بھی مشہور تھی کہ

محنت کش لتا کے لیے قسمت نے شاید کوئی اور ھی مقام طے کر رکھا تھا۔ تاریخی اور سیاسی منظر نامے نے جب کروٹ بدلی تو اس تبدیلی نے نہ صرف یہ کہ ھندی فلمی موسیقی کی سمت و رفتار طے کردی بلکہ ایک نئی اور آزادانہ موسیقی رچنے کا راستہ ھموار کر دیا۔

گانے کے بول اگر فحش یا غیر اخلاقی ہیں تو لتا اسے گانے سے منع کر دیتی تھیں۔ اس بابت لتا کا کہنا ہے کہ ان کا ضمیر ہی آمادہ نہیں ہوتا ہے۔ ایک واقعہ فلم گھر کے متعلق مشہور ہے جس میں ایک گیت کے بول 'آپ کی آنکھوں میں کچھ مہکے ہوئے سے راز ہیں....' کا دوسرا مصرعہ 'آپ کی بدمعاشیوں کے یہ نئے انداز ہیں...' میں یہ پریشانی آئی کہ لتا جی کیسے کہیں تو آر ڈی برمن نے کہا کہ گا نا دے دو جب اعتراض کریں گے تو تبدیل کر دیں گے۔ لیکن ہم نے یہ دیکھا کہ بہت ہی کھنکتی ہوئی آواز میں لتا جی ہنستے ہوئے اسے گاتی ہیں۔ مشہور ہدایت کار راج کپور کو فلم 'سنگم' (1964) کے گیت میں 'میں کیا کروں رام مجھے بڈ ھا مل گیا....' کے لیے یہ یقین دلانا پڑا کہ وہ اسے بے حد رومانی انداز میں فلمائیں گے۔

لتا کے گیتوں میں دو لفظوں کے درمیان امتیاز کو سُروں کے الاپ سے بڑی ہی خوبصورتی سے بھرا جاتا تھا جیسے دونوں ہی لفظ ایک دوسرے میں گھل مل جاتے ہوں۔ سنگیت کی زبان میں اسے 'نادے اُچار' کہا جاتا ہے۔ لتا میں موسیقی کے فطری ہنر کی وجہ سے یہ از خود ہی لہجے میں آگیا جو استادوں کو بھی بڑی مشقت سے ہاتھ آتا ہے۔ فلم 'بے مثال' کے گیت دیکھیں تو یہ کیفیت نظر آتی ہے۔ ایسے نہ جانے کتنے فضاؤں میں گھول دیے گئے ہیں۔

اے ری پون، ڈھونڈے کسے تیرا من چلتے چلتے
باوری سی تو پھرے، کون ہے تیرا سجن

کمار گندھرو مانتے ہیں کہ لتا نے بھی سُر (لے تین طرح ہیں دھیمی لے، وسطی لے اور اونچی لے) کو بہت ہنر مندی سے گایا ہے۔ خواہ وہ 'لگ جا گلے کہ پھر یہ حسیں رات ہو نہ ہو....' (وہ کون تھی) یا پھر سلسلہ فلم کا یہ گیت 'یہ کہاں آگئے ہم یوں ہی ساتھ ساتھ چلتے .... تیری باہوں میں ہیں جانم میرے جسم و جاں پگھلتے...' جیسے گیت کو جتنی دلکشی سے لتا نے گایا ہے اتنے ہی کلاسکی رچاؤ سے ریکھا اور امیتابھ نے اداکاری بھی کی ہے۔

کمار گندھرو کہتے ہیں کہ لتا نے کرون رس (رس کی نو قسموں میں سے ایک) کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔ 'اے میرے وطن کے لوگو ذرا آنکھ میں بھر لو پانی....' پر پنڈت نہرو کا رو دینا ایک تاریخ بن چکا ہے۔ اس کے علاوہ نہ جانے کتنے ایسے گیت ہیں جو نوجوانوں کے شکستہ دلوں کو قرار بخشتے ہیں جیسے کہ 'دل ہم ہم کرے....' (لیکن) یا 'بابل مورا نیہر چھوٹا جائے ...' (نیہر چھوٹل جائے، 1964) میں راگ بھیروی کے استعمال نے اس گانے کو امر بنا دیا۔ 'ہم تھے جن کے سہارے....' 'تیرے بنا زندگی سے کوئی شکوہ تو نہیں ...' 'عجیب داستاں ہے یہ ...' 'رینا بیت جائے ....' جیسے لاتعداد نغمے جو مستقل دو تین نسلوں کے نوجوانوں کے جذبات کو ظاہر کرتے ہیں۔ کمار گندھرو کہتے ہیں کہ 'لتا کا تین منٹ کا سُر تین گھنٹوں کی محفل کے برابر محظوظ کیا جا سکتا ہے'۔ اس کا ایک ایک گیت ایک مکمل فن ہے۔ سر لے اور تال کی گنگا جمنا سرسوتی جیسا سنگم ہوتا ہے اور محفل کی مدہوشی اسی میں سمائی رہتی ہے۔ 1950 سے 1970 تک کا دور ہندوستانی فلم سنگیت کے لیے بہترین دور رہا ہے۔ انل وشواش، شنکر جے کیشن، سچن دیو برمن، جسن لال، لچھمی کانت پیارے لال اور راہل دیو برمن جیسے نامی موسیقار اس وقت نئی نئی دھنوں کی سرگم بنا رہے تھے۔ اس دور کا ایک متفقہ سر لتا منگیشکر خود تھیں۔ کچھ فلمیں تو اپنے نغموں کے سبب بڑی ہی مقبول رہی۔ مغل اعظم کا نغمہ 'پیار کیا تو ڈرنا کیا' اپنے تیور، انداز اور باغیانہ لہجے کے سبب تو محاورہ ہی بن گیا۔ کسی نغمے کی اس سے زیادہ اور کیا مقبولیت ہو سکتی ہے اسی دور میں آئی فلم 'بیس سال بعد' کے لیے ہیمنت دا نے لتا جی کا تین ماہ تک انتظار کیا۔ پھر جو نغمہ آیا وہ دلوں پر چھا گیا....

کہیں دیپ جلے کہیں دل
ذرا دیکھ لے آکر پروانے.....

1970 کے بعد میں انھوں نے پاکیزہ، پریم پجاری، ابھیمان، ہنستے زخم، امر پریم، آندھی، موسم، کٹی پتنگ، ستیم شوم سندرم' جیسی سپر ہٹ فلموں کے گیت گائے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب اداکارہ سے کہیں زیادہ دلکش اور سحر آفریں نغمہ ہی لگتا تھا۔ 'ستیم شوم سندرم' میں تو آواز کا جادو ایک مدہوشی میں باندھ لیتا ہے۔ اسّی کی دہائی میں بھی سلسلہ، چاندنی، قرض، ایک دوجے کے لیے، نصیب، کرانتی، رام لکھن، اگر تم نہ ہوتے، معصوم، میں نے پیار کیا، بے تاب، لو اسٹوری، رام تیری گنگا میلی جیسی فلموں کے نغموں کا جادو عوام کے سر چڑھ کر بولا۔ نوے کی دہائی میں لتا جی نے گانا کم کر دیا لیکن ہر ایک مقبول اور ہٹ فلم میں لتا کی ہی آواز سنائی دیتی ہے۔ اس دور کی اہم فلموں میں 'ڈر، دل والے دلہنیاں لے جائیں گے، محبتیں، زبیدہ، 1942 اے لو اسٹوری، رنگ دے بسنتی وغیرہ۔ پرانی فلموں کی ہیروئن مدھوبالا سے لے کر نئی ہیروئن کرینہ کپور تک ہر دور کی سپر اسٹار فن کار کی آواز لتا منگیشکر ہی بنیں۔ پھر چاہے وہ ریکھا ہوں یا سری دیوی، مادھوری دیکشت، کاجول یا سوہا علی خان غرض کہ وہ ہر کسی کے لیے معقول رہیں۔

یہ آواز اور لہجے کی ایسی خوشبو ہے جسے کوئی جغرافیہ اپنی سرحدوں میں قید نہیں کر سکا۔ اس آواز کو سحر بھی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اس کے پیچھے موسیقی کی مسلسل ریاضت جھلکتی ہے لیکن یہ قدرتی عنایت فقط ریاض سے بھی نہیں آسکتی۔ لوگوں کے دلوں پر حکومت کرنے کا یہ سلسلہ تو زندگی کی جدو جہد سے ہی نکلتا ہے۔لتا کی پوری زندگی کی جدو جہد تو مسلسل تربیتوں، نصیحتوں، ریاضتوں، مشقوں، اصولوں اور ضوابط سے بندھی رہی۔

یہ آواز اور لہجے کی ایسی خوشبو ہے جسے کوئی جغرافیہ اپنی سرحدوں میں قید نہیں کر سکا۔ اس آواز کو سحر بھی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اس کے پیچھے موسیقی کی مسلسل ریاضت جھلکتی ہے لیکن یہ قدرتی عنایت فقط ریاض سے بھی نہیں آسکتی۔ لوگوں کے دلوں پر حکومت کرنے کا یہ سلسلہ تو زندگی کی جدو جہد سے ہی نکلتا ہے۔ لتا کی پوری زندگی کی جدو جہد تو مسلسل تربیتوں، نصیحتوں، ریاضتوں، مشقوں، اصولوں اور ضوابط سے بندھی رہی۔ ایسا نہیں ہے کہ لتا پر سوال نہیں اٹھائے گئے چاہے وہ لتا کی چھوٹی بہن آشا بھونسلے سے ان کا مقابلہ ہو یا پھر رائلٹی کا معاملہ۔ ان سب آزمائشوں اور سختیوں سے لتا کی شخصیت اور بھی نکھری ہے۔ ان کی شائستگی، ذمے داری، صبر و ضبط، حالات سے مقابلہ آرائی جیسی چیزیں ہی ان کو میل کا پتھر بناتی ہیں۔ وہ ہزاروں دلوں کی دھڑکن تھی۔ 6 فروری کو لتا منگیشکر اس دنیا سے رخصت ہو گئیں اور ان کی موت یوں ہی نہیں ہوئی تھی یہ دن سرسوتی سورجن کا دن تھا۔ ماں سرسوتی اور اپنی ورد پتری (معنوی دختر) کو خود لینے آئی تھیں۔ آج لتا منگیشکر جسمانی طور سے ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن وہ ہمارے تمام جذبات کو آواز دے چکی ہیں کہ 'تم مجھے یوں بھلا نہ پاؤ گے....'

حوالے

1 رام پنج، دھنوں کی یاترا، راج کمل پرکاشن، نئی دہلی، 2007
2 یتیندر مشرا، لتا: سُر گاتھا، وانی پرکاشن، نئی دہلی
3 لتا منگیشکر پر کمار گندھرو کا مضمون www.janadesh.in
4 https://hindi.ewbdunia.com/bollywood-focus/lata-mangeshkar
5 CNN-News-Lata mangeshkar Interview with javed Akhtar

■

Dr. Prathana Singh
Dept of History
FAA Govt PG College
Mahmudabad
Sitapur - (UP)

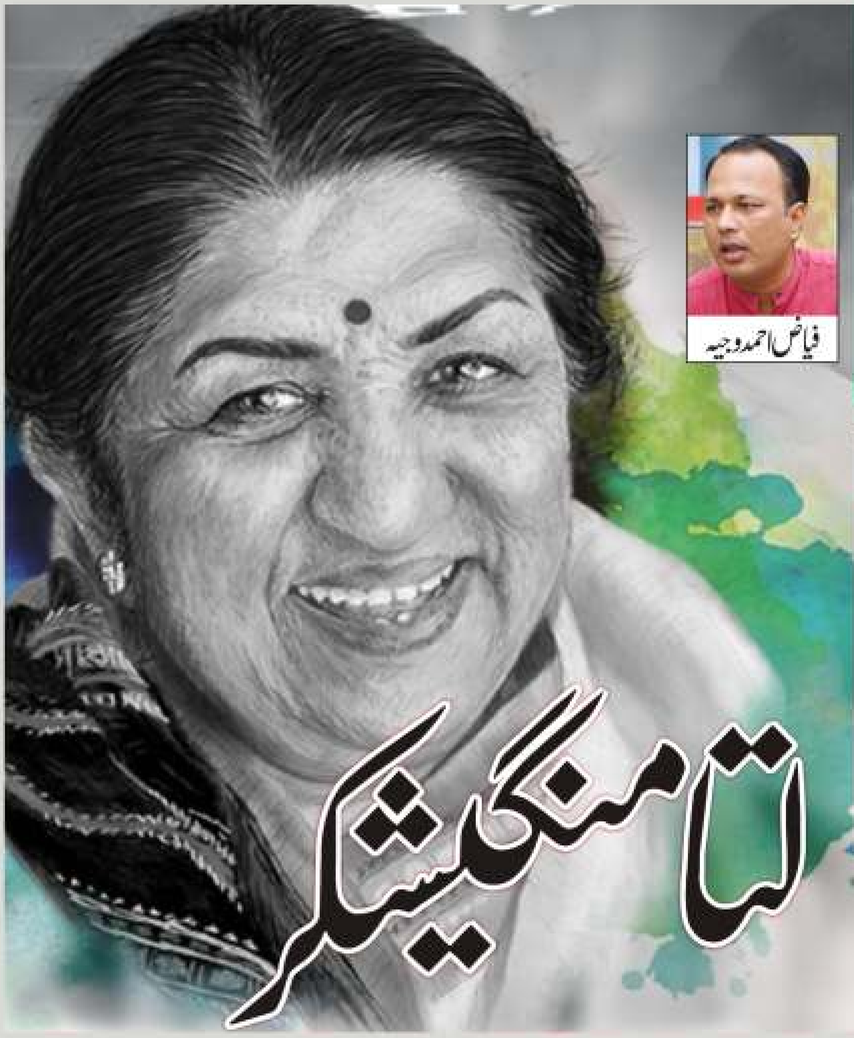

لتا منگیشکر

فیاض احمد وجیہ

'تمام فنون کا مرجع موسیقی ہے......'

یہ شوپن ہار کا قول ہے، جس کی تعبیر میں سراج منیر لکھ گئے کہ——

موسیقی دراصل کسی تہذیب کی روح کا ظہور ہوتی ہے۔

یہی موسیقی صوتی آہنگ کے دروبست میں لفظوں کے غنائی اور شعری آہنگ کو تحرک عطا کرتی ہے، اور یہی موسیقی کئی بار مجرد لفظوں کو تصورات کے پیرہن میں ڈھال دیتی ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ مجھ ایسے سادہ ذہن کو موسیقی کی مظہریات کا شعور بھی نہیں تو اس کی تہذیبی سرگزشت کا قصہ کیسے کہوں۔

ہاں، مگر موسیقی سے جو ہماری ذرا سی گفت وشنید ہے اور اگر اس کا کوئی اظہار ہے؛ جس کو ایک سمفنی کی طرح محسوس کرسکتا ہوں، جس کو جیون کی اُس ترنگ سے موسوم کرسکتا ہوں، جو کبھی آنکھوں میں شانت پڑی رہتی ہے اور کبھی جل ترنگ سی بجنے لگتی ہے اور من مردنگ کی ہر تھاپ کو بے خود کیے دیتی ہے، تو میرا یہ ٹوٹا پھوٹا تذکرہ اور اُسلوب بیان؛ موسیقی کی اُس تفریدی آواز کے ورد میں سعی مجہول سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس لیے غالب کا نوشتہ پڑھتا ہوں کہ

ڈھونڈے ہے اس مغنی آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوہ برق فنا مجھے

یہ 'مغنی آتش نفس'—— اور کوئی نہیں لتا منگیشکر تھیں......،

جن کی آواز ہماری صدی میں عجوبہ روزگار ہے اور جو شاید آنے والی صدیوں کی سماعتوں میں بھی رس گھولے اور اننت یگوں کی یادوں میں ہماری صدی کو پکارے......

بہرحال، ان کے سیاسی عقیدے سے کس روسیاہ کو غرض ہے، سو ہم بھی اس آواز کی پاکیزگی کے اسیر ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ نانی اماں اکثر ان کا گیت 'جیا بے قرار ہے......' اپنے مخصوص انداز میں گایا کرتی تھیں، اور ہم ہنسا کرتے تھے۔

ایسے ہی کسی لمحے میں لتا کی آواز شریک جاں بنی ہوگی کہ نانا جان کے ریڈیو اور نیپالی واک مین کی 'نروان یاترا' سے جانے کب انھوں نے موبائل گیلری میں دل ایسی جگہ بنائی، ان سب کا زائچہ مرتب کرنا فی الحال مشکل ہے۔ ہاں، کچھ خاص پہروں اور آوارہ راتوں کے سایے میں اس تشنہ کام محبت نے حدیث مسلسل کی طرح 'لگ جا گلے......' کولس پذیر صورتوں میں سنتے ہوئے بند آنکھوں کا لامتناہی سفر طے کیا ہے۔

دراصل یہ صرف گیت نہیں، ماضی کی پرچھائیاں ہیں...... اور شاید اس لیے اس کے مقناطیسی اثر میں اس کے گیت کار راجہ مہدی علی خان کا سارا نوشتہ پڑھنے کو مجبور ہوا تھا۔

اور ایسی ہی کسی ساعت میں ہم جنوں صفات چل پڑے اور اسالیب ادب میں جہاں بھی لتا جی کا تذکرہ نظر آیا، اس کو اپنی ڈائری میں حوالہ جات کی صورت محفوظ کرنے لگے۔ کئی بار جی میں آیا کہ ان حوالوں کو مضمون کی صورت باندھ دوں، مگر وہ جو کہتے ہیں کہ 'کچھ عشق کیا، کچھ کام کیا' والی کیفیت میں ہم نے 'دونوں کو ادھورا چھوڑ دیا'۔

ڈائری کے اُنھی بوسیدہ اوراق سے اس 'آواز' کی صورت گری کی سعی میں کسی حد تک جملہ اسالیب ادب کے حوالے کی تدوین کا خواہاں ہوں کہ شاید اس سے ادب کے ایک اور تہذیبی ظہور کی خبر ملے۔

لیکن اس جمع و ترتیب اور اس کی تصریحات سے پہلے نئی اشارتوں کے شاعر معید رشیدی کے وہ اشعار، جنھیں وہ ہمارے جے این یو کے دنوں میں لتا جی کی شان میں صد گونہ عقیدت کے ساتھ پڑھا کرتے تھے کہ؛

شہد میں گھلتی ہوئی صوت وصدا، جادو ہے
روح کا کوئی حوالہ کہ دعا، جادو ہے
نور ہے اس کے گلے میں کہ خدا کا جلوہ
دل نے آواز سنی بول پڑا، جادو ہے

ہاں، لتا جی کی آواز روح کا حوالہ ہے اور دعا بھی کہ ہم اسی نورانی ہالے میں سکون پاتے ہیں۔

میں آج بھی اس احساس سرشاری میں ہوں کہ ہم نے لتا کو صرف سنا اور محسوس نہیں کیا، بلکہ ان کی باتیں کی ہیں اور ان کی مدح میں شعر کہنے والے دوست کو جی بھر داد بھی دی ہے۔

خیر اب ان تہذیبی متون سے رجوع کرتا ہوں، جن میں لتا ہیں، ان کی آواز ہے اور اکثر یہی آواز کلچرل ڈسکورس کی صورت اختیار کرتے ہوئے ادب کا مجتہد اور تخلیقی اُسلوب بھی ہے۔

یہ دراصل وہی اُسلوب ہے جس کا ذکر خیر سعادت حسن منٹو نے نور جہاں جو ان کے لیے 'سرور جاں' بھی تھیں کی خاکہ نویسی میں یوں کیا ہے کہ؛

نور جہاں کی آواز میں اب وہ لوچ، وہ رس، وہ بچپنا، وہ معصومیت نہیں رہی، جو اس کے گلے کی امتیازی خصوصیت تھی۔ لیکن پھر بھی نور جہاں 'نور جہاں' ہے۔ گو لتا

منگیشکر کی آواز کا جادو آج کل ہر جگہ چل رہا ہے، اگر کبھی نور جہاں کی آواز فضا میں بلند ہو تو کان اس سے بے اعتنائی نہیں برت سکتے۔

شاید یہ تخلیقی ایمانداری ہو کہ ہر حال میں نور جہاں کا جاپ کرنے والے منٹو نے کئی معنوں میں تو آموز لتا کی آواز کو 'جادو' کہا تھا۔ دانش و حکمت کے داعی کہہ سکتے ہیں کہ منٹو کے کہے کو سند کیوں مانا جائے؟ منٹو سند بھلے نہ ہوں، لیکن مجھ ایسے نارسا کے لیے ان کا قول اس لیے بھی گراں مایہ ہے کہ نور جہاں کا خاکہ لکھتے ہوئے جہاں انھوں نے موسیقی کے باب میں اپنے علم و کمال کا اظہار یہ پیش کیا وہیں احمد ندیم قاسمی کو متعدد خطوط میں جس طرح سے فلم، موسیقی اور شاعری کے اسرار و رموز بتائے، وہ بہر طور اس قول کو ایک ماہر فن کا انتساب بناتے ہیں۔

اور یہی انتساب منٹو کے 'تین گولے' والے میراجی کے باب میں خان فضل الرحمٰن کے سوانحی ناول میں بھی در آیا ہے کہ انھوں نے میراجی کی شاہد بازیوں کی شرح میں تین دلی والیوں کا احوال واقعی لکھا ہے، اور انہی میں سے ایک کے گلے کی مٹھاس کو لتا کی آواز سے یوں تشبیہ دی، گویا 'دھرتی پوجا کی ایک مثال' کی صورت میراجی یہاں تہذیبی متون کا شخصی حوالہ بن گئے۔

چونکہ یہ مضمون بندی تقویم پارینہ کی دست نگر ہے، اس لیے ربط و ترتیب بھی اسی حیطۂ تحریر کی دیدہ و بینا ہے کہ یہاں انتظار حسین کے کالم 'لتا منگیشکر کی واپسی' کے مندرجات ہیں۔ یوں انتظار صاحب کی کتاب 'بوند بوند' میں اس نوشتے کو پڑھ رہا ہوں تو جنگ کی پابندیاں اور اس کے شور سلاسل میں لتا کی آواز کے معنی و مفہوم طلوع ہو رہے ہیں۔

دراصل وہ سنہ پینسٹھ کی ہند و پاک جنگ کے دوران عوام الناس کی التہابی کیفیت کو شدت سے محسوس کرتے ہیں اور لتا کی آواز سے سترہ اٹھارہ دنوں کی محرومی کو موسیقی کے تہذیبی ظہور میں کشید کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ جنگ کے اُن دنوں میں چائے کی دکانوں پر ریڈیو جالندھر سے فرمائشیں سننے والوں کی اسی بے چینی کو یہاں یاد کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

'وہ چھ ستمبر تھی، جب لتا منگیشکر نے ہم سے بے وفائی کی اور ہم نے اس کافر سے کنارہ کیا۔'

اور جیوں ہی یہ پہاڑ سے دن بیتے، اور ریڈیو جالندھر سے لتا کی راگ راگنیاں طلوع ہوئیں، انتظار صاحب نے غالب کا شعر پڑھا۔

پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں
پھر وہی زندگی ہماری ہے

یہ دراصل جنگ کے خلاف موسیقی کا تہذیبی ظہور ہے، حالانکہ وہ شور سلاسل میں بھی اس کی قوت نمو کو محسوس کرتے ہیں کہ جب ریڈیو پاکستان کی شتم پشتم آواز گونجتی اور کوئی پنواڑی بے چین ہو کر سوئی گھماتا، ریڈیو سیلون لگاتا یا ریڈیو جالندھر ملاتا تو کوئی تن جلا طنز کر دیتا:

استاد جالندھر لگا رکھا ہے اور پنواڑی جھینپ کر سوئی کو پھر اپنے اسٹیشن پر لے آتا۔

اور جنگ کے بعد جب بندشیں نہ رہیں تو ان کی تخلیقی سائیکی نے ایک محصور معاشرے کی بیخ کنی بھی کی کہ 'یارو یہ کیا ہے کہ جنگ کے دنوں میں تو تمہیں لاہور اسٹیشن سے بغیر کل نہیں پڑتی تھی، جنگ کا زمانہ رخصت ہوا تو تم نے اسے دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا ہے......'

اس کے بعد وہ اسی معاشرت کی تہذیبی وحدت میں برصغیر کی ثقافتی روح کے جویا معلوم ہوتے ہیں۔ اس لیے یہاں لتا جی کی ابدی شہرت کی تجسیم میں وہ ثقافتی مظاہر در آئے ہیں جن کو ہم 'شادیانے' کا نام دیں یا غم دنیا کے حوالوں میں محسوس کریں۔ کمال تو یہ ہے کہ شاید ایسی ہی کسی کیفیت میں انتظار صاحب بھی یہاں ایک نوع کی وارفتگی میں گنگنانے لگتے ہیں کہ: 'کنکریا مار کے جگایا...... ظالماں تو بڑا وہ ہے......' تو وہ دراصل اس پورے تہذیبی ظہور کے تار و پود بھی روشن کر دیتے ہیں۔

یوں انتظار صاحب نے بڑے ستھرے انداز میں جنگ کے نفسی اور سیاسی رجحان کے مدمقابل اس تہذیبی لاشعور کو نمایاں کرنے کی سعی کی ہے جس میں کوئی ایک لتا ایسی آواز نہ صرف بود و باش کرتی ہے بلکہ سرحدوں میں محصور معاشروں کے لیے اخوت اور بھائی چارے کی وجہ بھی بن سکتی ہے۔

ٹھیک اسی طرح پروین شاکر کے ہاں ان کی نظم 'مشترکہ دشمن کی بیٹی' میں سرحدوں کی معرکہ آرائی کے تمام حوالے اور اس کی تلخ نوائیاں خوب روشن ہیں، یہاں بھی ہندو پاک جنگ کی یادیں پھوٹ پڑی ہیں، جو دراصل تاج محل، میسور کے ریشم اور بنارس کی ساڑیوں کے ذکر سے جھلمل کرتی پینسٹھ، اکہتر اور جنگی قیدیوں...... سے ہوتے ہوئے یہاں آن پہنچی ہے اور اب چینی ریستوراں کے حبس زدہ ماحول میں شریانوں کے پھٹنے سے ذرا پہلے اور اچانک

لیکن اس پل، آرکسٹرا خاموش ہوا
اور لتا کی رس ٹپکاتی، شہد آگیں آواز، کچھ ایسے ابھری
جیسے حبس زدہ کمرے میں
دریا کے رخ والی کھڑکی کھلنے لگی ہو!

....

میں نے دیکھا
جسموں اور چہروں کے تناؤ پہ
ان دیکھے ہاتھوں کی ٹھنڈک
پیار کی شبنم چھڑک رہی تھی
مسخ شدہ چہرے جیسے پھر سنور رہے تھے

....

مشترکہ دشمن کی بیٹی
مشترکہ محبوب کی صورت
اجلے ریشم لبوں کی بانہیں پھیلائے
ہمیں سمیٹے
ناچ رہی تھی!

یہاں لتا جی کو محض ہند و پاک کی دوستی کے تذکرے سے موسوم کرنا اس متن کی تحدید ہے کہ اس میں پروین نے موسیقی کی نفسی خواہش اور اس کے بطن سے پیدا ہونے والے ان کرداروں کی گاتھا لکھ دی ہے جو اپنی کتھارسس کے بعد کسی محصور معاشرہ کا فرد نہیں رہ جاتا بلکہ غم حیات کے بحر بے کراں سے گزر کر کائنات کی بے کراں وسعتوں کا استعارہ بن جاتا ہے۔

گویا لتا تہذیبی ظہور کی منفرد صورت بھی ہیں، شاید اس لیے ممتاز مفتی اپنی کتاب 'ہند یاترا' میں بھارت کو لتا کا دیش کہتے ہیں کہ:

'اے لتا منگیشکر کے دیس میں تجھے پرنام کرتا ہوں، میرا اسلام قبول کر۔'

اس سفرنامے میں انھوں نے شہر دہلی میں اس 'سلام' کی تصور آفرینی کی ہے، اس لیے اپنے ہمسفر کی یاد دہانی پر کہ لتا تو بمبئی میں رہتی ہیں، وہ کہتے ہیں:

'اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ تو میرے دل میں رہتی ہے۔ زندگی میں جتنا سکھ جتنی خوشی مجھے لتا نے دی ہے۔ کسی اور فرد واحد نے نہیں دی۔ جوانی میں اس نے مجھے دل کی دھڑکنیں دیں، بڑھاپے میں دل کا سکون دیا۔'

بہر کیف، جمہوری تہذیب کے انقلابی شاعر حبیب جالب کے ہاں لتا جی قید اور اس کی شدت تنہائی میں یوں مجسم ہوتی ہیں کہ۔

تجھ کو سن کر جی اٹھتے ہیں
ہم جیسے دکھ درد کے مارے
ترے مدھر گیتوں کے سہارے
بیتے ہیں دن رین ہمارے

زنداں کی دیواروں کے بیچ جالب نے لتا کو کیوں یاد کیا ہوگا، اس کی تفہیم کے شخصی اور نفسی حوالے ہیں، لیکن اصغر ندیم سید اس باب میں جالب کے پورے تخلیقی وجدان

لتا جی کی یاد میں

کو روشن کرتے ہیں کہ:

’حبیب جالب نے تاریکیوں کو ڈرایا ہے...... وہ لتا منگیشکر کا گیت اس لیے پسند کرتا ہے کہ وہ اپاہج گداگروں کا ملا جلا کورس نہیں سننا چاہتا۔ اگر اسے یہ سب کچھ بھی سننا پڑے گا تو پھر وہ یہ بھی کہنے کا حق رکھتا ہے کہ میں ابھی تاریکیوں کے سفر سے واپس نہیں لوٹا۔ البتہ وہ یقین دلاتا ہے کہ میں ضرور آؤں گا۔‘

گویا لتا جالب کے لیے روشنی کا استعارہ تھیں، خود جالب کی زبانی کہوں تو وہ جیل کی تاریکیوں میں اپنے نوجوان دوست وہاب سے کہا کرتے تھے:

’کوئی لتا کو ڈھونڈ کر لاؤ...... وہاب ریڈیو پر سوئی گھماتے، جہاں کوئی نہ کوئی لتا کا گانا لگا ہوتا۔ وہ چلاتا، جالب صاحب! لتا آگئی، لتا آگئی......‘

یوں لتا کا آنا تجلی حیات بھی ہے کہ

تیری اگر آواز نہ ہوتی
بجھ جاتی جیون کی جوتی

ان تخلیقی بشارتوں کے یہ ہر پہلو لتا جی اسالیب ادب میں حیاتیاتی و ثقافتی بوقلمونی اور حوالہ جات میں یوں بھی طلوع ہوتی ہیں کہ جیسے وہ صرف آواز نہ ہوں بلکہ دانش و حکمت کا انتساب بھی ہوں۔

مثلاً زاہدہ زیدی کے ناول ’انقلاب کا ایک دن‘ میں ان کے کردار ٹرین کے سفر میں شاعری، انگریزی ادب، روسی ناول، اجنتا آرٹ اور امرتا شیرگل کے ساتھ لتا منگیشکر کو انہی معنوں میں دانش مند معاشرے کی کلغی اور کسی حد تک آئیڈیل محبوب کا پیکر بنا دیتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر کے ہاں ان کی کتاب ’کوہ دماوند‘ میں سڑکوں پر بوڑھے ازبیک کا سیخ کباب فروخت کرنا اور اسی وقت بازار میں لتا کی آواز سنائی پڑنا ایک اور طرح کا کلچرل ڈسکورس ہے۔ حیدر یہاں استعجابیہ انداز میں کہتی ہیں:

’سمرقند کے بازار میں لتا کا فلمی گیت! تو گولڈن سمرقند کو قصہ ماضی سمجھو‘

حیدر کے علم و کمال میں فن موسیقی کو کیسی اہمیت حاصل ہے، اس پر بات کرنے کا یہ محل نہیں، لیکن یہاں ایک دوسری تہذیب اور Cultural Hegemony کی شعریات میں اس کے معنی و مصدر پر باتیں کی جاسکتی ہیں۔

بہرحال، بانو قدسیہ کی کہانی ’سمجھوتہ‘ کی بُنت میں تقسیم، پاکستان، ہندو، مسلمان، بنگلہ دیش اور ہندوستان میں پاکستانی قیدیوں کے کوائف اور تاریخی متون سے اکتشافی معاملہ کیا گیا ہے اور ایک طاقتور بیانیے کی یافت کو ممکن بنایا گیا ہے۔ اسی کہانی کا ایک ایکٹ یوں سامنے آتا ہے:

نمبر باسٹھ
جی صاحب،
لتا منگیشکر کا نام سنا ہے تم نے؟
جی سر،
یہ گانا سنا ہے: آئے گا آنے والا—
جی صاحب۔
ذرا سیٹی بجاؤ اس دھن پر—لیکن جب میں کہوں فوراً بند کر دینا۔
یس سر۔
عبدالکریم دشمن کے سپاہی کو خوش کرنے کے لیے کافی دیر تک سیٹی بجاتا رہا۔
آئے گا آنے والا،
آئے گا—آئے گا—آئے گا......

اور دوسرے ایکٹ میں:

’ہمیں وہ لوگ یاد آنے لگے جو پاکستان میں ہماری راہ دیکھ رہے تھے، اس لمحے ہم قیدی نہ رہے۔ ہمارا اپنا کوئی غم نہ رہا...... اس گیت نے ہمارا غم، رسوائیاں، بھوک، تنگدستی، ظلم، بے غیرتی، بے عزتی کو اپنے میں سمولیا، اور اس پر ان لوگوں کا غم غالب آگیا جو ہمارے لیے ترس رہے تھے—جو ہماری راہ دیکھ رہے تھے۔

یاد رہے، فلم محل کے اسی شاہ کار گیت نے لتا جی کو مقبول بنایا تھا۔ اب یہاں اس آواز کو ان قیدیوں کی نظر سے محسوس کیجیے تو اس میں معنی و مفہوم کا ایک اور منطقہ منکشف ہوگا۔

کہیں دور سے آتی ہوئی آواز اور ایک خاص نوع کی موسیقی کو بانو نے اپنی کہانی میں اس طرح صیقل کیا ہے کہ قیدی کتھارسس کے بھید کو پالیتے ہیں اور ان کی راہ دیکھنے والوں کا دکھ اس بھید کو اور گہرا بنا دیتا ہے۔

اس ایک مثال سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ لتا جی کس کس طرح سے ادبی اسالیب اور اس کے تخلیقی عمل کا حصہ بنتی ہیں۔

اسی طرح اختر جمال کی کہانی ’اسکائی لیب‘ میں ایک دور افتادہ پہاڑی گاؤں کا بیانیہ ملتا ہے، یہاں کے باشندوں کے لیے ریڈیو ہی ایک میڈیم ہے جو دنیا سے ان کے ترسیلی رشتے کو استوار کرتی ہے۔ باہری دنیا سے ان کی پہچان ذرا محدود ہے، ایسے میں اُس ریڈیو کی بلند آواز میں آواز ملا کر لڑکیوں کا لتا اور نور جہاں کے ہمراہ کورس کے انداز میں گانا ایک نوع کی گمشدہ ثقافت کی بازآفرینی ہے کہ یہ بیانیہ اس کہانی کے تفریدی سیاق میں بھی گامزن نظر آتا ہے۔

گزشتہ سطور میں ہم نے جنگ کے دنوں اور معاشرت کی تخلیقی خواہشوں میں لتا جی کو ایک ادبی اور تخلیقی اسلوب میں معنی کا اسطورہ بنتے ہوئے محسوس کیا ہے، اور شاید یہ اتفاق ہے کہ وہ بار بار اس کا حوالہ بنتی ہیں۔ مثال کے طور پر ’ویت نام‘ کے خونچکاں احساس کو نظم کرتے ہوئے ہندوستانی فلسفہ اور موسیقی سے گہری دلچسپی کا اظہار کرنے والے شاعر عمیق حنفی بھی اس آواز کو جنگ کی تاریکی میں تخلیقی جوت کی طرح برتتے ہیں کہ:

سویرے بند کمرے میں دبے پاؤں شگاف در سے
گھس کر زردمٹ میلے
ورق پر رینگتی کڑوی کسیلی خون میں ڈوبی ہوئی
خبریں اٹھائے
سبز آگ کی ناگن بصارت سے سماعت سے
ذہانت سے دل و جاں میں
در آتی ہے
رگوں میں کلبلاتی ہے نسوں پر سرسراتی ہے
لتا منگیشکر کی شہد سی آواز کا جادو یکا یک توڑ کر
تیزاب کی بدلی سے
بجلی بن کے گرتی ہے، لہو میں جذب ہو کر چشم و لب
پر اشک و خون و نعرہ شب گیر بن کر تھرتھراتی ہے......

اسی طرح وہ اپنی ایک اور نظم ’لتا منگیشکر‘ میں اس آواز کو شور کے خلاف تخلیقی سکون کا استعارہ بنانے کی سعی کرتے ہیں کہ

آوازوں کے شہر بسے ہیں آوازوں کے گاؤں ہیں
آوازوں کے جنگل میں کانٹوں سے زخمی پاؤں ہیں
آوازیں ہی آوازیں ہیں
لیکن اک آواز
جو یہ گھنے بھیانک جنگل چیر کے دور سے آتی ہے
جیسے ہوا کسی بنسی بن میں گاتی اٹھلاتی ہے......
ایک آواز جسے سن کر میں آپ کہیں کھو جاتا ہوں
پھر وہ میرے اندر کی گہرائی میں کھو جاتی ہے

عمیق حنفی کی یہ نظم ان کے مجموعہ ’شب گشت‘ میں شامل ہے، انھوں نے یہ نظم 1964 میں کہی تھی، حالانکہ اس سے قبل ایک دوسری صورت میں یہی نظم فلمی رسالہ ’مادھوری‘ میں بھی شائع ہوئی تھی۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ نظم کی مطلوبہ صورت کی گرفت تک انھوں نے لتا جی کی آواز سے مسلسل مکالمہ کیا ہوگا۔

اسی طرح قمر ہاشمی نے بھی لتا منگیشکر کی آواز کو اپنی نظم میں شعلہ ساز، لرزش مضراب اور دم عیسیٰ کا اعجاز کہتے ہوئے اس کی صورت گری کی ہے اور ان کی آواز کو چہرہ نما

قرار دیا ہے کہ۔

میں نے دیکھا نہیں کیا رنگ ہے
کیا روپ ترا
'میں تو آواز کو بھی چہرہ نما جانتا ہوں'
تیری آواز بسنتی بھی ہے دھانی بھی ہے
شیام سندر کی کہانی بھی ہے
تیری آواز میں آباد ہے اک روپ نگر
مدتوں تک ترے گیتوں کا یہ امرت ساگر
تیرے ہی ساز گلو سے بہے
بہتا رہے
برسات کے بادل کی طرح
دوش ہوا پر لہرائے

لتا جی کے باب میں کہی گئی نظموں کا رنگ جداگانہ بھی ہے، جن سے شخصی تذکرے بھی منسوب ہیں۔ مثال کے طور پر ساحر اور لتا کی داستان سے اکثر لوگ واقف ہیں تو یہاں بس ان کی دو نظموں 'تیری آواز' اور 'انتظار' کا سرسری تذکرہ کہ اس میں ہجر و وصال کی ساعتیں ہیں، شکوہ ہے، انتظار کی گھڑیاں ہیں اور ایک شکست خوردہ عاشق کی تڑپ بھی۔

دیر تک آنکھوں میں چبھتی رہی تاروں کی چمک
دیر تک ذہن سلگتا رہا تنہائی میں
اپنے ٹھکرائے ہوئے دوست کی پرسش کے لیے
تو نہ آئی مگر اس رات کی پہنائی میں

اس کے برعکس مجروح کے ہاں لتا کی آواز ان کی شاعری کا تکملہ بنتی نظر آتی ہیں کہ۔

میرے لفظوں کو جو چھو لیتی ہے آواز تری
سرحدیں توڑ کے اُڑ جاتے ہیں اشعار مرے

یوں لتا ادب میں ایک مکمل کلچرل ڈسکورس اور تخلیقی اظہاریہ کی صورت ابھرتی ہیں، اور کئی بار روز مرہ کے طنز و مزاح میں شامل ہو کر اس اسلوب ادب کو الگ سے بھی بہرہ مند کرتی ہیں۔ اس باب میں ایک قصہ ہم تک اس صورت میں پہنچا ہے کہ اخلاق احمد دہلوی جوش ملیح آبادی اور لتا جی کے مداح تھے اور ان دنوں ملک کی تقسیم کے بعد ریڈیو پاکستان سے وابستہ تھے۔ معمول کے مطابق ایک دن جب ریڈیو پر اپنے پروگرام کے لیے جا رہے تھے تو کسی نے از راہ تفنن طبع ان سے کہہ دیا کہ جوش نے لتا کے لیے کیا خوب کہا ہے۔ وہ تڑپ اٹھے، بولے کیا کہا ہے؟ سامنے والے نے ایک ذرا سی ترمیم کے بعد جوش کا شعر سنا دیا کہ۔

وہ گونجا نغمہ شیریں لتا کا
زمین و آسمان خاموش خاموش

اور اس سے پہلے کہ انھیں روکا جاتا اور جوش کا صحیح شعر سنایا جاتا، انھوں نے ریڈیو پاکستان پر بڑے مزے سے فرما دیا: دیکھیے حضرت جوش ملیح آبادی نے لتا کو کس انداز سے ہدیہ تہنیت پیش کیا ہے۔

حالانکہ بعد میں اس مزاح کے خالق کو یہ کہہ کر صفائی پیش کرنی پڑی کہ انھیں جوش کا یہ شعر اسی طرح یاد تھا۔ اس طرح تحریف شدہ ہی سہی لیکن جوش کا ایک شعر لتا جی کو منسوب ہو گیا۔

اب باقاعدہ اس صنف کی بات کریں تو شوکت تھانوی جیسے نابغہ نے مولانا آزاد کی 'غبار خاطر' کی پیروڈی میں 'بار خاطر' کے نام سے اپنی کتاب میں تمام اکابرین کے ساتھ ایک دلچسپ خط لتا جی کے نام بھی لکھا ہے:

یہ آفت ہوش و ایماں آواز تو در در اور گھر گھر پہنچی ہوئی ہے۔ کون سا خطہ ہے جہاں یہ شراب نہ برتی ہو۔ ان نغموں کی زبان کوئی سمجھے یا نہ سمجھے مگر یہ گیت گنگنانے والے وہاں بھی مل جاتے ہیں جہاں اردو ابھی تک نہیں پہنچی......

اس طویل خط میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ:

میں نے اردو کے سب سے بڑے مبلغ مولانا عبدالحق کے نام جو خط لکھا ہے اس میں نہایت سنجیدگی کے ساتھ عرض کیا ہے کہ بھارت کی سب سے بڑی مولانا عبدالحق لتا منگیشکر ہے، جس کے گانے اس ہندوستان کے گوشے گوشے میں رچے ہوئے ہیں جو اردو سے اپنا دامن بچانے کے دعوے دار ہیں، مگر اردو ہے کہ لتا کے گانوں کی شکل میں اپنے گن گا رہی ہے۔

پھر اس انداز میں داد بھی دیتے ہیں کہ:

ایک معطر گلوری منھ میں ہو اور کانوں میں آپ کی آواز کا رس انڈل رہا ہو تو اس دو آتشہ کا کیف مجھ کو واقعی گم کر دیتا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ کوئی مجھ کو نہ ڈھونڈے۔

اسی طرح فکر تونسوی ایک مضمون میں شخصیت کے ساتھ نام کے سوٹ کرنے کے بارے میں لکھتے ہیں تو لتا جی کے نام کو بھی اپنا موضوع بناتے ہیں کہ:

لفظ منگیشکر کو زبان سے ادا کرتے وقت حلق، زبان اور دانتوں کو تین مشکل اسٹیجوں سے گزرنا پڑتا ہے، بالکل روسی ناولوں کے کرداروں کی طرح کہ وہ آسانی سے گرفت میں آتے ہی نہیں، لیکن جب لتا منگیشکر کی مترنم، رسیلی اور بتاشے کی طرح گھلتی ہوئی آواز نے ہندوستانیوں کے اعصاب میں جادو جگانا شروع کر دیا اور پان فروشوں سے لے کر کالج کے لکچرار سے ہوتے ہوئے ممبران پارلیامنٹ تک لتا کی آواز پر جھومنے لگے تو لتا منگیشکر کے نام میں کوئی اڑچن اور دقت نہ رہی۔ اس کے نام اور آواز میں پہاڑی جھرنے کی سی روانی محسوس ہونے لگی۔

> **میں نے اردو کے سب سے بڑے مبلغ مولانا عبدالحق کے نام جو خط لکھا ہے اس میں نہایت سنجیدگی کے ساتھ عرض کیا ہے کہ بھارت کی سب سے بڑی مولانا عبدالحق لتا منگیشکر ہے ، جس کے گانے اس ہندوستان کے گوشے گوشے میں رچے ہوئے ہیں جو اردو سے اپنا دامن بچانے کے دعوے دار ہیں، مگر اردو ہے کہ لتا کے گانوں کی شکل میں اپنے گن گا رہی ہے۔**

تونسوی نے 'پیاز کے چھلکے' میں بھی بڑے مزے کے ساتھ لتا کی آواز کو طنزیہ اسلوب کے لیے صیقل کیا ہے۔ اسی صنف میں مجتبیٰ حسین بھی اس آواز کو صدی کا اسطورہ اور وجودی تشخص کے لیے سرمایہ افتخار کہتے نظر آتے ہیں۔ دراصل انھوں نے اپنے 'وفاتیہ' میں بڑے مزاحیہ انداز میں اس کے سہارے اپنے تشخص کا اظہار کیا ہے:

کروڑوں برس پرانی دنیا میں بیسوی اور اکیسویں صدی کے بیچ یہ جو اسی برس انھیں (مجتبیٰ حسین کو) ملے تھے، ان سے وہ بالکل مایوس نہیں تھے۔ کبھی کبھی موج میں ہوتے تو اپنا مقابلہ دنیا کی بڑی بڑی ہستیوں سے کر کے ان ہستیوں کو آن کی آن میں چت کر دیتے تھے۔ اپنے آپ کو سکندر اعظم سے بڑا اس لیے سمجھتے تھے کہ سکندر اعظم نے لتا منگیشکر کا گانا نہیں سنا تھا......

اور اسی صنف کے شعری اسلوب میں دلاور فگار کہہ گئے کہ:

ٹیون میں پیدا کرو کیف و اثر
جیسے گاتی ہے لتا منگیشکر

یہ لتا ایسی آواز کے تہذیبی ظہور کی چند مثالیں ہیں کہ راجندر سنگھ بیدی (مکتی بودھ)، عبداللہ حسین (نشیب)، مستنصر حسین تارڑ (برفیلی وادیاں)، عرش ملسیانی، قتیل شفائی، عتیق اللہ اور شیراز راج جیسے متعدد قلم والوں کے ہاں لتا جی کے تخلیقی اور فکری حوالے موجود ہیں، جو کسی نہ کسی طور پر ادب کے تخلیقی کوائف میں شامل ہو کر اس کے علمیاتی زمرے کو روشن کرتے ہیں۔

■

Md. Faiyaz Ahmad
Pen Name: Faiyaz Ahmad Wajeeh
Vill+Po: Adalpur, Via: Muria
District: Darbhanga
Pin: 847115 (Bihar)

محمد شارب

لتا: ایک عظیم شخصیت

یوں تو دنیا میں سبھی آئے ہیں مرنے کے لیے
موت اس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس

لتا منگیشکر، جنھیں 'بلبلِ ہند' بھی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ ان کی آواز میں بلبل جیسی نغمگی، شہد جیسی مٹھاس اور شکر جیسی شیرینی تھی۔ ان کی آواز میں کشش و رعنائی کیوں کر نہ ہو آخر اردو زبان و تلفظ پر ان کو زبردست عبور جو تھا۔ جتنی بڑی وہ فنکارہ تھیں اس سے بڑھ کر وہ انسان تھیں۔ جب تک دنیا میں سامعین ہیں، ان کی آواز ہے اور برصغیر کی عوام کے دلوں میں وہ زندہ جاوید ہیں۔ یہ 28 ستمبر 1929 کو مدھیہ پردیش کے شہر اندور میں پیدا ہوئیں اور 6 فروری 2022 کو ممبئی کے برج کینڈی ہسپتال میں آخری سانس لی۔ وہ کورونا سے متاثر تھیں اس لیے جنوری ماہ میں ہسپتال میں داخل کیا گیا تھا۔ موسیقی تو انھیں اپنے والد دینا ناتھ راؤ منگیشکر سے وراثت میں ملی تھی اور عہد طفلی سے ہی اس کی جانب مائل تھیں۔ جس کے باعث انھوں نے محض 13 سال کی عمر میں مراٹھی فلم 'کیتی ہاسّل' کے لیے گانا گایا۔ یہ گانا مارچ 1942 کو سرسوتی سینے ٹان، پونا میں ریکارڈ کیا گیا۔ اس کے بعد انھوں نے بالی ووڈ کی فلموں میں ایک سے بڑھ کر ایک عالمی شہرت یافتہ نغموں کو اپنی آواز دی۔ انھوں نے جن فلموں کے نغموں کے لیے اپنی آواز دی ان میں 'محل' 1948 ہے۔ جب یہ فلم منظر عام پر آئی تو گلوکارہ گیتا رانی کو چھوڑ کر لتا منگیشکر کے مقابلے کی تمام گلوکارائیں شمشاد بیگم، زہرا بائی، پارل گھوش اور امیر بائی ایک ایک کر کے ان کے راستے سے ہٹتی چلی گئیں۔ اداکار راج کپور اور اداکارہ نرگس کی فلم 'برسات' 1949 میں ریلیز ہوئی تو اس کے گانوں نے موصوفہ کو شہرت کی بلندیوں پر بٹھا دیا۔ جی ہاں۔۔ اس میں شامل وہ نغمہ کیسے فراموش کر سکتے ہیں 'ہوا میں اڑتا جائے مورا لال دوپٹا ململ کا مورا لال دوپٹا ململ کا'۔ اس فلم کے نغموں سے اپنی شہرت کا اعتراف انھوں نے اپنے انٹرویو میں بھی کیا ہے۔

ایک واقعہ غالباً 1950 کا ہے جب انھوں نے ایک نغمہ 'آئے گا آنے والا آئے گا' سنایا تو اس وقت آل انڈیا ریڈیو پر گانا بجانے کی اجازت نہیں تھی۔ ہندوستان کے لوگوں نے پہلی بار لتا کی آواز 'ریڈیو گووا' پر سنی تھی۔ ہندی فلموں میں لتا نے اس گانے سے خود کی شناخت قائم کی۔ اس کے بعد ان کے نغمے یکے بعد دیگرے 'انار کلی' (1953)، 'مدھومتی' (1958)، 'مغل اعظم' (1960)، 'بیس سال بعد' (1962) ہیں۔ جب فلم 'سنگم' 1964 میں ریلیز ہوئی جس میں معروف اداکارہ وجینتی مالا کے مد مقابل اداکار راج کپور اور راجندر کمار تھے۔ اس فلم کی زبردست کامیابی سے موصوفہ کا مقدر اپنے نصف النہار پر جا پہنچا۔ یہ پہلے پہل جہاں گانوں کے لیے پانچ سو سے ہزار روپے لیا کرتیں وہیں اس فلم سے انھیں فی نغمہ دو ہزار ملنے لگے۔ اس کے علاوہ فلم 'گائیڈ' (1965)، 'سرسوتی چندر' (1968)، 'پریت بچھڑے' (1972)، 'امر پریم' (1972)، 'کورا کاغذ' (1974)، 'ستیم شیوم سندرم' (1978)، 'آشا' (1980)، 'پریم روگ' (1982)، 'رضیہ سلطان' (1983)، 'رام تیری گنگا میلی' (1985)، 'حنا'، 'صنم بے وفا' (1991) کے ساتھ ساتھ 'دل والے دلہنیا لے جائیں گے' (1995)، 'دل تو پاگل ہے' (1997)، 'محبتیں' (2000)، 'ویر زارہ' (2004) جیسی فلموں میں اپنی آواز کا جادو بکھیرا ہے۔ وہ ایک دن میں سات سے آٹھ نغموں کو ریکارڈ کرانے کا مادہ رکھتی تھیں۔

پنڈت دینا ناتھ منگیشکر نے پہلی بیوی کے انتقال کے بعد ان کی چھوٹی بہن شیونتی عرف سدھامتی سے شادی کی جن کے بطن سے چار بیٹیوں لتا، مینا، آشا اور اوشا اور ایک بیٹے ہردے ناتھ ہوئے۔ ان میں لتا جی سب سے بڑی تھیں۔ ان کے بچپن کا نام ہیما تھا۔ موسیقی کی تعلیم اپنے والد، استاد امانت علی خاں، غلام حیدر اور پنڈت تلسی داس شرما سے حاصل کی۔ ان کے والد بھی گلوکار اور اداکار تھے۔ ابتدا میں انھوں نے موسیقی کے گر اپنے والد سے ہی سکھایا لیکن یہ سلسلہ زیادہ دن نہ چل سکا کیونکہ 24 اپریل 1942 کو قدرت نے باپ بیٹی کو جلد ہی جدا کر دیا۔ پھر کیا تھا جو تھوڑی بہت تعلیم والد

سے سیکھی تھی اس کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ چونکہ وہ اسکول سے دور تھیں جس کے پیچھے کی علت کو بیان کرتے ہوئے ان کی بہن اوشا کہتی ہیں کہ ''ایک بار جب لتا دیدی اسکول گئیں تو ساتھ میں گودی میں اٹھائے بہن آشا کو بھی لے گئیں جس سے اسکول کے ماسٹر نے دیدی کو کہا کہ چھوٹے بچے کو لانے کی اجازت نہیں ہے اس سے پڑھائی میں خلل پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ اس کا اثر دیدی نے اس قدر لیا کہ اس دن سے انھوں نے اسکول کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیا۔'' گھر میں ماں سدھامتی فکر مند رہنے لگیں کہ ان معصوم بچوں کا گزارا کیوں کر ہوگا۔ گھر میں سب سے بڑی ہونے کے باعث لتا کو اپنی ماں کی پریشانی کا بخوبی اندازہ تھا اور انھوں نے اپنے معصوم کندھوں پر خانہ داری کا بار اٹھانے کا عزم کرلیا۔ تب مشہور فلمی اداکارہ نندا کے والد ماسٹر وناتک نے اپنی مراٹھی فلم ''پہلی منگلا گور'' میں ہیروئن کی بہن کا کردار کرنے کو انہیں منتخب کیا جس میں انھوں نے دو تین گانے بھی گائے لیکن صرف ایک ہی چلا۔ اسی درمیان ماسٹر وناتک کا اس فلم کے مینیجر سے جھگڑا ہوگیا اور وہ چھوڑ کر کولہاپور چلے گئے اور اپنی کمپنی قائم کی۔ ساتھ ہی لتا کو بھی کہہ گئے کہ جب فلم مکمل ہو جائے تو وہ ان کے پاس کولہاپور آجائیں۔ بہر حال فلم مکمل ہوئی لتا کو ان کی محنت کے تین سو روپے ملے اور وہ کولہاپور چلی گئیں۔ 1947 تک وہ بطور ملازمہ 'پرفل پکچرز' میں کام کیا تبھی اگست 1947 میں ماسٹر وناتک راؤ کی موت واقع ہوگئی۔

کہتے ہیں قسمت کو کون روک سکتا ہے۔ ایک موسیقی ہدایت کار ہریشچند ربالی نے انہیں سن کر گانا لینے کی فرمائش کی۔ جب وہ گانا گا رہی تھیں تو باہر ایک پٹھان نے ان کا گانا سن کر ماسٹر غلام حیدر سے اس کا ذکر کیا کہ کوئی نئی لڑکی آئی ہے، اسے آپ بلائیں۔ تب لتا کو ایک پیغام آیا اور وہ اپنی خالہ زاد بہن کے ساتھ فلمستان گورے گاؤں گئیں۔ جب ماسٹر غلام حیدر ریکارڈنگ روم سے باہر آئے اور دیکھا کہ لتا موجود ہیں تو انھوں نے فلم 'ہمایوں' کا گانا 'میں تو اوڑھوں گلابی چنریا' سنایا۔ اس کے بعد انھوں نے ان کی آواز کو ریکارڈ کرکے ہدایت کار ایس۔ مکھر جی کو سنائی جو اس وقت دلیپ کمار اور کامنی کوشل کو لے کر فلم 'شہید' پر کام کر رہے تھے۔ اس کا ایک گانا 'بدنام نہ ہو جائے' سنا تو یہ کہہ کر لتا کی آواز کو مسترد کر دیا کہ بہت پتلی ہے، نہیں چلے گی۔ یہ کلمات سن کر غلام حیدر صاحب کو غصہ آیا اور لتا کو کہا چلو میرے ساتھ اور وہ پیدل ہی فلمستان سے اسٹیشن تک گئے۔ اس کے بعد ماسٹر صاحب نے لتا سے کہا کہ کوئی اور گانا سناؤ تو انھوں نے ان کی فلم 'مجبور' کا گانا 'دل میرا توڑا کہیں کا نہ چھوڑا تیرے پیار نے' جو ماسٹر صاحب کو بہت پسند آیا اور اس میں انھوں نے موقع دیا۔ یہی لمحہ لتا کے لیے Turning point ثابت ہوا۔ پھر کیا تھا؟ ریاض شروع ہوگیا اور اس کے دو دنوں بعد اس کی ریکارڈنگ ہوئی۔ یہ گانا اداکارہ منور سلطانہ پر فلمایا گیا جن کی موٹی آواز ہونے کے باوجود بھی اس قدر مقبول ہوا کہ اس کی شہرت انیل وشواس، کھیم چند پرکاش جی تک پہنچی۔ انھوں نے موصوفہ کو اپنے یہاں گانے کے لیے مدعو کیا اور اپنے گانے گوائے۔ انیل وشواس نے لتا کو گانے کے فن سے روشناس کرتے ہوئے کافی کارآمد نکات بتائے کہ کہاں سانس لینی ہے اور کہاں چھوڑنی ہے جو بعد میں موصوفہ کے لیے مشعل راہ بنا۔ اس طرح موصوفہ کی قسمت کے ستارے چمک گئے۔ جس لڑکی نے مکتب کی اچھی طرح صورت نہیں دیکھی تھی اسی کے نام چھ یونیورسٹیوں بشمول نیویارک یونیورسٹی کی اعزازی اسناد ہیں۔

لتا کو موسیقی کے علاوہ مختلف شعبہ جات کے اہم انعامات سے نوازہ گیا جن میں: 'پدم بھوشن' (1969)، ہندی سنیما کا سب سے عظیم انعام 'دادا صاحب پھالکے ایوارڈ' (1989)، پدم وبھوشن ایوارڈ (1999) اور 'مہاراشٹر بھوشن' ایوارڈ بھی عطا کیے گئے۔ مذکورہ اعزازات کے علاوہ 1972، 1974 اور 1990 کے قومی اعزازات بھی حاصل ہوئے اور ساتھ ہی 2001 میں انھیں بھارت کا سب سے عظیم شہری اعزاز 'بھارت رتن' سے بھی سرفراز کیا گیا۔ لتا کو سب سے بڑا خراج تحسین نغمہ نگار مجروح سلطان پوری نے اپنی نظم 'لتا منگیشکر' میں پیش کیا تھا۔

جہاں رنگ نہ خوشبو ہے کوئی تیرے ہونٹوں سے
مہک جاتے ہیں افکار میرے
میرے لفظوں کو جو چھو جاتی ہیں آواز تیری سرحدیں
توڑ کر راز جاتے ہیں اشعار میرے

بھارت کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو کے متعلق یہ مشہور تھا کہ نہ وہ کھلے عام روتے تھے اور نہ ہی کسی کا رونا پسند کرتے تھے۔ لیکن 27 جنوری 1963 کو جب لتا جی نے نغمہ نگار پردیپ کا لکھا یہ نغمہ 'اے میرے وطن کے لوگوں ذرا آنکھ میں بھرلو پانی' گایا تو وہ آنکھ میں آنسو نہیں روک پائے تھے۔ اور گانے کے بعد لتا کو اپنے گلے سے لگاتے ہوئے کہا کہ تم نے تو مجھے رُلا دیا۔ 1964 میں جواہر لعل کو جب ممبئی جانا ہوا تو لتا نے اس تقریب میں فلم 'آرزو' کا یہ نغمہ 'اجی روٹھ کر اب کہاں جائیے گا، جہاں جائیے گا ہمیں پائیے گا' پیش کیا۔ تب نہرو جی نے لتا کو ایک چھوٹا سا رقعہ لکھ کر ان سے 'اے میرے وطن کے لوگوں' گانے کی فرمائش کی تو موصوفہ نے اسے پوری کی۔ موصوفہ نے ہندوستان کی تقریباً سبھی زبانوں میں گانے گا کر ایک ریکارڈ قائم کیا اور بے شمار لوگوں کو اپنی آواز کا دیوانہ بنایا۔ ان کے نغموں کی انفرادیت یہ ہے کہ یہ بچے، بوڑھے اور جوان تینوں نسلوں میں کافی مقبول و معروف ہیں جن کی پرکشش آواز سبھی کو مسحور کرتی ہے، کانوں میں شہد گھولتی ہے۔ انھوں نے تقریباً چھتیس ہزار سے زائد گانے گائے جس کی وجہ سے 1971 سے 1991 تک گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں بطور ریکارڈ ہولڈر میں ان کا نام شامل رہا۔ موسیقی کی دنیا میں بادشاہت کرنے والی جس لتا کو باریک آواز کے باعث مسترد کر دیا گیا تھا بعد میں وہی آواز ان کی اور پورے بالی ووڈ کی پہچان بنی۔ نغموں کے شوقین حضرات کو یہ نغمہ ان کے ذہن میں گشت کر رہا ہوگا:

نام گم جائے گا، چہرہ یہ بدل جائے گا، میری آواز ہی پہچان ہے گر یاد رہے (فلم 'کنارہ')

> لتا جی همارے درمیان اب نهیں هیں لیکن ان کے نغمے آج بھی همارے کانوں میں گونجتے هیں. بھارت میں لوگ انهیں پرستش کی حد تک پیار کرتے هیں اور ان کی آواز کو خدا کا عظیم تحفه مانتے هیں. لوگوں نے جب ان کے نغمے سنے تو ان میں جذبات ابھرے، موسیقی کو سیکھنے کی خواهش پیدا هوئی. گانے کا شوق بیدار هوا. بے شمار لوگوں نے ان کے گانے کو اسٹیج پروگراموں میں گا کر شهرت بٹوری، نام کمائے اور لوگوں کو اپنا گرویده بنایا.

لتا جی ہمارے درمیان اب نہیں ہیں لیکن ان کے نغمے آج بھی ہمارے کانوں میں گونجتے ہیں۔ بھارت میں لوگ انھیں پرستش کی حد تک پیار کرتے ہیں اور ان کی آواز کو خدا کا عظیم تحفہ مانتے ہیں۔ لوگوں نے جب ان کے نغمے سنے تو ان میں جذبات ابھرے، موسیقی کو سیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی، گانے کا شوق بیدار ہوا۔ بے شمار لوگوں نے ان کے گانے کو اسٹیج پروگراموں میں گا کر شہرت بٹوری، نام کمائے اور لوگوں کو اپنا گرویدہ بنایا۔ یہ خیال عام ہے کہ زیادہ تیکھا اور کھٹا کھانے سے گلے میں خراش

پیدا ہوتی ہے اور آواز میں وہ نغمگی باقی نہیں رہتی جس کے لوگ خواہاں ہوتے ہیں لیکن ایک انٹرویو میں لتا جی سے جب دریافت کیا جاتا ہے کہ ان کی آواز اتنی سریلی کیوں ہے؟ تو اس سوال پر موصوفہ کا کہنا تھا کہ وہ ہری مرچ کا استعمال کثرت سے کرتی ہیں کیونکہ اس سے آواز اور سریلی ہوتی ہے۔ لتا کے نغموں کی فہرست سازی کی جائے تو ایک یا دو دن نہیں بلکہ کئی دن لگ جائیں گے۔ پھر بھی فلم 'وہ کون تھی' کا نغمہ 'لگ جا گلے کہ پھر یہ حسین رات ہو نہ ہو (1964)'، فلم 'فوجی' کا نغمہ 'چندا ماما آرے آوا پارے آوا ندیا کنارے آوا (1965)'، فلم 'لو ان ٹوکیو' کا نغمہ 'سایونارا سایونارا وعدہ نبھاؤں گی سایونارا (1966)'، فلم 'پگلا کہیں کا' کا نغمہ 'تم مجھے یوں بھلا نہ پاؤ گے (1969)'، فلم 'آن ملو سجنا' کا نغمہ 'اچھا تو ہم چلتے ہیں (1971)'، فلم 'کبھی کبھی' کا نغمہ 'کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے (1976)'، فلم 'سلسلہ' 'دیکھا ایک خواب تو یہ سلسلے ہوئے (1981)'، فلم 'گنگا جمنا سرسوتی' کا نغمہ 'ساجن میرا اس پار ہے ملنے کو دل بے قرار ہے (1988)'، فلم 'میں نے پیار کیا' کا نغمہ 'دل دیوانہ بن سجنا کے مانے نا (1989)' فلم 'رُدالی' کا نغمہ 'یارا سلی سلی برہا کے رات کا جلنا' (1993) وغیرہ کا ذکر کرنا اپنی تحریر کا تقاضا سمجھتا ہوں جن نغموں کی مقبولیت نے موصوفہ کو ایک نابغہ روزگار شخصیت بنانے میں بھر پور کردار ادا کیے ہیں جسے فلمی نغموں کے شائقین کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ 1960 سے 80 کی دہائی فلمی موسیقی کے عہد زریں سے منسوب کی جاتی ہے جہاں یکتا نام لتا کا نظر آتا ہے جس کا کوئی ثانی نہیں۔ موصوفہ کی آواز کے سریلے پن کے ساتھ ساتھ اردو کے ان کے بہترین تلفظ نے بھی لوگوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کی جس کا سہرا دلیپ کمار کے سر جاتا ہے۔ ہریش بھیمانی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ:

''ایک دن انیل وشواس اور لتا لوکل ٹرین سے گوریگاؤں جا رہے تھے۔ اتفاق سے اسی ٹرین میں باندرا اسٹیشن سے دلیپ کمار بھی چڑھے۔ تب انیل وشواس نے اس نئی گلوکارہ کا تعارف دلیپ کمار سے کرایا تو وہ بولے کہ مراٹھی لوگوں کے منھ سے دال بھات کی مہک آتی ہے وہ اردو کا بگھار کیا جانیں؟ اس بات کو لتا نے ایک چیلنج کے طور پر لیا۔ اس کے بعد شفیع صاحب نے ایک مولوی استاد کا بندوبست کیا جن کا نام محبوب تھا۔ لتا نے ان سے اردو سیکھی۔ اس کے کچھ وقت بعد فلم 'لاہور' کی شوٹنگ چل رہی تھی جہاں جدن بائی اور ان کی بیٹی نرگس بھی موجود تھیں۔ لتا نے 'دیپک بغیر کیسے پروانے جل رہے ہیں' گانے کی ریکارڈنگ شروع کی۔ ریکارڈنگ کے بعد جدن بائی نے لتا کو بلا کر کہا۔ ماشاء اللہ۔ کیا صفائی سے 'بغیر' کہا ہے۔ ہر کسی کا اتنا اچھا تلفظ نہیں ہوتا بیٹا۔''

کہا جاتا ہے کہ لتا جی نے باقاعدہ اردو زبان سیکھی تھی جہاں ان کے استاد کا نام محبوب تھا۔ لتا کے متعلق یہ بھی مشہور ہے کہ انہیں Slow poision دے کر مارنے کی بھی کوشش کی گئی تھی جس کی وجہ سے وہ ایک ماہ بیمار بھی رہیں۔ جب تفتیش کی گئی تو اس سازش میں ان کے باورچی کا نام سامنے آیا جسے اسی عمل کے لیے موصوفہ کے گھر بھیجا گیا تھا۔

لتا منگیشکر اس تغیر پذیر عہد کی موسیقی سے بھی نالاں تھیں اور ان کا ماننا تھا کہ آج کی موسیقی بالکل ہی تبدیل ہو کر رہ گئی ہے۔ اس میں اب وہ رمق باقی نہیں رہی جو ان کے زمانے، 60-90 کی دہائیوں میں تھے۔ آج کی موسیقی میں عریانیت کی بھرمار ہے جس کے منفی اثرات معاشرے پر پڑ رہے ہیں۔ اپنے زمانے کی بات کرتے ہوئے لتا جی کہتی ہیں کہ ان کا سب سے پسندیدہ نغمہ فلم 'پاکیزہ' کا 'چلتے چلتے یوں ہی کوئی مل گیا تھا سرِ راہ چلتے چلتے' ہے۔ 90 کی دہائی میں انھوں نے سب سے زیادہ لیش چوپڑا کے ساتھ کام کیا جن میں 'لمحے'، 'دل والے دلہنیا لے جائیں گے'، 'ڈر' جیسی فلمیں خصوصیت کی حامل ہیں۔ لتا منگیشکر اور نور جہاں میں کافی گہری دوستی تھی۔ ملک کی تقسیم کے بعد نور جہاں پاکستان چلی گئیں۔ 1952 میں لتا جب ایک بار امرتسر گئیں تو ان کا دل چاہا کہ نور جہاں سے ملاقات کی جائے جو کہ صرف دو گھنٹے کے فاصلے پر لاہور میں رہتی تھیں۔ موصوفہ نے نور جہاں کو فون کیا اور ایک گھنٹے تک بات ہوتی رہی۔ پھر دونوں نے واگھہ سرحد پر ملاقات کرنے کا فیصلہ کیا۔ مشہور موسیقی کار شری رام چندرن اپنی سوانح حیات میں رقمطراز ہیں کہ:

''میں نے اپنے تعلقات کا استعمال کر کے یہ ملاقات اس جگہ کروائی جسے فوج کی زبان میں No man land کہا جاتا ہے۔ جیسے ہی نور جہاں نے لتا کو دیکھا وہ دوڑتے ہوئے آئیں اور لتا کو زور سے گلے لگا لیا۔ دونوں کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اور ہم لوگ بھی جو یہ نظارہ دیکھ رہے تھے اپنے آنسو نہیں روک پائے۔ یہاں تک کہ دونوں طرف کے فوجی بھی رونے لگے۔ نور جہاں لتا کے لیے لاہور سے مٹھائی اور بریانی لائی تھیں۔ نور جہاں کے شوہر بھی ان کے ساتھ تھے اور لتا کے ساتھ ان کی بہنیں اوشا اور مینا بھی تھیں۔''

یوں تو لتا منگیشکر نے سبھی گلوکاروں کے ساتھ گانے گائے لیکن محمد رفیع کے ساتھ ان کے گانے کو سب سے زیادہ پسند کیا گیا۔ رفیع کے بارے میں لتا نے ایک دلچسپ قصہ سنایا تھا۔ ایک بار میں اور رفیع صاحب اسٹیج پر گا رہے تھے۔ گانے کی لائن تھی 'ایسے ہنس ہنس کے نہ دیکھا کرو تم سب کی طرف، لوگ ایسی ہی اداؤں پہ فدا ہوتے ہیں' رفیع صاحب نے پڑھا 'لوگ ایسی ہی فداؤں پہ ادا ہوتے ہیں' یہ سن کر لوگ قہقہے لگا کر ہنسنے لگے۔ رفیع صاحب بھی ہنسنے لگے اور مجھے بھی ہنسی آگئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم اس گانے کو پورا ہی نہیں کر پائے اور منتظمین کو پردہ گرانا پڑا۔ موسیقی کار سچن دیو برمن بھی لتا کو بہت پسند کرتے تھے۔ وہ جب بھی ان کے گانے سے خوش ہوتے تھے ان کی کمر تھپتھپاتے تھے اور انہیں پان پیش کرتے تھے۔ وہ پان کے کافی شوقین تھے اور پاس میں پاندان بھی رہتا تھا۔ لیکن وہ کسی کو بھی اپنا پان نہیں دیتے تھے۔ اور اگر وہ کسی کو پان دیں تو وہ انسان ان کو بہت زیادہ عزیز ہوتا۔ لتا نے کبھی شادی نہیں کی لیکن ان کی زندگی ایک ملکہ کی مانند گزری۔ موسیقی کی دنیا میں بالخصوص گلوکارہ کی صورت میں انھوں نے طویل عرصے تک بادشاہت کی ہے اور کروڑوں کی ملکیت بھی حاصل کی۔

ایک ذرائع سے موصول خبر کے مطابق انھوں تقریباً 50 ملین امریکی ڈالر کی ثروت جمع کی ہے جس کی ہندوستانی میزان کل تین سو ستر کروڑ روپے ہوتے ہیں۔ اگر ان کی جمع پونجی کا اوسط نکالیں تو فی سال کل چھ کروڑ روپے کماتی تھیں۔ یہ بھی مشہور ہے کہ ان کی پہلی کمائی صرف پچیس روپے تھی۔ ان کا گھر جنوبی ممبئی کے فیڈر روڈ پر ہے جس کا نام 'پربھو کنج بھون' ہے۔ وہ اسی مکان میں رہا کرتی تھیں۔ ذرائع کے مطابق اس مکان کی قیمت کروڑوں روپے ہے۔ موصوفہ کار گاڑی کی بھی کافی شوقین تھیں اس لیے ان کے پاس کئی مہنگی اور معتبر کمپنیوں کی گاڑیاں تھیں۔ فلم 'ویر زارہ' کی ریلیز کے بعد اس کے ہدایت کار یش چوپڑا نے انہیں ایک مہنگی گاڑی بطور تحفے میں دیا تھا۔ ایک عظیم گلوکارہ اور کروڑوں کا مالکانہ حق رکھنے والی موصوفہ کی روزمرہ کی زندگی بالکل سادگی بھری اور عام سی تھی۔ اور آخر میں اپنی بات کا اختتام کیفی اعظمی کے اس شعر سے کرتا ہوں۔

ایک سورج تھا کہ تاروں کے گھرانے سے اٹھا
آنکھ حیراں ہے کہ کیا شخص زمانے سے اٹھا

■

Dr. Md. Sharib
Vill.: Masihani, Tola: Mandea
P.S: Chhatarpur- 8221413
Distt.: Palamu (Jharkhand)
Mob.9835938234

لتا جی کی گائیکی میں اردو تلفظ کی خوشبو

نازیہ

اردوالفاظ کو صحیح طورسے ادا کرنے کے لیے لتامنگیشکر نے اپنے کیرئیر کے آغاز میں ہی دھیان دینا شروع کردیا. وہ یہ بات سمجھ چکی تھیں کہ اردو تلفظ پر عبور حاصل کرنے کے لیے اردوکے چند الفاظ کے تلفظ کو درست کرلینا کافی نہیں ہے بلکہ اردو زبان جاننا بھی ضروری ہے. اس لیے انھوں نے نہ صرف اردو کے حروف کی ادائیگی کی مشق کی بلکہ اردو کے رسم الخط کو بھی سیکھا.

گزشتہ چند دہائیوں کے دوران جن خاتون گلوکاروں نے ہندو بیرون ہند اپنی آواز کا جادو جگایا، اور جنھیں عوام وخواص میں بہت زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی ان میں لتا منگیشکر کا نام سرفہرست ہے۔ لتا منگیشکر نے تقریباً سات دہائیوں تک ہندی سنیما کو اپنی آواز دی اور چار نسلوں کو اپنے گائے ہوئے نغموں سے مسحور کیا۔ نہایت کم عمری ہی میں وہ مقبولیت کے زینے چڑھنے لگی تھیں۔ تقریباً بیس سال کی عمر میں ان کی شہرت دور دور تک پھیل گئی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کلاسیکی نغموں کی گونج ہر طرف سنائی دیتی تھی، لتا جی نے ان نغموں کو بہترین انداز میں گایا اور لوگوں کا دل جیت لیا۔ اس کے بعد بدلتے وقت اور ماحول میں وہ اپنی گائیکی کو ڈھالتی رہیں اور ایک کے بعد ایک کامیاب نغمے ہندی سنیما کو دیتی رہیں۔ یہاں تک کہ جب بیسویں صدی کے اواخر اور اکیسویں صدی کے اوائل میں نئے انداز کے نغموں کا رواج بڑھا تب بھی لتا جی کی مقبولیت میں کمی نہیں آئی اور ان کے اس دور کے گائے ہوئے گانوں کو بھی پسند کیا گیا۔ دراصل لتا جی حقیقی معنوں میں فنکار تھیں، ان کی آواز میں جادو جیسی تاثیر تھی اور ان کا ترنم دل وروح میں اترنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس لیے وقت کا اتار چڑھاؤ ان کے فن کو متاثر نہ کر سکا بلکہ جیسے جیسے وقت بڑھتا گیا، اس میں اور زیادہ نکھار پیدا ہوتا گیا۔

لتا منگیشکر کی گائیکی کو جن اسباب کی بنیاد پر مقبولیت حاصل ہوئی ان میں ایک سبب ان کا اردو تلفظ تھا۔ اسی لیے انھوں نے گیتوں میں مستعمل اردو حروف والفاظ کی بہترین ادائیگی کی۔ اردو زبان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں خوبصورت الفاظ کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ اگر اردو الفاظ کو سلیقے سے گفتگو میں برتا جائے، تو اس میں لطف پیدا ہوجاتا ہے، تحریر کی لڑی میں پرویا جائے تو تحریر کی خوبصورتی بڑھ جاتی ہے اور جب ان لفظوں کو شاعری کے قالب میں ڈھالا جاتا ہے تو شاعری کے حسن میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ہندی تحریروں، تقریروں، نظموں اور گیتوں میں بھی اردو الفاظ کا خوب استعمال کیا جاتا ہے۔ اردو کی اسی شیرینی کو محسوس کرتے ہوئے ہندی سنیما بھی ہندی فلموں کے مکالموں اور گیتوں میں اردو الفاظ کے استعمال میں کسی سے پیچھے نہیں رہا، خاص طور سے ہندی سنیما میں ابتدائی کئی دہائیوں تک تو اردو کا ہی دبدبہ قائم تھا۔ اس وقت کے نغمے لکھنے والے شعرا ساحر لدھانوی، شکیل بدایونی، مجروح سلطانپوری اردو کے عظیم شاعر تھے۔ یہ تمام حضرات غزل گوئی میں بھی اپنا مقام رکھتے ہیں۔ ان کے لکھے گئے نغموں کی خاص بات یہ ہے کہ انھوں نے نغموں میں بھی شاعری کے معیار سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ اس وقت کے مقبول نغمے سنیے، آپ کو ان میں بہترین شاعری نظر آئے گی اور یہ بھی دکھائی دے گا کہ شعرا نے نغموں کی لڑی میں اردو کے خالص اور خوبصورت لفظوں کو کس حسن وخوبی کے ساتھ پرویا ہے۔ لتا منگیشکر کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ان لفظوں کا تلفظ بہت خوبصورت انداز میں کیا ہے، جس کی وجہ سے ان نغموں میں جان پڑگئی۔

تلفظ کی سطح پر اردو الفاظ میں بہت نزاکت پائی جاتی ہے۔ اگر الفاظ کا تلفظ درست طور پر کیا جاتا ہے تو وہ سننے میں اچھے محسوس ہوتے ہیں لیکن اگر ان کی ادائیگی میں بے احتیاطی برتی جاتی ہے تو ان کی ساری کشش جاتی رہتی ہے اور وہ بذاتہ پرکشش ہونے کے باوجود بھدے معلوم ہوتے ہیں۔ لتا منگیشکر اس راز سے واقف ہوگئی تھیں، اس لیے انھوں نے اردو لفظوں کی ادائیگی پر بہت زور صرف کیا اور اپنی گائیکی میں اس طرح ان کو ادا کیا کہ ان کا حسن دوبالا ہوگیا۔ اس کے برعکس اگر وہ تلفظ پر توجہ نہ دیتیں اور ان کی ادائیگی میں احتیاط سے کام نہ لیتیں تو بہترین آواز وانداز کے باوجود اردو کے وہ لفظ اتنا مزہ نہ دیتے اور اس سے ان کی گائیکی متاثر ہوسکتی تھی۔

اردو الفاظ کو صحیح طور سے ادا کرنے کے لیے لتا منگیشکر نے اپنے کیریئر کے آغاز میں ہی دھیان دینا شروع کردیا۔ وہ یہ بات سمجھ چکی تھیں کہ اردو تلفظ پر عبور حاصل کرنے کے لیے اردو کے چند الفاظ کے تلفظ کو درست کرلینا کافی نہیں ہے بلکہ اردو زبان جاننا بھی ضروری ہے۔ اس لیے انھوں نے نہ صرف اردو کے حروف کی ادائیگی کی مشق کی بلکہ اردو کے رسم الخط کو بھی سیکھا۔ اس لیے کہ رسم الخط حروف کی ادائیگی اور لفظوں کے تلفظ میں معاون ثابت ہوتا ہے، نیز اردو زبان کے مزاج ومذاق سے بھی قریب تر کردیتا ہے۔ اچھی بات یہ ہوئی کہ انھیں ایک مولوی صاحب کی خدمات حاصل ہوگئیں۔ مولوی صاحب نے انھیں اردو زبان سکھائی اور ان کے تلفظ کو درست کرادیا۔ اردو سیکھ لینے کے بعد اردو سے انھیں خاصا لگاؤ ہوگیا تھا۔ اس کا اعتراف لتا جی نے ماہنامہ 'شمع' کے ستمبر 1967 کے شمارے میں شائع ایک انٹرویو میں کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''بلاشبہ انھوں نے تمیں مختلف زبانوں میں گیتوں کو اپنی آواز دی ہے مگر جو بلند وبالا وقار ان کے وجود میں اردو کا ہے، اس کا اپنا مزہ ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ مراٹھی ایک طرح سے ان کی مادری زبان کی طرح تھی مگر جس طرح سے اردو کو مولوی عبدالصمد اور پھر بعد میں دلیپ کمار سے سیکھا، وہ ان کے دل کی زبان بن گئی۔''

لتا منگیشکر کے لیے ج، خ، ز، ش، ع، غ، ق، جیسے حروف کی ادائیگی نہایت آسان تھی۔ یہ بات ہم ان کے گانے سنتے ہوئے بآسانی محسوس کرسکتے ہیں۔ اگرچہ

دوسری اور بھی بہت سی گلوکارہ ایسی ہیں جو اردو الفاظ کا صحیح تلفظ کرنے کی کوشش کرتی ہیں، لیکن جس خوبصورتی کے ساتھ لتا جی ان کی ادائیگی کرتی ہیں، اس کی نظیر نہیں ملتی۔ ان کا گایا ہوا گانا ''ترے بنا زندگی سے کوئی شکوہ تو نہیں'' میں 'ز' کی ادائیگی انھوں نے بہت خوبصورتی کے ساتھ کی ہے۔ تلفظ کی جو نزاکت اردو میں ہوتی ہے، اس کا پورا خیال انھوں نے رکھا ہے۔ 'ز' کو انھوں نے نہ تو 'ذال' کی طرح ادا کیا ہے اور نہ ہی اس کو رگڑ کر ادا کیا ہے اور یہی اردو کے حروف کی ادائیگی کا مزاج بھی ہے۔ اسی گانے میں لفظ 'شکوہ' کی ادائیگی بھی بہت خوبصورت ہے۔ ان کا گایا ہوا گانا 'لگ جا گلے' بہت مشہور ہوا۔ اس گانے کی کئی ایک خصوصیات ہیں۔ یہ گانا لفظ کے اعتبار سے بھی بہت عمدہ ہے اور معنی کے اعتبار سے بھی۔ اس کے علاوہ اسے مزید پرکشش اور موثر لتا جی کی آواز نے بنا دیا ہے کہ سننے والا کھو سا جاتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ایک اور بات جو بہت اہم ہے وہ ہے لتا جی کے ذریعے الفاظ کا خوبصورت تلفظ۔ اس گانے کی یہ لائنیں قابل سماعت ہیں۔

لگ جا گلے کہ پھر یہ حسیں رات ہو نہ ہو

شاید پھر اس جنم میں ملاقات ہو نہ ہو

اس میں لتا جی نے 'شاید' اور 'ملاقات' کا تلفظ بہت خوبصورتی کے ساتھ کیا ہے۔ 'شاید' میں حرف 'ش' توجہ کا حامل ہے۔ اگر اس کی ادائیگی کے وقت 'س' کی آواز نکالی جاتی تو نہ صرف لفظ 'شاید' کی کشش ختم ہو جاتی بلکہ پوری لائن بڑی بھدی سی معلوم ہوتی۔ خاص طور سے یہاں 'ش' کی ادائیگی 'س' کی شکل میں کرنے سے اہل زبان کو تکلیف سے گزرنا پڑتا۔ ایسے ہی لفظ 'ملاقات' بھی تلفظ کے اعتبار سے اپنے اندر بڑی نزاکت رکھتا ہے۔ حرف 'ق' کو لتا جی نے بہت ہی عمدگی کے ساتھ ادا کیا ہے۔ جب کہ بہت سے لوگ 'قاف' کو 'کاف' کی طرح ادا کرتے ہیں لیکن گانے کے اندر جس میں ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف اہمیت رکھتا ہے، یہاں تک کہ آواز کے زیر و بم کی بھی اپنی اہمیت ہوتی ہے۔ کسی بھی سطح پر ذرا سی چوک نہ صرف ترنم کو متاثر کر سکتی ہے بلکہ اس کی خوبصورتی پر بھی اثر انداز ہو سکتی ہے۔ گائیکی میں ایک اور دقت یہ ہوتی ہے کہ کئی مرتبہ لفظ کی صحیح طور پر ادائیگی کی صورت میں ترنم یا سر کے متاثر ہونے کا خوف دامن گیر رہتا ہے اور اگر سر چلا جاتا ہے تو پھر بات ہی خراب ہو جاتی ہے، اس لیے حرف کی ادائیگی کے وقت اس بات پر بھی دھیان دینا پڑتا ہے کہ کہیں ادائیگی کے سبب سر ہی غائب نہ ہو جائے۔ اب یہاں اگر 'ملاقات' کے حرف 'ق' کو زیادہ حلق سے رگڑ کر نکالا جائے گا تو سر یا ترنم کے متاثر ہونے کا خدشہ ہے اور اگر 'قاف' کی آواز کو 'کاف' کی آواز میں ادا کیا جائے گا تو لفظ کی خوبصورتی کا ختم ہونا یقینی ہے۔ ایسے میں کمال یہ ہے کہ حرف 'قاف' بھی ادا ہو جائے، سر بھی غائب نہ ہو یعنی ترنم کی کشش بھی باقی رہے اور لفظ کا حسن بھی ختم نہ ہو۔

ایسے مواقع پر لتا منگیشکر بہت خوبصورتی کے ساتھ اپنا رول نبھاتی ہیں۔ لفظوں کی صحیح ادائیگی کرتی ہیں، اور ترنم یا سر کو بھی متاثر نہیں ہونے دیتیں۔ جبکہ کتنے گلوکار ایسے مواقع پر پوری طرح کامیاب نہیں ہو پاتے۔

لتا جی کا گایا ہوا ایک اور گانا 'اک پیار کا نغمہ ہے' بھی بہت مشہور ہے۔ اس گانے میں مستعمل لفظ 'نغمہ' کا حرف 'غ' ادائیگی کے اعتبار سے توجہ طلب ہے۔ لتا جی نے 'غین' کو اس کے صحیح مخرج کے ساتھ ادا کیا ہے۔ اس گانے کو نیتی موہن نامی ایک گلوکارہ نے بھی نقل کرتے ہوئے گایا ہے مگر وہ حرف 'غین' کو ٹھیک سے ادا نہ کر پائیں اور لفظ 'نغمہ' کا 'غین' حرف 'گاف' میں بدل گیا، اس طرح ان کی زبان سے یہ لفظ 'نگمہ' بن کر نکلا۔ ظاہر ہے کہ جب لفظ کا تلفظ ہی ٹھیک سے نہ کیا جائے تو اس میں کشش کہاں باقی رہے گی۔

فلم 'سوتن' کا گیت 'شاید میری شادی کا خیال۔ دل میں آیا ہے'' لتا منگیشکر نے گایا ہے۔ یہ گانا شوخی بھرے انداز میں گایا گیا ہے۔ اس گانے کی خوبی یہ ہے کہ اسے سننے والا سنتے سنتے خود بھی گانے لگتا ہے۔ اس نغمے کا گنگنانا 'شاید میری شادی کا خیال' تلفظ کے اعتبار سے ہر ایک کے لیے آسان نہیں ہے۔ کیونکہ تین الفاظ شاید، شادی اور خیال ادائیگی کی سطح پر اپنے اندر نزاکت رکھتے ہیں۔ اردو تلفظ پر عبور رکھنے والوں کے لیے ان الفاظ کا تلفظ کچھ بھی دشوار نہیں مگر جنھیں اردو نہ آتی ہو، ان کے لیے یقیناً متواتر طور پر ان تینوں لفظوں کا صحیح تلفظ دشوار ہوگا، لیکن لتا جی نے ان لفظوں کا یکے بعد دیگرے اتنا شاندار تلفظ کیا ہے کہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

لتا منگیشکر کا گایا ہوا گیت 'اے میرے وطن کے لوگو!' عام طور پر ان محفلوں میں خوب سننے کو ملتا ہے جہاں وطن سے محبت کا اظہار کیا جاتا ہے۔ لتا نے اس گانے کو جس دل سے گایا ہے، اس کا اندازہ تو اسی وقت ہو جاتا ہے جب اس کی چند لائنیں کانوں میں پڑتی ہیں۔ اس گیت کے الفاظ، تقسیم، ترنم، آواز، موسیقی سب کچھ بہت عمدہ ہے۔ اسی لیے یہ گیت سامعین کی سماعتوں کی حدود سے ٹکرا کر واپس نہیں آتا بلکہ دل کی گہرائیوں میں اترتا جاتا ہے اور سننے والے کو ایسے ماحول میں لے جاتا ہے، جس میں ہر طرح کی قربانی کے جذبات موجزن ہونے لگتے ہیں۔ اس گیت کو گاتے وقت لتا جی نے اپنے فن کا ہر اعتبار سے شاندار مظاہرہ کیا ہے اور اس گیت کی روح میں اپنی روح ملا دی ہے، لیکن ایک اور چیز یہاں قابل توجہ یہ ہے کہ انھوں نے اس گیت میں استعمال ہونے والے تمام الفاظ کا تلفظ نہایت خوبی کے ساتھ کیا ہے کہ اگر اس پہلو سے اس گیت پر غور کیا جائے تو اس کا مزہ دو چند ہو جاتا ہے۔ اس گیت میں اردو کے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں، وہ اس طرح ہیں ذرا، قربانی، شہید، خطرہ، آزادی، سرحد، خون، ہندوستانی، بندوق، ہوش، خوش، سفر، دیوانے وغیرہ۔ ان تمام ہی الفاظ کا تلفظ لتا جی کے ذریعے بہترین انداز میں کیا گیا ہے۔ خاص طور پر یہ تین الفاظ ذرا، قربانی اور شہید کا تکرار اس گیت میں بار بار ہوتا ہے اور تینوں لفظوں کی ادائیگی نہایت خوبصورت ہے۔ اگر ان کے تلفظ میں ذرا بھی کمی رہ جاتی تو شاید اس گیت کی کشش پر بھی فرق پڑتا اور جوش و تاثیر میں بھی کمی واقع ہو جاتی۔ لیکن لتا منگیشکر نے لفظوں کے تلفظ کی نزاکت کو ہر جگہ ملحوظ رکھا۔ یہی لتا کا کمال ہے۔ اس گیت کو اور بھی بہت سے گلوکار موقع بہ موقع گاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ اسی انداز میں گانے کی کوشش کرتے ہیں جس انداز میں لتا جی نے اسے گایا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان میں سے کتنے تو بالکل اسی انداز، لہجے، ترنم وغیرہ کو اختیار کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن پھر بھی ان کا گایا ہوا گیت وہ تاثیر نہیں چھوڑتا جو لتا جی کا گایا ہوا گیت چھوڑتا ہے، اس کی دو بنیادی وجوہات ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان کے پاس لتا جی کی آواز نہیں ہوتی اور دوسری وجہ الفاظ کا صحیح تلفظ وہ نہیں کر پاتے۔ لفظ 'قربانی' کے 'ق' کو جس طرح لتا جی نے ادا کیا ہے، دوسرے گلوکار اس طرح ادا کرنے سے قاصر رہتے ہیں، ایسے ہی اور کئی لفظوں کی ادائیگی میں کمیاں رہ جاتی ہیں۔ اس طرح کی بے شمار مثالیں ہمیں لتا جی کے گائے ہوئے گیتوں میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ گویا کہ لتا جی کے ذریعے گائے ہوئے گیتوں کو زندگی اور تازگی بخشنے میں ان کے اردو تلفظ کا بہت بڑا دخل رہا ہے۔ جس شخص کو اردو تلفظ پر گرفت حاصل ہو جاتی ہے، اس کے لیے دوسری زبانوں کے الفاظ کا تلفظ بھی آسان ہو جاتا ہے۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ لتا جی اپنی مادری زبان مراٹھی ہونے کے باوجود ہر زبان کے لفظوں کا تلفظ بہتر طور پر کرتی ہیں کہ انھوں نے اردو تلفظ پر عبور حاصل کر لیا تھا۔ بہر کیف لتا منگیشکر کا اردو زبان، اردو رسم الخط اور اردو تلفظ سے گہرا رشتہ تھا جو ان کے گیتوں کو سن کر محسوس کیا جا سکتا ہے۔

■

Dr. Nazia
House 186, Street No 136
Jafrabad, Delhi-53
Mob:9717153680

حنا آفریں

دورانِ تدریس

بچوں کے نفسیاتی مسائل اور حل

علم نفسیات یعنی Psychology کی اصطلاح یونانی زبان سے ماخوذ ہے۔ یہ دو الفاظ Psyche یعنی روح اور Logos یعنی علم سے مرکب ہے۔ اس طرح سائیکولوجی کے معنی ہوئے روح کا مطالعہ۔ جدید دور کے ماہرین نفسیات نے اسے 'مطالعۂ انسانی کردار' کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ نفسیات ایک ایسی سائنس ہے جو انسانی کردار کے تمام پہلوؤں کا مطالعہ کرتی ہے۔ اس کے دائرے میں انسانی کردار کی ظاہری اور باطنی، شعوری اور غیر شعوری تمام حالتیں شامل ہوتی ہیں۔ غرض نفسیات کے دائرے میں وہ تمام مسائل آ جاتے ہیں جن کا تعلق انسانی شخصیت، کردار اور انسانی زندگی سے ہے۔ نفسیات کی اہم ذیلی شاخیں درج ذیل ہیں:

* نفسیاتِ اطفال Child Psychology
* سماجی نفسیات Social Psychology
* نفسیاتِ اختلال Abnormal Psychology
* طبی نفسیات Clinical Psychology
* صنعتی نفسیات Industrial Psychology
* تعلیمی نفسیات Educational Psychology

(تعلیمی نفسیات کے نئے زاویے۔ مسرت زمانی، ابن فرید ص 24 تا 25)

جن میں تعلیمی نفسیات ایک اہم شاخ ہے۔ درس و تدریس میں ایک معلم اس شاخ کے مطالعے کے ذریعے اپنی تدریس کو موثر اور دلچسپ بناتا ہے۔

تعلم کے حصول کے لیے سیکھنے اور سکھانے والے دونوں ایک ہی سکہ کے دو رُخ ہیں۔ ایک اچھا استاد کمرۂ جماعت میں اپنے بچوں کو تبھی علم سکھا سکتا ہے جب وہ ان کی نفسیات سے بخوبی واقف ہو۔ مثلاً کوئی طالب علم درجے میں شرارت کرتا ہو یا خاموش رہتا ہو یا سوال جواب میں حصہ نہ لیتا ہو تو ایسے طالب علم کی نفسیات کا مطالعہ کر کے استاد اس کو سکھانے کا عمل کرتا ہے۔ کوئی بھی دو طالب علم ایک جیسے نہیں ہوتے بلکہ مختلف صفات کے مالک ہوتے ہیں۔ کچھ طالب علم دوسرے طالب علموں کے بجائے زیادہ ذہین ہوتے ہیں جس کے سبب انھیں خصوصی تربیت اور تحریک کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب کہ کچھ بچے کند ذہن ہوتے ہیں انھیں عام بچوں کی سطح تک پہنچنے کے لیے خصوصی توجہ اور تربیت درپیش رہتی ہے۔

ذہانت کی طرح طلبہ کی شخصیت میں بھی فرق پایا جاتا ہے۔ کچھ بچے سیماب صفت ہوتے ہیں جو ایک جگہ آرام سے نہیں بیٹھ سکتے اور نہ ہی ایک کام پر زیادہ وقت اور توجہ دے سکتے ہیں۔ اس کے برعکس کچھ بچے خاموش طبع یا شرمیلی طبیعت کے ہوتے ہیں جو درجے میں ہونے والی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ نہیں لیتے۔ ایسے بچوں کو دلچسپ اور تحریک پیدا کرنے والی سرگرمیوں میں رکھا جائے تو وہ اپنے خول سے نکل کر دوسرے طلبہ کے ساتھ گھل مل سکتے ہیں۔ جب کہ سیماب صفت بچوں کو مختلف سرگرمیوں میں مصروف رکھا جائے تو وہ درجے میں شرارت نہ کر کے اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کریں گے۔

اسکولی سطح پر تدریس میں نفسیات کے علم کی اس لیے زیادہ اہمیت ہے کہ معلم کو ناپختہ ذہن کے بچوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ تعلیمی عمل کے دوران معلم کو جو بھی امور اور مسائل پیش آتے ہیں ان کے حل میں نفسیات کا علم مددگار ثابت ہوتا ہے۔ تعلم کا عمل اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک استاد کو بچوں کی نشو و نما کے متعلق معلومات حاصل نہ ہوں۔ معلم کو بچوں کی بالیدگی، نشو و نما اور اس کے مختلف درجوں میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں اور بچے کی خصوصیات کا علم بے حد ضروری ہے۔ کیوں کہ بچے میں تبدیلیاں ایک دم رونما نہیں ہوتیں بلکہ جسمانی، ذہنی، جذباتی اور معاشرتی تبدیلیاں عمر کے مختلف حصوں میں متنوع رفتار سے آہستہ آہستہ ہوتی ہیں اور یہ سلسلہ مخصوص عرصے تک جاری رہتا ہے۔ ماہرین نفسیات نے اس حقیقت کے پیش نظر انسانی بالیدگی اور نشو و نما کے مختلف مدارج مقرر کیے ہیں:

1 استقرارِ حمل اور قبل از پیدائش کا دور
2 عہدِ طفلی یا ابتدائی بچپن کا دور (پیدائش تا 5,6 سال)
3 بچپن کا دور (6,7 تا 12,13 سال)
4 بلوغت یا عنفوانِ شباب کا دور (13 تا 24، 25 سال)
5 جوانی کا دور (25 تا 45 سال)
6 بڑھاپے کا دور (45 تا موت)

(تعلیمی نفسیات اور نصاب: ملک محمد موسیٰ، شاز یہ رشید، ص 53 تا 54)

غرض تعلیم کے لیے بچہ کس حالت میں تیار ہوتا ہے؟ اس میں مدد دینے والے عوامل سے کیسے کام لیا جا سکتا ہے؟ ان سب سوالات کے جوابات معلم تعلیمی نفسیات کے ذریعے حاصل کرتا ہے۔ اس لیے معلم کے لیے ضروری ہے کہ وہ تمام اصولوں کا فہم و ادراک رکھتا ہو۔

ذہانت کا تعلم سے گہرا رشتہ ہے۔ تجربات اور مشاہدات سے معلوم ہوتا ہے کہ ذہین طلبہ صحت مند معیاری سوچ

رکھتے ہیں۔ استاد کی بات فوراً سمجھتے ہیں اور اپنے ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ذہانت کے لحاظ سے بچوں کو تین بڑے درجوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

(1) ذہین بچے (2) متوسط ذہن کے بچے (3) کند ذہن بچے

بچوں کے انفرادی اختلافات کے سبب ان کے رجحانات مختلف ہوتے ہیں۔ ہر بچہ اپنا ایک الگ مزاج اور شخصیت رکھتا ہے۔ ہر ایک کے میلانات منفرد ہوتے ہیں۔ انفرادی اختلافات کی مندرجہ ذیل وجوہات اور عوامل قابل غور ہیں:

1. توارث کے تعلق سے انفرادی اختلافات
2. بالیدگی کے حوالے سے انفرادی اختلافات
3. ماحول کے تعلق سے انفرادی اختلافات
4. طبعی عمر کے لحاظ سے انفرادی اختلافات
5. قدرتی صلاحیتوں کے حوالے سے انفرادی اختلافات
6. ذہن کے تعلق سے انفرادی اختلافات
7. جسمانی مہارتوں کے حوالے سے انفرادی اختلافات
8. جنس کے لحاظ سے انفرادی اختلافات
9. نسل کے لحاظ سے انفرادی اختلافات
10. طبقاتی لحاظ سے انفرادی اختلافات

(ایضاً، ص 175)

انفرادی اختلافات کے اسباب میں توارث اور ماحول کا اہم رول ہوتا ہے۔ توارث سے مراد ایسے عوامل ہیں جو بچے میں جبلی اور خلقی طور پر اس کی پیدائش کے وقت موجود ہوتے ہیں۔ جب کہ ماحول سے مراد وہ خارجی اسباب ہیں جن سے انسان کسی نہ کسی طور سے اثر انداز ہوتا ہے۔ کمرۂ جماعت میں بچے رنگ و خو، شکل و صورت، قد و قامت اور خد و خال میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ موروثی صفات کی بنیاد پر بچے اپنے ماحول سے کچھ اثرات قبول کرتے ہیں جو ان کی شخصیت کا ضروری حصہ بن جاتے ہیں۔ بچوں میں بعض بیماریاں موروثی ہوتی ہیں جو ان کی تعلیم و تربیت پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ بعض نقائص مثلاً بصارت یا سماعت کی کمی بھی بچوں کے نفسیاتی اعمال پر برا اثر ڈالتے ہیں۔

بچوں میں بالیدگی کے حوالے سے بھی انفرادی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ بالیدگی کا عمل مختلف افراد میں مختلف رفتار سے ہوتا ہے۔ بعض بچوں میں بالیدگی کا عمل تیز ہوتا ہے تو بعض بچوں میں سست۔ یہی وجہ ہے کہ اسکول میں ان کے رویے اور تدریس کے عمل میں اختلاف نظر آئے گا۔ جس سے استاد کو تدریس کے دوران دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

بیشتر بچے اپنے والدین اور آبا و اجداد سے صفات حاصل کرتے ہیں مگر ان کی نشو و نما میں ماحول کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ کیونکہ بچے اپنے آس پاس کے ماحول سے کافی کچھ سیکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مناسب ماحول میں ہی بچوں کی فطری صلاحیتوں کو بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔ بچوں کی تعلیم و تربیت کا دارومدار ان کے معاشرتی ماحول کے علاوہ گھر کے ماحول پر بھی منحصر ہے جو معاشرتی ماحول سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ بچوں کی تعلیمی سرگرمیوں میں شمولیت، ان کی انفرادی دلچسپیاں، تعاون کی عادت، مطالعہ کرنے کی عادت اور اسکول کے بارے میں ان کا رویہ وغیرہ سب گھر کے ماحول کی عکاسی کرتے ہیں۔ چونکہ طلبہ مختلف معاشرتی ماحول سے اسکول میں آتے ہیں اس لیے ان کی دلچسپیاں، پسند اور ناپسند ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں جو دورانِ تدریس استاد کے لیے مسائل پیدا کرتی ہیں۔

جب بچہ 5 یا 6 سال کی عمر میں اسکول میں داخل کیا جاتا ہے تو یہ توقع کی جاتی ہے کہ عمر بڑھنے کے ساتھ اس کی تعلیمی رفتار بھی بڑھتی رہے گی۔ ایک ہی عمر کے بچوں کو ایک جماعت میں رکھنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ بچے ذہنی، جسمانی، معاشرتی اور جذباتی پختگی میں ایک جیسے ہوں گے۔ لہٰذا ایک طرح کے تعلیمی پروگرام سے فائدہ اٹھا سکیں گے۔ اگر ایک بچہ تعلیمی اعتبار سے کمزور ہے تو اس سے ظاہر ہوا کہ اس کی نشو و نما میں کہیں خامی رہ گئی ہے جو وہ دوسرے بچوں کے ساتھ کام نہیں کر پا رہا ہے۔ لیکن ایسی صورتحال کم ہی دیکھنے میں آتی ہے۔ اس طرح کی صورتحال سے بھی استاد کو کمرۂ جماعت میں تدریس کے دوران دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

قدرتی صلاحیتوں کے حوالے سے بھی بچوں میں انفرادی اختلافات پائے جاتے ہیں جو کمرۂ جماعت میں تدریس کے دوران مسئلہ پیدا کرتے ہیں۔ کسی ایک وصف میں ایک فرد کا دوسرے سے اختلاف ہو سکتا ہے اور ایک فرد میں کئی اوصاف کا بھی اختلاف ہو سکتا ہے۔

ذہنی اختلاف کی بنیاد پر مشہور ماہرین نفسیات ٹرمن اور بینے نے بچوں کی عام ذہانت کی پیمائش کے بعد ان کو کئی گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔ جو بچے عام بچوں سے ذہنی اعتبار سے کم ہوتے ہیں ان کے لیے مخصوص اسکول یا ادارے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ جن بچوں کا مقیاس ذہانت 80 اور 90 کے درمیان ہوتا ہے وہ عام نوعیت کے تدریسی کام سمجھ تو لیتے ہیں مگر ذہین بچوں کے ساتھ ان کا پڑھنا

بچوں کی تعلیمی سرگرمیوں میں شمولیت، ان کی انفرادی دلچسپیاں، تعاون کی عادت، مطالعہ کرنے کی عادت اور اسکول کے بارے میں ان کا رویہ وغیرہ سب گھر کے ماحول کی عکاسی کرتے ہیں۔ چونکہ طلبہ مختلف معاشرتی ماحول سے اسکول میں آتے ہیں اس لیے ان کی دلچسپیاں، پسند اور نا پسند ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں جو دوران تدریس استاد کے لیے مسائل پیدا کرتی ہیں۔

مشکل ہو جاتا ہے۔ جن کا مقیاس ذہانت 90 اور 110 تک ہوتا ہے۔ اگر انھیں سازگار ماحول ملے تو وہ ترقی کر سکتے ہیں مگر ایک حد سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ جن بچوں کا مقیاس ذہانت 120 سے اوپر ہوتا ہے ان کے ترقی کرنے کے واضح امکانات ہوتے ہیں مگر غیر معمولی ذہانت کے سبب انھیں کم ذہین بچوں کے ساتھ پڑھانا ایک مسئلہ بن جاتا ہے۔

عام طور پر بچوں میں جسمانی مہارتوں میں کسی کام کو انجام دینے کی صلاحیت عمر کے ساتھ تبدیل ہوتی ہے۔ کسی کام پر توجہ مرکوز کرنے کی قوت، مختلف اعضا کے کام کرنے کی صلاحیت، ضبط اور استقامت وغیرہ ساری کیفیات میں تبدیلی عمر کے ساتھ واقع ہوتی ہے۔ لہٰذا بچے جسمانی قابلیت کے لحاظ سے بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔

جنس کے حوالے سے بھی انفرادی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ عام مشاہدہ ہے کہ لڑکیاں یادداشت میں لڑکوں سے بہتر ہوتی ہیں۔ لڑکیاں لڑکوں کے مقابلے میں اسکول کا کام خوب کرتی ہیں اور ذاتی باتوں میں دلچسپی لیتی ہیں۔ جب کہ لڑکے اس کے برعکس حساب میں زیادہ اچھے ہوتے ہیں اور وہ کھیلوں اور دوسری سرگرمیوں میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے بھی کمرۂ جماعت میں تدریس کے دوران مسائل پیدا ہوتے ہیں۔

نسلوں کے اعتبار سے بھی فرد میں اختلافات پائے جاتے ہیں۔ یہ خصوصیات انھیں اپنے آبا و اجداد سے ملتی ہیں۔ یہ اختلافات جسمانی، ذہنی اور معاشرتی کسی بھی قسم کے ہو سکتے ہیں۔

طبقاتی لحاظ سے بھی انفرادی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ معاشرے کو تین طبقوں یعنی اعلیٰ، متوسط اور پسماندہ کے خانوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ طلبہ کا جس طبقے سے تعلق ہوتا ہے وہ اسی کے مطابق اپنی گھریلو زندگی، معاشرتی

> ذهنی طور پر پسمانده طلبه کے لیے ایسا نصاب یا مضامین ترتیب دینا هوں گے که جو ان کے لیے کار آمد اور مفید ثابت هوں. مضامین یا سرگرمیوں کا انتخاب کرتے وقت ان کی جسمانی نشو ونما اور صلاحیت کو مد نظر رکھا جائے تو ان کی بهتر رهنمائی هو سکتی هے. ایسے طلبه کے لیے کردارسازی، شخصیت کی نشو ونما اور معاشرتی ماحول کے ساته بهتر مطابقت پیدا کرنے والی سرگرمیوں کو اولیت دی جائے. ذهنی طور پر پسمانده بچوں کے بارے میں معلم کے لیے ضروری هے که وه مکمل معلومات رکھتا هو. صحیح معلومات کے ادراک کے بغیر ان کی تعلیم و تربیت کا کامیاب هونا ممکن نهیں.

سرگرمیاں، لباس وخوراک، عادات واطوار اختیار کرتے ہیں۔ ہر طبقے کی اپنی معاشرتی اقدار اور خاص ذہنی معیار ہوتا ہے جس کے سبب کمرۂ جماعت میں تدریس کے دوران معلم کے نزدیک مسائل درپیش ہوتے ہیں۔

معاشی حالات بھی بچوں کی نفسیات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ مضبوط مالی حالات رکھنے والے بچوں کی تمام تر ضروریات کی تکمیل ہوتی ہے۔ علم حاصل کرنے کی راہ میں انھیں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔ جب کہ غریب طالب علم معمولی لباس پہن کر اور معمولی غذا استعمال کرکے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ جن طلبہ کو ٹرانسپورٹ کی آسانیاں ہیں وہ وقت سے تعلیمی اداروں میں آجاتے ہیں۔ جنھیں یہ سہولت حاصل نہیں ہے وہ ہزار دقتیں اٹھا کر تعلیمی اداروں تک پہنچتے ہیں تو انھیں تعلیم کی طرف توجہ دینے کے لیے بڑی محنت اور کوشش کرنا پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ جب یہ بچے گھر واپس جاتے ہیں تو انھیں گھر کے کمزور حالات کی بنا پر محنت مزدوری کرنا پڑتی ہے۔ ظاہر ہے ایسے طلبہ تعلیم کے لیے پورا وقت نہیں دے سکتے۔ ان کے خراب اقتصادی حالات انھیں ذہنی الجھنوں اور پریشانیوں میں مبتلا رکھتے ہیں جو اُن کی جذباتی اور جسمانی صحت کو متاثر کرتے ہیں۔ اس طرح بچوں کے یہ نفسیاتی مسائل تعلیم پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔

جذباتی اختلافات کے سبب کچھ بچے جذباتی طور پر متوازن نہیں رہتے۔ بہت جلد مشتعل ہو جاتے ہیں یا پھر ہر وقت افسردہ اور خاموش رہتے ہیں۔ ان کے یہ جذبات حصول علم میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ معمولی ناکامی یا پھر استاد کی معمولی سرزنش سے مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جن بچوں کو گھر میں مناسب پیار اور محبت نہیں ملتی وہ بھی جذباتی الجھن کا شکار ہو کر یا تو سب سے الگ رہنا چاہتے ہیں یا پھر اپنی شرارتوں یا غصہ سے اسکول کے نظم وضبط اور اساتذہ کے لیے مسائل پیدا کرتے ہیں۔

جسمانی نقائص کی وجہ سے بھی بعض بچے احساسِ کمتری کا شکار ہو کر تعلیمی میدان میں پیچھے رہ جاتے ہیں اور اس طرح وہ استاد کے لیے مسئلہ پیدا کرتے ہیں۔ ایک استاد اگر بچوں میں پائے جانے والے اختلافات سے آگاہ ہوتا ہے اور وہ بچوں کو ان کے انفرادی اختلافات کی بنیاد پر تعلیم دیتا ہے تو اس کی تدریس کامیاب ہوتی ہے ورنہ نہیں۔

بچوں کے یہ انفرادی اختلافات یقیناً اپنا وجود رکھتے ہیں اور انھیں کسی طور پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بچوں کی بہتر تعلیم وتربیت کے لیے ایسے اقدامات اٹھانے چاہیے جن کی بنیاد پر تعلیم کو ان کے لیے فائدہ مند بنایا جا سکے۔

جسمانی صحت اور ذہنی معیار کو ملحوظ رکھتے ہوئے طلبہ کو گروپ میں تعلیم دینا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ مختلف درجے کی ذہنی صلاحیت رکھنے والے بچوں کو ایک گروپ میں شامل کرنے سے بہت سے مسائل سامنے آتے ہیں۔ بوریت کے سبب اعلیٰ درجے کی ذہانت والے طلبہ کی نشو ونما رک جاتی ہے اور کمزور طلبہ تھکان اور احساسِ کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ طلبہ کے گروپ کی تشکیل کسی خاص مضمون یا سرگرمی کے لیے کی جائے تو ہر مضمون اور سرگرمی میں طلبہ اپنی قابلیت اور دلچسپی کے تحت گروپ میں شامل ہو سکیں گے۔ کم از کم نصابی اور ہم نصابی سرگرمیوں کے لیے گروپ بنائے جائیں۔

کسی گروپ کی تشکیل میں مناسب معیار کا انتخاب سوچ سمجھ کر کیا جائے۔ کسی ایک ہی طریقہ اور معیار کو پیش نظر رکھنے سے اس کی اہمیت کم ہو جاتی ہے۔

طلبہ کے گروپ بناتے وقت ان کی معاشرتی اور جذباتی پختگی کو بھی ملحوظ رکھا جائے۔ اساتذہ کو ہر گروپ کی تدریس کے لیے علیٰحدہ علیٰحدہ منصوبے بنانے چاہیے تاکہ وہ ہر گروپ کی اہلیت اور ضرورت پورا کر سکیں۔ گروپ کی تشکیل سے اساتذہ کو بچوں کی انفرادی تعلیم اور توجہ سے متعلق مسئلہ حل کرنے کا موقع ملے گا۔

بچوں کے گروپ جلدی جلدی تبدیل نہیں کرنے چاہیے ورنہ اس کے لیے ان میں اجنبیت پیدا ہوگی اور اس طرح ان کی مشکلات بڑھیں گی۔ اساتذہ کو ہر گروپ کی تدریس کے لیے الگ الگ منصوبہ جات تحریر کرنی ہوں گی تاکہ وہ گروپ کی اہلیت اور تقاضوں کو پورا کر سکیں۔

طلبہ کو آپس میں گروپ میں تقسیم کرتے وقت ان گروپ کے لیے الگ الگ شناختی نشان اس طرح استعمال کرنا چاہیے کہ ان کی کسی کمزوری کا بیان ظاہر نہ ہو سکے۔ مختلف گروپ کے طلبہ کی موجودگی میں معلم کسی گروپ کے کمتر ہونے کی بات نہ کرے۔

ذہین و فطین طلبہ کے لیے ایسا نصابی پروگرام، اضافی مشق کے طور پر تیار کیا جائے کہ جس سے ان کی معلومات، حقائق سے تعلق اور ذہانت کی نشو ونما بڑھ سکے۔ نصاب میں یہ اضافہ طلبہ پر بوجھ کے بجائے ان کی مسرت اور اعتماد کو بڑھاتا ہے۔ ذہین و فطین طلبہ کو خصوصی سرگرمیوں میں مشغول رکھا جائے۔

ذہنی طور پر پسماندہ طلبہ کے لیے ایسا نصاب یا مضامین ترتیب دینا ہوں گے کہ جو ان کے لیے کارآمد اور مفید ثابت ہوں۔ مضامین یا سرگرمیوں کا انتخاب کرتے وقت ان کی جسمانی نشو ونما اور صلاحیت کو مدنظر رکھا جائے تو ان کی بہتر رہنمائی ہو سکتی ہے۔ ایسے طلبہ کے لیے کردار سازی، شخصیت کی نشو ونما اور معاشرتی ماحول کے ساتھ بہتر مطابقت پیدا کرنے والی سرگرمیوں کو اولیت دی جائے۔ ذہنی طور پر پسماندہ بچوں کے بارے میں معلم کے لیے ضروری ہے کہ وہ مکمل معلومات رکھتا ہو۔ صحیح معلومات کے ادراک کے بغیر ان کی تعلیم و تربیت کا کامیاب ہونا ممکن نہیں۔

غرض بچوں کی بہتر تعلیم کے لیے ضروری ہے کہ ان کو موزوں طریقہ ہائے تدریس سے تعلیم دی جائے تاکہ ان کی انفرادی صلاحیتوں کی نشو ونما کا موقع ملے، وہ با اعتماد اور باوقار شہری کی حیثیت سے زندگی گزار سکیں۔

■

Dr. Hina Afreen
Asst. Professor
Academy of Professional Development of
Urdu Medium Teachers
Jamia Millia Islamia
New Delhi - 110025

اشتیاق عالم اعظمی

اردو زبان کا فروغ اور چند مسائل

ایک مشہور امریکی دانشور نوم چومسکی کا کہنا ہے:

If a nation is to be destroyed, there is no need to drop boms on it from aeroplane, just disappear the language of this nation, that nation itself will become perishable.

یعنی کسی قوم کو برباد کرنا ہو تو اُس پر جہازوں سے بم گرانے کی ضرورت نہیں، صرف اُس کی زبان غائب کردو، وہ قوم خود فنا ہو جائے گی۔

اُردو ہندوستان کی شیریں اور ہر دلعزیز زبان ہے۔ یہ زبان سنسکرت اور ہندی کی طرح اِسی ملک میں پیدا ہوئی اور اپنی ارتقائی منزلیں طے کی۔ اردو زبان آج بھی عوام کے قلب و ذہن پر راج کرتی ہے۔ یہ وہ زبان ہے جسے بجا طور پر ہندوستانی کہلانے کا حق حاصل ہوا۔

اردو ایک مشترکہ قومی زبان کی حیثیت رکھتی ہے بلکہ ہماری تہذیب و ثقافت کی شناخت اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی علامت بھی ہے۔ یہ انسانی بھائی چارہ، مذہبی رواداری اور باہمی خیرسگالی کو فروغ دیتی ہے۔

اردو کے فروغ سے متعلق یہ کہنا درست ہوگا کہ ابتدائی دور میں اِس زبان کی ترقی اور ترویج و اشاعت کے حوالے سے اردو کے تہذیبی و سماجی اداروں یعنی حکائی ادب کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اردو کا حکائی ادب (Oral Literature) سے اردو کو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا جس نے زبان کو ہر دلعزیز بنایا اور ساتھ ہی حکائی ادب کی روایت کو قائم کیا۔ یہ دنیا کی واحد زبان ہے جو اتنی زبردست حکائی روایت رکھتی ہے۔ اِس سیاق میں ڈاکٹر ارشد اقبال نے لکھا ہے:

''اردو کی ترویج و اشاعت میں سماجی و ثقافتی اداروں کی بڑی اہمیت ہے۔ حالاں کہ زبان و ادب کے مورّخین نے اِس موضوع کو کبھی لائق اعتنا نہیں سمجھا جبکہ اردو زبان کے فروغ میں سماجی و ثقافتی اداروں کا بڑا رول رہا ہے۔''

جس طرح مشاعروں میں شعرا کی زبان سے عمدہ کلام سن کر زبان زد ہو جاتے ہیں خانقاہوں میں قوالی کی محفلیں سجائی جاتی ہیں۔ عرس کے موقعوں پر بزم سماع کا اہتمام کیا جاتا ہے گو کہ چہار بیت کا رواج اب کم ہو گیا، لیکن ماضی میں اِس نے اردو زبان کی شاعری کو گلی کوچوں میں عوام تک پہنچانے کا کام کیا۔

اِس طرح ہم اردو کی صوفیانہ شاعری سے لطف اندوز ہوتے ہیں بلکہ ہمارے حافظے کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اِن سماجی و تہذیبی اداروں یا اصناف مثلاً مشاعرہ، قوالی، چہار بیت، مرثیہ نگاری مجرے، غزل گائیکی۔ نثر میں داستان گوئی، قصے کہانیاں اور ذِکر کا فن خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

آج کے جدید دور میں پرنٹ میڈیا اور الیکٹرونک میڈیا کو بہت اہم تصور کیا جاتا ہے۔ جمہوریت میں اِسے چوتھے ستون کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کی بڑھتی ہوئی مانگ کی وجہ سے ایک فن اور پیشے کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے، جسے ہم ایک مشن یا ایک صنعت بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس کا تعلق اخبارات، رسائل کی ترتیب اور اشاعت سے ہے جن میں مختلف النوع موضوعات پر مضامین، فیچر، اداریے، خبریں، تجزیے اور تبصرے شائع کیے جاتے ہیں۔

آج کے جدید دور میں اخبارات اور رسائل کے ساتھ ریڈیو، انٹرنیٹ، ٹیلی پرنٹر اور ٹی وی چینلوں کے ذریعے صرف کھیل کود، سیاست یا تجارت کو ہی فروغ نہیں ملتا بلکہ مذکورہ تمام مراحل سے اردو زبان بھی فیضیاب ہوتی ہے۔ الیکٹرونک میڈیا نے آواز کی بازیافت کر کے اِسے طباعتی ذرائع کے مقابلے میں زیادہ موثر اور مقبول بنا دیا ہے۔ علاوہ ازیں سوشل میڈیا فیس بک اور ویبنار وغیرہ بھی اردو کے فروغ میں غیر معمولی کردار ادا کر رہی ہیں۔

اردو زبان کی ترویج و اشاعت میں ترجمے کی روایت نے بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ اردو میں غیر ملکی زبانوں کے تراجم اردو کو جدید تر بنانے میں معاون ثابت ہوئے، داستانوں اور مثنویوں کے تراجم نے اُردو ادب کے ساتھ زبان کو بھی وسعت بخشی۔ فورٹ ولیم کالج کے اردو تراجم نے جدید نثر کی بنیاد رکھی، مذہبی کتابوں کے ترجموں نے اِس زبان کے مذہبی اور روحانی اظہار کو وسیع اور مستحکم بنایا۔ جب عوامی سطح پر علمی اور ادبی رجحان بڑھا تو عربی فارسی کے علاوہ ترکی، سنسکرت اور انگریزی زبانوں سے ترجمے کی روایت عام ہو گئی۔

سرکاری سطح پر اردو زبان کو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا، اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ اِس ضمن میں جہاں دوسری ہندوستانی زبانوں کے فروغ کے لیے مختلف قومی ادارے قائم کیے گئے ہیں، اُنہیں زبانوں میں اردو زبان کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس کے لیے سرکاری طور پر ہندوستان بھر میں الگ الگ سینٹر قائم ہیں جن میں اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سینٹر انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لنگویجز اور بالخصوص ریاست ہماچل پردیش میں سرکاری سطح پر بھاشا، کلا اور سنسکرتی وبھاگ اور بھاشا اکیڈمی شملہ، دونوں ہی فعال اداروں میں دیگر زبانوں کے علاوہ اردو سیکشن بھی موجود ہے جو اردو کے فروغ میں مثبت قدم تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان انجمن ترقی اردو (ہند) غالب انسٹی ٹیوٹ، غالب اکیڈمی جو سب سے زیادہ فعال اور متحرک ہیں اور شب و روز اردو زبان کے فروغ میں سرگرم عمل ہیں۔ علاوہ ازیں ہندوستان بھر میں ریاستی اردو اکیڈمیاں اردو کے فروغ میں قدم بہ

قدم کام کر رہی ہیں۔ بالخصوص انجمن ترقی اردو (ہند) کا ذکر بڑی اہمیت کا حامل ہے، جس کا قیام سرسید کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

1886 میں مسلم ایجوکیشن کانفرنس منعقد کرانے کا مقصد مسلمانوں کو جدید تعلیم سے متعارف کرانا اور اس کے ذریعے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی طرز پر کالجوں اور اسکولوں کا قیام عمل میں لانا تھا۔ متذکرہ کانفرنس کو تین حصوں میں منقسم کیا گیا تھا یعنی پہلا تعلیم نسواں، دوسرا مردم شماری اور تیسرا اسکولوں اور کالجوں کا قیام شامل ہے۔

1903 میں اس ادارے کی دوسری کانفرنس میں کئی اہم شقوں کا اضافہ کیا گیا جس میں سماجی اصلاحات شعبہ ترقی اردو وغیرہ شامل تھی اور یہی شعبہ آگے چل کر انجمن ترقی میں تبدیل ہوگیا۔ اس انجمن کو قائم کرنے والوں میں ملک وقوم کے عمائدین شامل تھے جن میں محسن الملک، شبلی، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولوی عبدالحق کے نام خصوصیت سے لیے جاتے ہیں۔ آج اس ادارے کی ذیلی شاخیں ملک کے مختلف حصوں میں اردو زبان اور ادب کے فروغ میں عمل پیرا ہیں اور ملکی سطح پر اسکولوں اور کالجوں میں اردو زبان کی تدریس کی بگڑتی صورت حال کو بہتر بنانے کی ذمے داری بھی اسی ادارے کی ہے، کیونکہ ابتدا سے ہی اس کے قیام کا مقصد اردو زبان کا تحفظ اور اس کی بقا ہے۔

اس حوالے میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (دہلی) بھی بہت اہم ادارہ ہے جو اردو زبان کی ترقی اور اُسے فروغ دینے میں ایک فعال و متحرک ادارہ تصور کیا جاتا ہے۔ اس کی غیر معمولی سرگرمیوں میں اردو زبان کا فروغ، ترقی اور نشریات کے علاوہ اردو کو سائنسی و تکنیکی شعبوں سے جوڑنا اور دورِ جدید کے تمام شعبوں میں اردو کے مؤثر کردار کو بحال کرنے کے ساتھ ساتھ حکومت ہند کو اردو کے حوالے سے مفید مشورے دینا بھی شامل ہے۔ علاوہ ازیں اردو تعلیم، تعلیمی ادارے، تعلیمی ترقی اور اردو کتب کی تیاری، تراجم کمپیوٹر اور دیگر جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے اردو کو فروغ دینا۔ اردو زبان میں ادب کی اشاعت کے ساتھ سائنس اور جدید علوم کے دیگر شعبوں سے متعلق کتابیں، بچوں کے ادب اور نصابی و حوالہ جاتی، انسائیکلوپیڈیا، لغت اخبارات و رسائل کی اشاعت میں امداد مہیا کرنا وقتاً فوقتاً ملک اور بیرون ملک اردو مطبوعات کی فروخت اور ان کی نمائش کا انصرام کرنا۔ انگریزی ہندی اور دوسری ہندوستانی زبانوں کے ذریعے اردو زبان کی تعلیم کے لیے اسکیم اور پروجیکٹ، جس میں (فاصلاتی نظام تعلیم) شامل ہے جسے Covid-19 کے دور میں بڑی اہمیت حاصل ہوئی۔

یہ ادارہ اپنی فعالیت کو قائم رکھتے ہوئے اردو زبان کی ترقی اور فروغ کے لیے ریاستی حکومتوں اور ایجنسیوں سے بھی رابطہ کرنے کے ساتھ اردو کی تشہیر کے لیے غیر سرکاری تنظیموں کو جزوی مالی تعاون بھی فراہم کرتا ہے اور ریاستی اکادمیوں کی سرگرمیوں میں حصے داری نیز سوسائٹی کے مقاصد کو مہمیز لگانے کے لیے چندہ، عطیہ، تحائف اور گرانٹ کا بھی انتظام کرتا ہے۔

ہندوستان میں مختلف ریاستوں میں اردو اکادمیوں کا قیام ایک احسن قدم تصور کیا جاتا ہے۔ 1981 میں دہلی اردو اکادمی کا قیام ابتدا سے ہی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

ریاستی حکومت (دہلی) نے اس مقصد کو مدنظر رکھتے ہوئے دہلی اردو اکادمی کے قیام کو عملی جامہ پہنایا کہ اردو زبان کی ترقی اور تدریس پر خصوصی توجہ دی جاسکے، بلکہ دہلی کی تہذیب وتمدن اور اردو زبان کی تعلیمی ترقی میں یہ ادارہ اپنا کردار بخوبی انجام دے پائے۔ دہلی اردو اکادمی کے اغراض ومقاصد میں دہلی کی لسانی تہذیب کے مشترکہ حصے کے طور پر اردو زبان وادب کا تحفظ اور بقا کے علاوہ ادبی اور معیاری تصنیفات، اردو میں بچوں کی کتب کی اشاعت، اردو میں ادبی و سائنسی اور دوسرے اہم موضوعات پر ایسی کتابوں کے تراجم کرانا جن کا ابھی تک اردو زبان میں ترجمہ نہیں ہوا ہے۔

علاوہ ازیں اردو کتابوں کی تالیف واشاعت، قدیم اردو ادب کی صحیح ترتیب وتدوین اور اردو کے غیر مطبوعہ و معیاری ادب کی اشاعت بھی شامل ہے۔ دہلی اردو اکادمی اردو کے مستحق مصنفین کی مالی اعانت اور انعامات کا انصرام کے ساتھ ساتھ عمر رسیدہ مصنفین کی ماہانہ مالی مدد کا انتظام بھی کیا جاتا ہے۔ اردو اسکالرز اور دوسری اہم شخصیات کو جلسوں میں خطاب کے لیے مدعو کرنا، ادبی موضوعات پر سمینار، سمپوزیم، کانفرنس اور ادبی نشستیں، عالمی ادبی رجحانات کے پس منظر میں اردو کے مسائل پر بحث ومباحثہ، اردو کی تدریس اور اس کے استعمال کے متعلق سرکاری احکامات کی تعمیل و تکمیل وغیرہ دہلی اردو اکادمی کے مقاصد میں شامل ہے۔ نیز اردو میں اعلیٰ معیار کے رسائل جریدے اور اسی قسم کی دوسری اہم مطبوعات کی اشاعت کو ممکن بنانا۔

مندرج بالا اداروں پر روشنی ڈالنے کا مقصد یہ تھا کہ ان اداروں کا کردار کیا ہے۔ اس سے یہ بھی آشکار ہو جاتا ہے کہ یہ ادارے اگر فعال اور متحرک نہ ہوتے تو ممکن تھا کہ اردو زبان اور ادب کی صورت کچھ اور ہوتی۔ اس کے علاوہ ہندوستان کی دوسری ریاستوں میں سرکاری وغیر سرکاری اردو ادارے بھی احسن کام کر رہے ہیں اور اردو کی ترقی میں سرگرم عمل ہیں۔

اُردو کی ترقی، فروغ اور ترویج واشاعت میں تارک وطن نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اردو کے سیکڑوں بلکہ ہزاروں قلم کار جنھوں نے اپنا آبائی وطن چھوڑ کر روزگار کی تلاش وجستجو میں دوسرے ملکوں کا سفر کیا مثلاً مشرق وسطیٰ، امریکہ، یوروپی ممالک اور دنیا کے دوسرے خطوں میں جا بسے، اُن کے یہاں اس سمت میں مثبت انداز اور دلجمعی کے ساتھ کام ہو رہا ہے۔ اردو کی توسیع وتبلیغ میں ہند و پاک کے ان قلم کاروں اور فنکاروں نے حصہ لیا جو برطانیہ کنیڈا، جرمنی، فرانس، اسپین، سویڈن، ڈنمارک، بلجیم، جاپان، ہانگ کانگ اور خلیجی ممالک میں مقیم ہیں۔ ان تمام محبان اردو نے وہاں رہ کر نہ صرف اردو کا چراغ روشن کیا بلکہ اردو کا ماحول، اس کی روشنی اور اردو کی خوشبو سے دیارِ غیر کو معطر کر دیا ہے۔

اس قبیل کے شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے شعروادب کی تخلیق کے ساتھ ساتھ اُس کے لیے سازگار ماحول اور خوشگوار ادبی فضا قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی اور اس طرح لکھنے پڑھنے کے اس ماحول سے اردو قاری کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ ادب کے لیے نئے امکانات پیدا ہوئے، اردو کو روزگار سے جوڑنے کے لیے سازگار ماحول اور ممکنہ وسائل پیدا ہوئے۔

اس تجزیے سے ایک اہم اور بات یہ سامنے آتی ہے کہ معاشی جدوجہد کے راستے عالمی سطح پر اردو زبان کے فروغ سے ایک نئے دور کا آغاز ہوا، جس سے قارئین کا بڑا حلقہ وجود میں آیا اور پہلی مرتبہ عالمی سطح پر قارئین کی تعداد میں اضافہ دیکھنے کو ملا اور گلوبل ریڈرشپ کا تصور حقیقت سے قریب تر ہوا۔

اردو کی نئی بستیوں کے اہل ادب اور اہل فن کو متعدد مسائل کا بھی سامنا ہوا مثلاً وہاں کے رہن سہن، طرز حیات، معاشرت اور تہذیب و کلچر پر جو اثرات مرتب ہوئے، جن کی وجہ سے نئی مشکلات اور پابندیاں بھی سامنے آئیں۔ نیا ماحول، مختلف معاشرتی قدریں اور ہر ملک کے اپنے حالات اور قانونی پیچیدگیاں لیکن ان تمام مشکلات، پیچیدگیوں اور پابندیوں کے باوجود اردو زبان کو فروغ حاصل ہوا۔

جہاں تک کسی زبان کے مسائل اور دشواریوں کا سوال ہے تو اردو زبان بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اردو زبان کو بھی مختلف مسائل اور دقتوں کا سامنا ہے جو خود اردو داں طبقے ہی کی دین ہے اور عوامی سطح پر بھی اردو کو خاصا

نقصان پہنچا۔

اس ضمن میں شاید یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ خود اردو داں طبقے نے اپنے گھروں سے اردو تہذیب اور اس کی خوشبو کو ختم کر دیا ہے۔ اُن کے بچے انگریزی تعلیم کے پیچھے دوڑ رہے ہیں گو کہ انگریزی تعلیم یا پیشہ ورانہ ڈگریاں حاصل کرنا معیوب نہیں ہے لیکن اپنی زبان اور اردو تہذیب کو چھوڑ کر حاصل کرنا قطعی غلط ہے کیونکہ ہم کہیں نہ کہیں دوسری زبان اور اس کے کلچر کو اپنا رہے ہوتے ہیں۔ اپنی زبان اور اردو تہذیب کو ترک کرنا گویا خود کو مٹانے کے مترادف ہے۔

دراصل اُردو کسی ایک قوم یا فرقے کی زبان نہیں ہے۔ یہ سب کو ساتھ لے کر چلنے والی زبان ہے۔ لہٰذا اردو داں طبقے کو اپنے رویوں میں تبدیلی لانے کی ضرورت ہے اور ایسے اقدامات اٹھانے پر زور دینا چاہیے جس میں مشترکہ طور پر اردو کی کھوئی ہوئی روایت کو پھر سے بحال کیا جا سکے۔ مثلاً قوالیوں کا رواج اب ختم ہو چکا ہے، چہار بیت کی محفلیں حالات کی گرد میں کھو چکی ہیں اور مشاعرے بھی آپسی چپقلش کا شکار اور لڑائی جھگڑوں اور ہنگاموں کی نذر ہوتے جا رہے ہیں۔

ہندوستان میں سیکڑوں زبانیں پڑھی اور لکھی جاتی ہیں لیکن علمی زبان آج بھی انگریزی کو ہی تصور کیا جاتا ہے، جس طرح ہندی اور دوسری قومی زبانوں کو اس قسم کے مسائل کا سامنا ہے، اُسی طرح اردو زبان کو بھی یہ مسئلہ درپیش ہے۔ اگر اردو زبان کو فروغ دینے کے لیے جہاں مختلف قومی ادارے اور اکیڈمیاں قائم کی گئیں، اُسی نہج پر ہندوستان کی ہر ریاست میں سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہو جائے تو کئی مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ اردو کا دامن آج بھی اُسی طرح وسیع ہے جس طرح سرسید کے دور میں وسیع تھا۔

ہم اکیسویں صدی کی تیسری دہائی میں سانس لے رہے ہیں لیکن یہ بات قابل غور ہے کہ آج بھی ہندوستانی فلموں و ٹیلی ویژن کے ڈراموں اور خبروں کی تشہیر کے لیے اپنے مکالموں میں اردو کا استعمال لازم و ملزوم سمجھا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ ہندوستانی تشخص کے اظہار کا سب سے بڑا اور طاقتور ذریعہ اردو زبان ہی ہے۔ باایں ہمہ مختلف سطحوں پر اردو کو متعدد مسائل اور دشواریوں کا سامنا ہے، بولنے والوں کی تعداد سے لے کر، اس کی تعلیم و تدریس کی سطح تک بہت سے مسائل درپیش ہیں۔ بالخصوص اسکولی سطح پر اردو کی تدریس میں بڑی دقتیں آ رہی ہیں۔ ہندوستان کی جن ریاستوں میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے، اُن میں بہار اور اتر پردیش کا نام خصوصیت سے لیا جاتا ہے۔ انہیں دو ریاستوں میں اردو پڑھنے اور بولنے والے بہ نسبت دوسری ریاستوں کے زیادہ پائے جاتے ہیں اور انھیں دو ریاستوں میں اسکولی سطح پر اردو کو بنیادی سہولیات حاصل نہیں ہیں۔

دوسرا اہم مسئلہ یہ ہے کہ یہاں کا اردو داں طبقہ اپنے بچوں کو اردو زبان پڑھوانے میں سنجیدہ نظر نہیں آتا، طلبہ کی اکثریت ریاضی، سائنس، انگریزی یا دیگر مضامین کو پڑھنے میں زیادہ دلچسپی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ ان کے ذہنوں میں یہ بات راسخ ہو چکی ہے کہ اردو زبان بہت محدود ہے یا اس میں روزگار کے مواقع نہیں ہیں۔ طلبہ عام طور پر تکنیکی تعلیم کی طرف متوجہ ہیں یا دیگر پیشہ ورانہ کورسز میں داخلہ لیتے ہیں۔ اسی سبب اسکولوں میں تدریسی سطح پر دشواریاں پیش آ رہی ہیں۔ متذکرہ دونوں ریاستیں اردو کا گہوارہ کہلاتی تھیں اور اردو زبان کے چاہنے والوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی لیکن موجودہ دور میں اردو سے تعلق رکھنے والوں کی تعداد دن بہ دن سکڑتی جا رہی ہے، جو تشویشناک ہے۔

ایک تجربے اور مشاہدے کے مطابق مذکورہ دشواریوں کا سبب اسکولوں میں بالخصوص اردو کے تربیت یافتہ معلمین کی کمی ہے۔ حالانکہ حکومت نے ایسے قوانین بنائے ہیں جن میں ایک معلم کا تربیت یافتہ ہونا لازمی قرار دیا گیا ہے جو طلبہ کے سماجی و ثقافتی اور نفسیاتی نشو و نما میں کلیدی کردار ادا کر سکے۔ غور و فکر کی بات یہ ہے کہ اگر کہیں اردو کے تربیت یافتہ معلمین موجود بھی ہیں تو وہ اپنے کام کو بہتر طریقے سے سرانجام نہیں دیتے۔

اساتذہ تدریس کو موثر اور دلچسپ بنانے کے لیے عمدہ طریقۂ تدریس، تدریسی حکمت عملی اور مختلف تدریسی اکتسابی آلات کا استعمال کرتے ہیں تاکہ طلبہ بہتر اور خوشگوار انداز میں سمعی اور بصری آلات کے ذریعے تعلیم حاصل کر سکیں لیکن زیادہ تر اسکولوں میں کسی بھی قسم کے تدریسی اکتسابی آلات یکسر طور پر موجود ہی نہیں ہیں اور نہ ہی اردو زبان سے متعلق مواد تیار کیا گیا۔

اردو زبان کو ایک اور مسئلہ درپیش ہے جس کو ماہرین نے جدید ٹکنالوجی سے دوری یا عدم توجہی کے طور پر دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے، کیونکہ اردو زبان پر اس قسم کے الزامات عائد کیے جاتے رہے ہیں کہ اس زبان نے خود کو جدید ٹکنالوجی سے ہم آہنگ نہیں کیا۔ اردو زبان کو تکنیکی تعلیم سے جوڑنے کی اشد ضرورت ہے، تاکہ طلبہ کا رجحان اردو زبان کی طرف موڑا جا سکے اور اردو ہر طالب علم کی ضرورت بن جائے۔

عصر رواں میں طلبہ کی ہمہ جہت ترقی کے مدنظر پراجیکٹ پر مبنی تدریس سے کئی مسائل کو حل کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً طریقۂ تدریس کے ذریعے طلبہ فن تدریس سے واقف ہو سکتے ہیں مگر افسوس عام طور پر اسکولوں میں تدریس کی بنیادی ضروریات اور سہولیات کا انتظام و انصرام ہی نہیں کیا گیا۔ اساتذہ اُسی پرانے طریقۂ تدریس پر قائم ہیں۔ اگر معلمین تربیت یافتہ بھی ہوں تو وہ دوران تدریس کسی خاص مہارت کا استعمال نہیں کرتے۔ اس حوالے سے ایک خاص پہلو یہ ہے کہ اسکولوں میں طلبہ کو اردو زبان کی کتابیں بروقت مہیا نہیں ہو پاتیں اور تعلیمی سیشن کے کئی مہینے بنا کتابوں کے گزر جاتے ہیں۔ اگر بعد میں کتابیں دستیاب ہو بھی جائیں تو طلبہ میں وہ دلچسپی باقی نہیں رہتی جس سے اُن میں اپنی مادری زبان کے تئیں جذبہ اور محبت پیدا ہو اور ان کی زندگی میں اردو تہذیب داخل ہو سکے۔

غرض کہ زبان کی تدریس کے لیے جو رہنما اصول بنائے گئے ہیں، اُن پر اسکولوں میں عمل ہی نہیں کیا جاتا۔ اصولاً تو تمام درجات کے طلبہ کے مختلف قسم کے طریقۂ تدریس اور حکمت عملی کے ذریعے نشو و نما کرنا چاہیے۔ مثلاً ابتدائی کلاس کے طلبہ کو مختصر کہانیوں اور مترنم نظمیں سنا کر طلبہ کو ذہنی طور پر کو تیار کیا جا سکتا ہے، لیکن عام طور پر اس قسم کے اقدامات نہیں کیے جاتے حالانکہ رہنما اصول کے مطابق طلبہ کو گائڈ، نوٹس وغیرہ فراہم کرانے کی بات کہی جاتی ہے مگر اسکولوں میں جانے کے بعد ایسا کچھ دیکھنے کو نہیں ملتا۔

زیادہ تر اسکولوں کی لائبریریوں میں اردو کی کتابیں موجود نہیں ہیں اگر کتابیں مل بھی جائیں تو دیگر زبانوں کے مقابلے میں اردو کی کتابیں کم دستیاب ہیں۔ یہ بات بھی بڑی مضحکہ خیز ہے کہ جن اسکولوں میں اردو کو لازمی مضمون کی حیثیت حاصل ہے، وہاں ثانوی سطح کی تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ اردو کو صحیح طور پر پڑھنے اور لکھنے سے قاصر ہیں۔

اردو زبان جس طرح کی تدریسی مشکلات میں گھری ہوئی ہے، ان کو بہر حال دور کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ تمام اقدامات اور اردو کے فروغ کی ذمے داری صرف حکومت کی نہیں ہے بلکہ سبھی کا فرض ہے کہ اردو زبان کے تدریسی مسائل کو اجتماعی اور انفرادی ہر دو سطحوں پر دور کرنے اور تدریسی ترقی کو فروغ دینے پر زور دیا جائے۔

■

Dr. Ishteyaq Alam Azami
(Principal) M.M (PG) College, Katghar
Dist. : Moradabad - 244001 (UP)
Mob.:09936895252

تعمیر وطن میں زبان اردو کا حصہ

غضنفر

اس اردو نے جن جن کو بنانے کابیڑا اٹھایا ان میں ہمارا یہ ملک بھی شامل ہے۔ یہ ملک بننے سے پہلے بھی ہمارا تھا مگر ہمارا ہوتے ہوئے بھی ہماری دسترس سے باہر تھا یہ دشمنوں کے قبضے میں تھا۔ وحشی پنجوں کے شکنجے میں تھا۔ غاصب ہاتھوں نے اسے نوچ کھسوٹ ڈالا تھا۔ تخریبی ذہنوں نے اسے تہس نہس کردیا تھا۔ اسے بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔

کچھ چیزیں اپنے خمیر میں محبت کا امرت گھولے رکھتی ہیں یایوں کہیں کہ ان میں پریم امرت گھلا رہتا ہے۔ کسی بھی صورت میں یہ امرت رس ان کے رگ و ریشے سے الگ نہیں ہوتا۔ نفرت کے سانپوں کی صحبت میں بھی چندن بنا رہتا ہے۔ کدورتوں کا زہر بھی اس کی مٹھاس کو زہریلا نہیں کرپاتا۔ ایسی چیزیں بگڑ جانے یا بگاڑے جانے کے بعد بھی بنی رہتی ہیں۔ اجڑ کر بھی اپنی خوبو نہیں چھوڑتیں۔ اپنے رنگ، ترنگ اور اُمنگ کو مدھم نہیں ہونے دیتیں۔ جس کسی کے بناؤ کا یہ بیڑا اٹھاتی ہیں، اسے بنا کر دم لیتی ہیں۔ کار بناؤ یہ اس چاؤ اور رچاؤ سے کرتی ہیں کہ اسے ہر رُخ سے جاذبِ نظر بنا دیتی ہیں۔ گویا اس میں سرخاب کے پر لگا دیتی ہیں۔ اس کے خط وخال کو چمکا دیتی ہیں۔ حسن و جمال کو دمکا دیتی ہیں۔ اسے مال ومنال سے مالا مال کردیتی ہیں۔ اس میں کیفِ کمال اور وصفِ لازوال بھر دیتی ہیں۔ ایسا دم دیتی ہیں کہ بننے والا صرف بنتا ہی نہیں پک کر خوشبو بھی دینے لگتا ہے۔ خود تو مہکتا ہی ہے دوسروں کو بھی مہکانے لگتا ہے۔

ایسی ہی تعمیری اور تعبیری اشیا میں اردو بھی ایک ہے۔ اردو کے خمیر میں بھی محبت گھلی ہوئی ہے۔ ایسی محبت جس نے آب حیات پی رکھا ہے۔ جو مارنے پر بھی نہیں مرتی، مٹانے سے بھی نہیں مٹتی۔ مارنے اور مٹانے والے کے دل ودماغ میں بھی اپنے رس کی مٹھاس بھر دیتی ہے۔ اس کے زہر کو بھی زائل کردیتی ہے۔ یہ پیدا ہی اس لیے ہوئی کہ اختلافات کو مٹا سکے۔ امتیازات کو ہٹا سکے۔ فاصلوں کو گھٹا سکے۔ قربتوں کو بڑھا سکے۔

ایسی محبت جو مروت کے لشکارے مارتی ہے، اخوت کے پھوارے چھوڑتی ہے، یگانگت کے ناریل پھوڑتی ہے، جو دیواروں کو توڑتی ہے، دلوں کو جوڑتی ہے، بادِ مخالف کے رُخ موڑتی ہے، تاریکیوں میں دھنک تانتی ہے، رنگ ونور کے تیر چھوڑتی ہے، دھندلکوں کے سرکاتی ہے، دھوئیں کا سینہ چیرتی ہے، فضاؤں میں گلال اُڑاتی ہے، چہروں پر عنبر وعبیر ملتی ہے، بالوں میں افشاں چھڑکتی ہے، کدورتوں کے پاؤں توڑتی ہے، حقارتوں کے پنجے مروڑتی ہے، عدو کی آنکھیں پھوڑتی ہے۔

دھند کو دھنتی ہے، دھوئیں کے بادلوں سے بجلیاں چنتی ہے، بجلی کے تاروں سے چاندنی بنتی ہے، چاندنی سے چھاؤں چھانتی ہے، چھاؤں سے جسم کو، روح کو، ذہن کو، قلب کو، جگر کو، نظر کو، سب کو ٹھنڈک پہنچاتی ہے۔

اس اردو نے جن جن کو بنانے کا بیڑا اٹھایا ان میں ہمارا یہ ملک بھی شامل ہے۔ یہ ملک بننے سے پہلے بھی ہمارا تھا مگر ہمارا ہوتے ہوئے بھی ہماری دسترس سے باہر تھا۔ یہ دشمنوں کے قبضے میں تھا۔ وحشی پنجوں کے شکنجے میں تھا۔ غاصب ہاتھوں نے اسے نوچ کھسوٹ ڈالا تھا۔ تخریبی ذہنوں نے اسے تہس نہس کردیا تھا۔ اسے بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔

دشمن کے قبضے سے چھڑانے، قید وبند کی سختی سے نجات دلانے، گھٹن سے نکال کر کھلی فضا میں لانے اور اسے نئے سرے سے بنانے کے لیے جتنی آوازیں بلند ہوئیں ان میں سب سے اونچی، گرج دار اور انقلابی آواز اردو کی تھی۔ اردو نے ایک ایسا نعرہ دیا جس کی گونج نے ایک طرف مردہ دلوں میں جان پھونک دی تو دوسری جانب ضرورت سے زیادہ شور مچانے والی زندگی کی حرکتیں بند کردیں۔ اس نعرے نے وہ کر دکھایا جو بڑے بڑے نگاڑے بھی نہ کرسکے۔ یہ جب جب گونجا کسی کے لیے مژدۂ جاں فزا تو کسی کے لیے صور اسرافیل ثابت ہوا۔ ایک طرف مضمحل پیروں کو برق رفتار سرعتیں مل گئیں تو دوسری جانب رخشوی قدموں کی رگیں ڈھیلی پڑ گئیں۔ ایک طرف جوش سے سرد پڑے ولولے ابل پڑے تو دوسری جانب آہنی حوصلے بھی پگھل گئے۔ ہندوستان تو ہندوستان ایوانِ انگلستان تک دہل گئے۔ یہ نعرہ 'انقلاب زندہ باد' کا نعرہ تھا جو اس زبان کے لبوں سے نکلا تھا جس نے اپنے بارے میں کہا تھا۔

کام ہے میرا تغیر نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب وانقلاب و انقلاب

ملک وقوم کو اس اردو نے صرف 'انقلاب زندہ باد' کا نعرہ ہی نہیں دیا بلکہ بعض ایسے منتر بھی دیے جنھوں نے جادو جگا دیا۔ اس زبان کا جگایا ہوا ایک جادو تو ایسا سرچڑھ کر بولا کہ ایک ایک نفس بول اٹھا۔

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

بظاہر یہ دو مصرعے ہیں مگر ان دو مصرعوں میں ٹنوں بارود بند ہے۔ یہ مصرعے جب ہونٹوں تک آتے تو لب توپوں کے دہانے بن جاتے اور ان سے وہ گولے برستے کہ دشمن کی فوجوں کے پرخچے اڑ جاتے۔ ان کے گھوڑوں کی ٹاپوں کے منہ بند ہوجاتے۔ ان بم گولوں کی دھمک ایوانوں میں بھی سنائی دیتی اور ان کی ضرب سے آہنی دیواریں بھی لرز اٹھتیں۔ ان مصرعوں کی آوازیں جب گونجتیں تو دور دور تک فضائیں دہل اٹھتیں۔ ہوائیں دم سادھ لیتیں۔ یہی وہ آوازیں ہیں جن سے مردوں میں جان پڑ گئی۔ جن سے حریفوں کے نگاڑوں میں کیل گڑ گئی۔ جن سے خیمۂ دشمناں میں قیامت کا صور پھنک گیا، صفِ ماتم بچھ گئی، ان آوازوں کا ایسا شور اُٹھا اور ان کے زیر وبم کا ایسا زور پڑا کہ زور بازوئے قاتل کا کس بل نکل گیا۔

دوسرا منتر اس لشکری زبان نے وہ پھونکا کہ عسکری خیموں میں بھی امن وآشتی کی یہ صدا گونج پڑی۔

شکتی بھی، شانتی بھی، بھکتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

اسی پریت کے خمیر سے یہ زبان بھی بنی جس نے آگے چل کر یہ منتر پھونکا اور جس کی پھونک کا کرشمہ ساری دنیا نے دیکھا۔ یہی وہ جادوئی زبان ہے جس نے اجنبی زبانوں کے منہ میں ایک ایسی زبان ڈال دی کہ گونگے بہرے لوگ بھی بولنے، سننے اور ایک دوسرے کو سمجھنے لگے۔ جس

نے برعکس سمتوں کے عکس کو آئینے میں اس طرح اتار دیا کہ شمال جنوب، مشرق مغرب سبھی کے رنگوں کی آمیزش سے ایک تصویر ابھر آئی۔ ایسی تصویر جو بول پڑی اور جس کی بولی میں مختلف بولیوں کے بول ایک ہو گئے۔ نامانوس سماعتوں کے ساتھ گھل مل گئے۔

پریت یا محبت کا یہ منتر طرح طرح سے پھونکا گیا۔ کبھی اس کا سُر یوں گونجا۔

محبت کے شرر سے دل سراپا نور ہوتا ہے
ذرا سے بیج سے پیدا ریاضِ طور ہوتا ہے

تو کبھی یوں بلند ہوا۔

محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے
کیا ہے اپنے بختِ خفتہ کو بیدار قوموں نے

اور کبھی یوں بول پڑا۔

یہ آپس کے جھگڑے بکھیڑے مٹاؤ
محبت کی ہر وقت مرلی بجاؤ
پیو پریم رس اور سب کو پلاؤ
محبت کی ہر وقت مرلی بجاؤ

محبت کا یہ منتر کانوں میں صرف پھونکا ہی نہیں گیا بلکہ اس منتر کے معنے ومفہوم اور مقصد ومنشا کو ذہن نشیں بھی کرایا گیا۔ یہ بتایا کہ محبت کے اس بول میں شکتی کیسے اور کہاں سے آتی ہے؟ یہ سمجھایا گیا کہ اس میں شفائی اجزا کہاں سے لائے جاتے ہیں؟ ریاضِ طور پیدا کرنے کے لیے محبت کے شراروں کو ایندھن کہاں سے ملتا ہے؟ محبت کی مرلی کن ہونٹوں سے بجتی ہے؟ اور کن انگلیوں کی جنبش سے ملن دھن نکلتی ہے۔ پریم رس کس طرح پیدا ہوتا ہے اور اسے پینے پلانے پر کیوں زور دیا جارہا ہے؟ اور جواب میں یہ بھی سنایا گیا۔

ہیں جذبِ باہمی سے قائم نظام سارے
پوشیدہ ہے یہ نکتہ تاروں کی زندگی میں

—

اُجاڑا ہے تمیزِ ملت و آئیں نے قوموں کو
مرے اہلِ وطن کے دل میں کچھ فکرِ وطن بھی ہے

—

غلامی ہے اسیرِ امتیازِ ما و تو رہنا

—

قوم ہے اتفاق سے آباد ملک ہے اتحاد سے آزاد
قوم جب اتفاق کھو بیٹھی اپنی پونجی سے ہاتھ دھو بیٹھی

یہ نکتہ بھی اردو نے ہی سمجھایا۔ اردو اگر یہ نکتہ نہیں سمجھاتی اور اس نکتے کا شہر شہر، قریہ قریہ ڈھنڈھورا نہیں پٹواتی تو تمیزِ ملت و آئیں سے اجڑنے والی قومیں اتنی آسانی سے نہیں بس پاتیں۔ اتحاد کی دھونکنی کو اگر یہ نہیں گرماتی تو وقت کا لوہا نہیں پگھل پاتا۔ ملک اس سانچے میں نہیں ڈھل پاتا جس کا ہم نے تصور کیا تھا اور جس کا ماڈل صدیوں پہلے ہمارے یہاں موجود تھا۔ یہ زبان اگر وجد میں نہیں آتی تو وحدت کا تصور بھی جذب ومستی میں نہیں آتا، زمانہ کیفیتِ حال سے نہیں گزرتا اور لبوں پر یہ نعرۂ مستانہ نہیں گونجتا۔

ہر بیج خزانہ ہوتا ہے ہر مٹی سونا ہوتی ہے
ہر ساگر امرت ساگر ہے ہر سیپ کے دل میں موتی ہے
بکھرے ہوئے تارے لاکھ سہی پر ان کی چمک تو ایک سی ہے
وہ پورب ہو یا پچھم ہو پھولوں کی مہک تو ایک سی ہے

وحدت کا رنگ چوکھا کرنے میں روحانیت کا بھی بڑا عمل دخل رہا ہے۔ یہ روحانیت ہی ہے جس نے کثرت میں وحدت کا عکس منعکس کیا۔ نانک نے اسی وحدت کا گیت گایا۔ چشتی نے اسی وحدت کا پیغام سنایا۔ امیر خسرو نے اسی وحدت کا راگ الاپا اور صوفی سنتوں کے اس رنگ خاص کو اردو نے عام کیا۔ اردو نے ایک ایک نفس تک یہ عارفانہ نکتہ پہنچایا۔

اس کے فروغِ حسن سے جھمکے ہے سب میں نور
شمعِ حرم ہو یا کہ دیا سومنات کا

ملک کسی ایک نہج پر نہیں بنتا بلکہ مختلف سطحوں پر پروان چڑھتا ہے۔ ان میں سے ایک تہذیبی سطح بھی ہے۔ تہذیبی نقوش بتاتے ہیں کہ اس ملک میں کس کس طرح کے رنگ ہیں۔ کیسا کیسا آہنگ ہے، کون کون سا رس ہے؟ کس رس کی مٹھاس کیسی ہے؟ کس آہنگ سے کس طرح کا سُر نکلتا ہے؟ ان سروں سے نکلنے والی سرلہریوں میں کیسا کیسا کیف ہے؟ کیسا کیسا سرور ہے؟ اسی تہذیبی سطح پر چودھویں کا چاند روشن ہے۔ وقت کا چہرہ تابندہ ہے۔ مغلِ اعظم جلوہ افروز ہے۔ رضیہ سلطان مسند نشیں ہے۔ میرے محبوب کا حسن جلوہ فگن ہے۔ شطرنج کے کھلاڑی کی بساط بچھی ہوئی ہے۔ ہیر رانجھا اور لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد اپنی اپنی محبت کی داستان سنا رہے ہیں اور ان سب کے بیچ امراؤ جان اپنی مخصوص ادا کے ساتھ نغمہ زن ہیں۔

جستجو جس کی تھی اس کو تو نہ پایا ہم نے

تہذیبی افق پر ستاروں کی مانند جگمگانے اور دور دور تک روشن نظر آنے والے یہ فلمی فن پارے اپنی روشنی اس لسانی سورج سے حاصل کرتے ہیں جس کا نام اردو ہے۔ اگر اردو زبان کی صوت وصدا اور اس کے شعروادب کے ناز و ادا اور اس کے لفظوں کے رنگ وضیا انھیں نہیں ملتے تو یہ اتنا تابندہ دکھائی نہیں دیتے۔

تہذیبی افق کا ایک کنارہ ادب بھی ہے۔ اس ملک کی سربلندی میں اردو ادب نے بھی ایک اہم کردار نبھایا ہے۔ میر، غالب، اقبال، فراق، فیض، شہریار، پریم چند، منٹو، بیدی، قرۃ العین حیدر نے ساری دنیا میں جو اس ملک کا نام روشن کیا ہے وہ دراصل اردو زبان کی مرہونِ منت ہیں۔ اردو نہ ہوتی تو یہ تخلیق کار نہیں ہوتے اور یہ نہیں ہوتے تو ساری دنیا میں یہ ترانہ نہیں گونجتا

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

اور انسان کی عظمت یوں بلند نہ ہوتی۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتا ہے

اور اس کی اہمیت اس طرح سامنے نہ آتی۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقش پا پایا

اردو نے ایک اور طرح سے بھی اس ملک کی تعمیر میں ہاتھ بٹایا ہے اور وہ اور طرح ہے۔ اس کا بخشا ہوا وہ شعری حربہ جو آئے دن ایوانوں میں تقریروں کے درمیان برق کی صورت کوندتا۔ یہ وہ حربہ ہے جو کم محنت، کم قوت اور کم وقت میں بہت زیادہ کام کر جاتا ہے، محض چند لمحوں میں صدیوں کی کہانی سنا دیتا ہے۔ صرف چند لفظوں میں دلوں کو گرما دیتا ہے۔ ذہنوں کو سلگا دیتا ہے۔ ذرا سی ضرب سے فولادی جسموں کو نرما دیتا ہے۔ ہنسا ہنسا کر رُلا دیتا ہے۔ ایوانوں میں سنائے گئے شعروں کا انتخاب کیا جائے اور ان پر غور فرمایا جائے تو ایک بہت ہی دلچسپ اور معنی خیز تاریخ مرتب ہو سکتی ہے اور وہ تاریخ یہ بتا سکتی ہے کہ اردو نے اس راستے سے ملک وقوم کی کتنی بڑی خدمت انجام دی ہے۔ اس انداز کی خدمت ملک میں منعقد ہونے والے مختلف نوعیت کے جلسوں، نکالے گئے جلوسوں، ایسے موقعوں پر کی گئی تقریروں اور ناظموں کی کاروائیوں میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ ان میں اردو نے فصاحت و بلاغت کے جو دریا بہائے ہیں، خیالات کے سیلاب اور جذبات واحساسات کے جو گرداب اٹھائے ہیں، ان سے ذہن ودل میں جو انقلابات لائے ہیں اور ان انقلابات سے جو تغیرات پیدا ہوئے ہیں اور ان تغیرات سے زمینِ ہند کو جو سیرابی وشادابی ملی ہے اسے سچی اور معروضی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ داغ نے یوں ہی یہ نہیں کہہ دیا۔

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

■

Prof. Ghazanfar
'Bushra', Lane-A 12, Hamza Colony
New Sir Syed NagarExtn.
Aligarh - 202002 (UP)

امام اعظم

اردو کے فروغ میں متھلانچل کے غیر مسلم ادبا و شعرا کا حصہ

اردو کے فروغ میں متھلانچل کے غیر مسلم ادبا و شعرا کا بھی خاصا حصہ رہا ہے۔ اگر شاعروں کو لیں تو ان کے کلام سے محاسن شعری نہایت مدلل اور منطقی انداز سے سامنے آتے ہیں۔ انھوں نے جو کچھ محسوس کیا اور اساتذہ سے جو کچھ اکتساب کیا اسے Rational انداز سے اعتماد کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ایسے بیشتر غیر مسلم شاعروں کی شعری صلاحیت، تخلیقی قوت اور فنی استقامت کو ان کے فکر کے آئینے میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اردو کے فروغ میں یہ زنجیر کی کڑیاں ہیں جن کا تاثر ہر عہد میں انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔

سرزمین متھلا علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ اسی لیے یہاں میتھلی اور ہندی کے ساتھ اردو زبان کا بول بالا دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ متھلا کا علاقہ سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی اور اخلاقی رویوں سے آشنا رہا ہے۔ اردو کسی ایک قوم کی زبان نہیں ہے اسی لیے اس میں ایک نسل اور ایک طبقے کا کارنامہ نہیں ملتا بلکہ متحدہ کاوشوں کا ثمرہ دیکھنے کو ملتا ہے جو نسلاً بعد نسلاً بڑھتا رہا ہے۔ اگر بیشتر اصناف سخن کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو اجتماعی شعور کی سانسیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اجتماعی پرتو کا ماحول تابناک نظر آتا ہے جس سے دل آویز رجحان کا پتہ چلتا ہے۔ اس شہر کو شمالی بہار میں مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔ دربھنگہ کا ماضی اور حال تاریخی اور جغرافیائی انفرادیت کے سبب درخشاں رہا ہے۔ جس طرح یہاں کئی مذاہب کے ماننے والے ہم آہنگی اور بھائی چارے کے جذبے کے ساتھ زندگی گزارتے آئے ہیں، اسی طرح یہاں ہندی، اردو اور میتھلی کے بولنے والے بھی اپنی اپنی زبانوں کے ساتھ فخریہ طور پر زندگی کے ہر میدان میں پیش قدمی کر رہے ہیں۔

غیر مسلم اردو داں نے اردو کے فروغ کے لیے بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ حالاں کہ ان کی خوشہ چینی تخلیقی حیثیت سے کم رہی ہے لیکن دائرۂ عمل اور مواد کی نشان دہی سے نظریاتی ترجیحات سامنے آتی ہیں، جن میں تخلیقی جست تو ہے ہی فعال عناصر بھی ملتے ہیں جس سے صورت حال واضح ہوتی ہے اور معنی و مطالب کا باہمی ربط ملتا ہے۔

ایسی عکاسی سے بولتی ہوئی متحرک پر کیف تصویریں سامنے آتی ہیں جو فن کار کی شخصیت اور ان کی تخلیق سے سروکار رکھتی ہیں۔ اردو کے فروغ میں متھلانچل کے غیر مسلم ادبا و شعرا کا بھی خاصا حصہ رہا ہے۔ اگر شاعروں کو لیں تو ان کے کلام سے محاسن شعری نہایت مدلل اور منطقی انداز سے سامنے آتے ہیں۔ انھوں نے جو کچھ محسوس کیا اور اساتذہ سے جو کچھ اکتساب کیا اسے Rational انداز سے اعتماد کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ایسے بیشتر غیر مسلم شاعروں کی شعری صلاحیت، تخلیقی قوت اور فنی استقامت کو ان کے فکر کے آئینے میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اردو کے فروغ میں یہ زنجیر کی کڑیاں ہیں جن کا تاثر ہر عہد میں انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ معروف محقق، ادیب اور صحافی ڈاکٹر مشتاق احمد اپنے مضمون

میں لکھتے ہیں:

''اٹھارہویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے آغاز میں اردو نہ صرف میتھلی زبان پر اثرانداز ہوتی ہے بلکہ متھلانچل کے لسانی معاشرے کو بھی اپنی جادوئی گرفت میں لے لیتی ہے۔ متھلانچل کے غیر اردو داں ادبا اور شعرا اردو کو تخلیقی ذریعۂ اظہار بنانے لگتے ہیں۔ بالخصوص اردو میں نہ صرف شاعری کو فروغ دیتے ہیں بلکہ کئی ادبا اور شعرا صاحبِ دیوان اور صاحبِ تصانیف کھڑے نظر آتے ہیں۔''

(مضمون 'میتھلی زبان وادب پر اردو کے اثرات' مشمولہ 'فکر وتحقیق' جنوری تا مارچ 2021، ص 42)

تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ متھلانچل کے غیر مسلم شعرا وادبا میں **منشی آسارام ذوق** محلہ بھگوان داس، دربھنگہ کے رہنے والے تھے۔ راجہ رام نرائن موزوں کے زمانے میں فوجدار کے عہدے پر فائز رہے۔ مختلف تذکروں میں انھیں عظیم آباد، کلکتہ، الٰہ آباد اور غازی پور کا باشندہ بتایا گیا ہے لیکن 'نوادراتِ سروش' کے حوالے سے محمد الیاس رحمانی مرحوم نے ثابت کیا ہے کہ منشی آسارام ذوق دربھنگہ کے ساکن تھے۔ ان کا حسن بیان، حسن زبان اور حسن خیال دیکھیے۔

ذوق کے مرنے کا افسوس نہیں کچھ اس کو   غم کہاں شمع کے دل میں کسی پروانے کا
دل تو کہے ہے آنکھوں نے مجھ کو کیا خراب   آنکھیں کہے ہیں دل ہی نے ہم کو ڈوبا دیا
مت نکل اشک مرے دیدۂ تر سے باہر   طفل آوارہ، قدم رکھے ہے گھر سے باہر
باتوں سے تسلی نہیں ہونے کی ہماری   مر جائیں گے پر منت پیغام نہ لیں گے

دیوان جیون رام تحقیق (وطن موضع سیودھا، مظفر پور) مہاراجہ مادھو سنگھ، دربھنگہ کے دربار میں دیوان کے عہدے پر فائز تھے۔ انھیں دربھنگہ کے پرگنہ جھروارہ میں موضع ہری ہر پور مہاراجہ مادھو سنگھ نے عطا کیا تھا۔ یہ عربی وفارسی کے زبان داں تھے۔ فارسی اور اردو میں شاعری کرتے تھے اور مرزا فدوی کے شاگرد تھے۔ اپنے دور کے معروف شاعروں میں شمار کیے جاتے تھے لیکن ان کا اردو کلام دستیاب نہیں ہے۔ محمد الیاس رحمانی کو غلام سرور سروش کی قلمی بیاض سے علم ہوا کہ وہ اردو میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔ تذکرہ نگاروں نے ان کے اردو مجموعے کا نام 'بحر طویل' بتایا ہے۔ 1805 میں ان کا انتقال جگن ناتھ پوری میں ہوا۔ اردو کا ایک شعر یوں ہے۔

مئے مصفا جام سے مئے سے مصفا جام ہے   فرق بینائی کرتے کیوں کر ایاغ دوستی

منشی جھبودت رفعتی موضع موئی پور، پرگنہ سریسا، ضلع مظفر پور کے رہنے والے تھے۔ مہاراج دربھنگہ چھتر سنگھ کے دربار سے وابستہ تھے۔ فارسی و اردو میں شاعری کرتے تھے۔ مولوی فصیح الدین بلخی نے اپنی کتاب 'تذکرہ ہندو شعرائے بہار' میں ذکر کیا ہے۔

امبیکا پرشاد شمس (ولادت 11 نومبر 1838) دربھنگہ کے مشہور وکیل بابو رام کندل پرساد کے فرزند تھے۔ دربھنگہ میں وکالت کرتے تھے۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ کلام صاف، رواں دواں اور اثر انگیز ہوتا تھا۔ 27 فروری 1889 میں انتقال ہوا۔

منشی اجودھیا پرساد بہار کا آبائی وطن منیر شریف، ضلع پٹنہ تھا۔ والد گوپال لال مظفر پور میں داروغہ ہوئے تو یہیں سکونت اختیار کرلی۔ منشی اجودھیا پرساد بہار، بابو متھرا پرساد، منشی مہادیو پرساد منظر اور بابو بچھی پرساد چاروں بھائی عربی، فارسی، اردو، ہندی اور مہاجنی زبانوں پر دسترس رکھتے تھے۔ خوش نویسی میں مہارت اور آئین دانی میں بڑے ہوشیار اور کارگذار مشہور ہوئے۔ منشی اجودھیا پرساد 1861 سے 1864 تک مہاراجہ دربھنگہ کے دربار سے وابستہ رہے۔ اس کے بعد آخری دم تک اخبار 'اخبار الاخبار' مظفر پور کے ایڈیٹر رہے۔ 1868 میں 'گلزار بہار' المعروف بہ 'ریاض ترہت' تصنیف کی۔ اردو، فارسی دونوں زبانوں میں خوب شاعری کرتے تھے۔ فارسی کلام کا نمونہ 'ریاض ترہت' اور اردو کلام کا نمونہ 'آئینۂ ترہت' میں موجود ہے۔ بہار کے چند اردو اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

ہر اک رنگ میں جلوہ گر ماہ رو ہے   اسی کا یہ جلوہ، اسی کی یہ بو ہے
عبث ملول فضا میں ہوئی ہے اے بلبل   خزاں کے بعد پھر آئے گی کیا بہار نہیں

منشی مہادیو پرساد منظر اپنے بڑے بھائی اجودھیا پرساد بہار سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ ان ہی کے ساتھ چند برسوں تک مہاراجہ دربھنگہ کے دربار سے وابستہ رہے۔ پھر دربھنگہ میں ہی وکالت کرنے لگے اور خاصی شہرت پائی۔ اردو، فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے اور صاحب دیوان تھے۔

لالہ سدانند مصر ٹولہ، دربھنگہ کے باشندہ تھے۔ دربار مہاراجہ سے جڑے تھے۔ اردو فارسی میں شعر کہا کرتے۔ نند تخلص کرتے اور استاد شاعر مرشد حسن کامل سے شرف تلمذ رکھتے تھے۔

منشی بھوانی پرساد حسرت دربھنگہ کے ممتاز کائستھ گھرانے سے تھے۔ اردو، فارسی دونوں زبانوں میں برجستہ شعر کہتے تھے۔ دبستان کامل کے خوشہ چیں تھے۔ 1891 میں ان کا انتقال ہوا۔ 'ریاض ترہت' میں ان کا ایک شعر اور قطعہ ملتا ہے۔ باقی کلام دستیاب نہیں۔ اردو شعر دیکھیں۔

سحر سے دوپہر شب تک ذرا فرصت نہیں ملتی
رہا ہوں جب سے کورٹ میں حواس اپنا ہے چکر میں

منشی بہاری لال فطرت عربی وفارسی پر دسترس رکھتے تھے۔ 1856 میں انھوں نے وکالت کا امتحان پاس کیا تھا۔ 1876 میں آنریری مجسٹریٹ، 1877 میں عدالت منصفی دربھنگہ میں سرکاری وکیل مقرر ہوئے۔ 1879 میں میونسپل کمشنر منتخب ہوئے۔ 1899 میں ان کا انتقال ہوا۔ 1883 میں 'آئینۂ ترہت' جیسی تاریخی کتاب لکھی تھی۔ شاعری کی بیشتر اصناف میں انھوں نے طبع آزمائی کی ہے۔ وہ رموز فن اور نکات شعری سے واقف تھے۔ ان کے یہاں حسن زبان پر زیادہ توجہ ملتی ہے۔

طبیعت پہ ہو ناز کیوں کر نہ فطرت   جو شعر اس غزل میں ہے وہ بے بدل ہے
کیا بھروسہ ان کی الفت کا   چار دن کی یہ آشنائی ہے
بولنا تھا نہ تجھے وصل کی شب میں ہرگز   یہ گلہ تجھ سے ہم اے مرغ سحر کرتے ہیں
گوہر کی طرح نکلے باہر تو آبرو ہو   ہوتی نہیں ہے عزت انسان کی وطن میں
مٹالو حسرت دیدار چل کے اے فطرت   سنا ہے آج کل دیدار عام ہوتا ہے

فطرت چونکہ مہاراجہ دربھنگہ تک رسائی رکھتے تھے اس لیے لچھمیشور سنگھ بہادر کی مدح میں انہوں نے ایک قصیدہ بھی لکھا تھا جس میں ان کا اپنا ایک خاص رنگ دیکھا جاسکتا ہے۔ اس میں ذرہ نوازی اور تازہ فکر کی جلوہ نمائی ملتی ہے۔ خلوص، محبت اور شخصیت نوازی کی رسم وراہ سے بھی آگاہی ہوتی ہے۔ رفاقت کی خوش ادائی اور علاقائی ادبی یاد کا قیمتی اثاثہ بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔

قصیدہ در مدح مہاراجہ لچھمیشور سنگھ بہادر ریاست دربھنگہ

جمال گل ترقی پر ہے بلبل ہے مسرت میں   چمن میں فیض بہار باغ سے ہے جوش نزہت میں
لاا سے نوجوانان چمن جھک جھک کے ملتے ہیں   خوشی سے پھول پھولے ہیں عنادل ہیں مسرت میں
نسیم اٹکھیلیوں سے چل رہی ہے باغ عالم میں   دہان غنچۂ گل ہنس رہے ہیں جوش فرحت میں
بہار باغ نازاں ہے جمال ہر گل تر پر   عروسان بہاری ہیں شرابور اپنی رنگت میں
مزا لیتی ہے بلبل دید حسن گل کا ہر ساعت   چٹکتی ہے کلی ہر پھول کی نرگس ہے حیرت میں
بہار باغ پر کرتا ہے صدقے پھول زر اپنا   صبا جاروب دے جاتی ہے صحن باغ وخلوت میں
لگے ہیں شاخ نخل گل میں جھولے غنچۂ تر کے   لگاتی ہے صبا پینگ اور عنادل ہیں مسرت میں

محبت کی نظر سے دیکھتی ہے گل کو ہر بلبل   رچی ہیں شادیاں گلزار میں گل چیں ہیں عشرت میں
لگاوٹ کرتی ہے بادِ صبا نسریں سے شبو سے   وہاں غنچے گل بھیرویں گاتا ہے دُھرپت میں
ادھر سبزے پہ طوطی ہے لہالہوٹ اور اُدھر بلبل   تڑپتی ہے جمالِ ہر گلِ تر کی محبت میں

بہار باغ سے اپنا جو دل مسرور ہے فطرت
تو کہیے اور کچھ اشعار تر اب خاص مدحت میں

رعیت پروری، مسکیں نوازی ہے طبیعت میں   طبیب دردمنداں ذات والا ہے حقیقت میں
رحیم ایسے کہ جب حاضر ہوا دشمن تواضع سے   مثال دوست اس کو لے لیا دامانِ شفقت میں
رئیس ایسے کہ مجرم پر بھی غصہ تک نہیں آتا   اگر آتا ہے رہ جاتا ہے آغوشِ مروت میں
نہیں کا لفظ بھولے سے بھی ہونٹوں پر نہیں آتا   طلب جس نے کیا جو کچھ دیا جوشِ سخاوت میں
نظیر و مثل اپنا وہ نہیں رکھتے ہیں دنیا میں   ریاست میں مروت میں سخاوت میں شجاعت میں
بلندی کا جو ہے مضموں کہیں پایا نہیں جاتا   مگر افلاک میں اور آپ کے بامِ عمارت میں
ہزاروں آدمی کی پرورش ہے ذاتِ بالا سے   بسر کرتے ہیں لاکھوں آپ کے ظلِ حمایت میں
نظیر اپنا نہیں رکھتے ہیں مشرق میں نہ مغرب میں   مثالِ ماہ یکتا آپ ہیں بُرجِ شرافت میں
یہ عالم آپ کے نورِ ریاست سے منور ہے   کہ مثلِ مہر روشن آپ ہیں چرخِ ریاست میں
اذیت ایک چیونٹی کی روا رکھتے نہیں ہرگز   ہمیشہ فکر کرتے رہتے ہیں انساں کی راحت میں
الٰہی تا رہے گرمیِ بازارِ سخن قائم   رہے شعروں کا سودا شاعروں کی طبیعت میں
محبت ہے گلِ رعنا کی جب تک دل میں بلبل کے   اثر ہے سرو کی الفت کا تا قمری کی طینت میں
الٰہی روز افزوں ہووے قدر و رتبۂ دولت   ترقی ہو ہمیشہ عمر میں دولت میں حشمت میں

اب اپنا یہ قصیدہ آج فطرت ختم کرتا ہے
زہے قسمت اگر مقبول ہو بزمِ کرامت میں

مذکورہ بالا قصیدہ فنِ قصیدہ کے لوازمات پر کھرا اترتا ہے کیوں کہ فطرت نے اس میں قصیدے کے تمام اجزائے ترکیبی یعنی تشبیب، گریز، مدح، مدعا/حسنِ طلب اور دعا کا بھرپور خیال رکھا ہے جو کاملینِ فن نے مقرر کیے ہیں۔ قصیدے کے اشعار میں روانی اور غنائیت بھی بھرپور موجود ہے۔ تشبیب کے اشعار میں جہاں غزلوں کا پس منظر ملتا ہے وہیں مدح میں مداح و ممدوح کا تعلق بھی کھل کر سامنے آتا ہے۔

منشی کیول پرساد فقیر مظفر پور کے رہنے والے تھے۔ اردو، فارسی، عربی اور سنسکرت زبانوں میں مہارت رکھتے تھے۔ خوش نویسی میں ممتاز تھے۔ ان کا فارسی دیوان خانقاہ فردوسیہ بلخیہ، فتوحہ کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ اردو میں بھی خوب شعر کہتے تھے۔

بابو اودھ بہاری سنگھ بیدل موضع بترا، ضلع سیتا مڑھی کے رہنے والے تھے۔ لنگٹ سنگھ کالج، مظفر پور میں عربی و فارسی کے استاد تھے۔ شجر لکھنوی سے شرفِ تلمذ رکھتے تھے۔ اردو، فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ 1930 میں انتقال ہوا۔

منشی بدری ناتھ شبنم دربھنگوی بھی فارسی اور اردو میں دسترس رکھتے تھے۔ وہ علم رمل سے بھی واقف تھے۔ وہ مرشد حسن کامل دھرم پوری کے شاگرد تھے۔ ان کا انتقال 1910 میں ہوا تھا۔ وہ حقیقت آشنا شاعر تھے۔ مواد، موضوع، لفظیات اور طرزِ فکر و احساس کے اعتبار سے دل پر گزرنے والی اور روح میں اترنے والی کیفیت کو بیان کرنے میں مہارت رکھتے تھے۔ اظہارِ غم کی جلوہ آرائی اور اظہارِ ذات کی شکستہ پائی ان کے کلام میں دیکھی جا سکتی ہے۔

گھیرے ہے ہمیں درد و غم و رنج و مصیبت   مجمع یہی رہتا ہے ہمیشہ مرے گھر پر
ہو جائے وصال اپنا کہ ہو جائیں سبکدوش   بارِ غمِ فرقت تو اٹھایا نہیں جاتا
چلے تھے خانۂ کعبہ کو جا پہنچے کلیسا میں   کدھر نشہ میں الفت کے چلے تھے ہم کدھر ٹھہرے

متھلانچل کے دیگر غیر مسلم ادبا و شعرا میں منشی راجندر سہائے عشرت دربھنگوی، بابو پنجاب رائے طاہر دربھنگوی، اٹل بہاری لال اسیر دربھنگوی، جنگ بہادر جنگ، پرتھی چند لال صبا، گلاب چند گلاب، پدما نند افسر، بھگوتی پرشاد ہمراز، بابو مہیشور پرشاد جوش، بھولا ناتھ مائل مدھے پوروی، مہابیر ببر، رام پرشاد کھوسلہ ناشاد، پنڈت بندریشوری بسمل سیوانی وغیرہ شامل ھیں، جنھوں نے اردو میں لکھا اور محسوساتی و جذباتی عناصر کو بنیاد بناکر اردو کے فروغ میں حصہ لیا ھے۔

لیکن غم آلود احساس کے ساتھ ان کے کلام میں دیگر نقش گری بھی ملتی ہے:

برابر ہوں کب پا یہ انسان کے   کہ انگلی ہے چھوٹی بڑی ہاتھ میں
قصور ہے شبنم جو مضمون کا   قلم رہتا ہے ہر گھڑی ہاتھ میں

بابو اودھ بہاری سنگھ بیدل (ولادت: 1868)، موضع بترا، ضلع سیتا مڑھی کے رہنے والے تھے۔ معزز بھومی ہار برہمن خاندان میں پیدا ہوئے۔ لنگٹ سنگھ کالج، مظفر پور میں عربی و فارسی کے استاد تھے۔ شجر لکھنوی سے شرفِ تلمذ رکھتے تھے۔ اردو، فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ انھیں تصوف میں بھی خاصی دلچسپی تھی۔ 1930 میں انتقال ہوا۔ مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی سے عربی، فارسی، اردو اور طب کی تعلیم حاصل کی۔

منشی مہاراج سنگھ مطلب دربھنگوی منشی درباری لال کے بیٹے تھے۔ اپنے دور کے معروف شاعر منشی بدری ناتھ شبنم دربھنگوی کے شاگردوں میں شامل تھے اور اردو و فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ غزلوں کے علاوہ ان کی کہہ مکرنیاں بھی دستیاب ہوئی ہیں۔ غزل کے دو اشعار ملاحظہ کریں۔

ہمیشہ ٹیڑھے وہ رہتے ہیں ہم سے   گھمنڈ ان کو ہے اپنے بانکپن کا
وہن میٹھا ہوا اپنا بھی مطلب   کیا جب وصف اس شیریں دہن کا

متھلانچل کے دیگر غیر مسلم ادبا و شعرا میں منشی راجندر سہائے عشرت دربھنگوی، بابو پنجاب رائے طاہر دربھنگوی، اٹل بہاری لال اسیر دربھنگوی، جنگ بہادر جنگ، پرتھی چند لال صبا، گلاب چند گلاب، پدما نند افسر، بھگوتی پرشاد ہمراز، بابو مہیشور پرشاد جوش، بھولا ناتھ مائل مدھے پوروی، مہابیر ببر، رام پرشاد کھوسلہ ناشاد، پنڈت بندریشوری بسمل سیوانی وغیرہ شامل ہیں، جنھوں نے اردو میں لکھا اور محسوساتی و جذباتی عناصر کو بنیاد بنا کر اردو کے فروغ میں حصہ لیا ہے۔

مضمون کا اختتام اپنے اس قطعہ سے کرتا ہوں۔

ہے عالموں کی، صوفیوں، سنتوں کی سرزمیں   علم و ادب کا نام بھی روشن ہوا یہیں
اب بھی زبانِ اردو کے خدام ہیں یہاں   اس واسطے زمین ہے متھلا کی دلنشیں
یوں تو زبان میتھلی چلتی گلی گلی   لیکن زبان زد رہی اردو کی شاعری
تہذیبیں ہو گئیں یہاں مدغم کچھ اس طرح   پائی ہے میتھلی نے بھی اردو سے روشنی

■

Dr. Imam Azam
Regional Director (MANUU) Kolkata Regional Centre
1-A/1, Chatu Babu Lane (Mosin Hall), Third Floor
Kolkata - 14 (West Bengal)
Mob.:8902496545
Email.: imamazam96@gmail.com

'گلزار نسیم' میں ایہام گوئی کی شمیم رواں

سرور مہدی

ایہام کا نام آتے ہی سطح خیال پر ایک مسترد شدہ اور معتوب صنعت کا تصور ابھرتا ہے جس نے بیشتر ناقدین کے مطابق اردو شاعری کو سادگی خیال و مضمون کے اعتبار سے کافی نقصان پہنچایا۔ اس ضمن میں صرف ناقدین ہی کا کردار نہیں ہے بلکہ ایہام گوئی تحریک کے فوراً بعد شعرا کے ایک گروہ نے ہی اس کے خلاف علم بغاوت بلند کردیا جس میں مرزا مظہر جان جاناں علم بردار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ایہام گوئی کو صرف لفظی گورکھ دھندا کہہ کر کلی طور نظرانداز کردینے سے ہم حقیقت اور واقعیت کی شاہراہ سے بہت دور رہ جاتے ہیں۔ 'ریختہ' کے ابتدائی دور میں ایہام گوئی کی تحریک نے جس طرح اس نومولود زبان کو لفظ و معنی کے اعتبار سے وسعت بخشی، اسے بآسانی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ خان آرزو، شاہ حاتم، شاکر ناجی، آبرو اور مضمون وغیرہ نے اپنی کدّ وکاوش سے ذومعنی الفاظ تلاش کیے اور الفاظ کو دوہرے معنی عطا کرتے ہوئے دامن لفظ و معنی کو وسیع کیا۔ اس طرح بے شمار مقامی زبانوں کے الفاظ اردو زبان کا حصہ بن گئے۔ اس سے ذخیرۂ الفاظ فراواں ہوتا چلا گیا۔ حالانکہ ایہام گوئی کا ذکر آتے ہی دبستان دہلی کی اٹھارویں صدی کے زمانی دائرے میں ذہن مقید سا ہو جاتا ہے، تاہم اسے صرف اس عہد تک محدود نہیں کیا جاسکتا۔ ایہام گوئی کا مبدا اکثر اصناف سخن اور بے شمار صنائع کی طرح دکن کی ادبی فضا ہی ہے، البتہ اس صنعت کو دہلی میں عروج بخشنے والے شعرا بڑی تعداد میں میسر آئے جنھوں نے ایہام گوئی کے ذریعہ ''ریختہ'' کو الفاظ کے نقطہ نظر سے کافی تونگر کیا۔ فطری تبدیلیاں فی زمانہ ناگزیر رہی ہیں اور یہ تبدیلیاں عہد کی ضرورت کے عین مطابق رہی ہیں۔ جب اردو کے ادبی سفر کے آغاز میں کثرتِ الفاظ کی ضرورت تھی تو ایہام گوشعرا نے زبان کو مالا مال کیا اور جب ابتدائی ضرورت کا یہ کام مکمل ہو چکا تو دامن فکر و خیال کو موتیوں سے بھرنے کے لیے ایہام مخالف تحریک سے وابستہ شعرا نے اپنی تگ و دو کا آغاز کردیا۔ یہیں سے دبستان دہلی اپنی طے شدہ سمت کی جانب پورے عزم سے گامزن ہوجاتا ہے اور سادگی خیال، دلسوزی طبیعت اور سلاست زبان کی اپنی خاص پہچان کے ساتھ ادبی تاریخ میں اپنے نشانات محفوظ کرالیتا ہے۔ ایہام گوئی کا قافلہ اسی منزل پر ٹھہرتا نہیں ہے بلکہ اٹھارویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں دبستان لکھنؤ اس کی نئی جلوہ گاہ کے روپ میں منصۂ شہود پر ابھرتا ہے۔ لکھنؤ کا پرتعیش اور فارغ البال ماحول ایک بار پھر ایہام گوئی کے لیے مناسب اور سازگار ثابت ہوتا ہے۔ لاتعداد لکھنوی شعرا کے ساتھ ساتھ نوجوان شاعر پنڈت دیاشنکر نسیم نے بھی اس میدان میں اپنی جولانی طبع کا نہ صرف مظاہرہ کیا بلکہ بڑے بڑے قدآور شعرا سے اپنا لوہا بھی منوالیا۔ لکھنؤ کا یہ کشمیری الاصل، جواں سال اور جواں فکر شاعر خود بھی صلاحیت اور جودت طبع سے سرشار تھا، دوسرے خواجہ حیدر علی آتش جیسے قادر الکلام استاد کی رہنمائی نے فن کو مزید جلا بخشی۔ اپنی ذاتی خوبیوں اور آتش کی راہنما روشنی میں نسیم نے مثنویوں کی دنیا میں ''گلزار نسیم'' جیسی شاہکار تخلیق پیش کی جسے دنیائے فن و پرکاری قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ ایک طولانی کہانی کو اپنی چابکدستی سے مختصر اشعار میں پیش کرکے نسیم نے کوزے میں سمندر تو بند کیا ہی، علم بیان و علم بدیع کی دنیا میں بھی ایک ہنگامہ برپا کردیا۔ اس مثنوی میں صنائع و بدائع کے اعتبار سے گفتگو کرنے کی بڑی گنجائش موجود ہے لیکن سردست ایہام پر بحث مقصود ہے جس کا مثنوی میں جابجا دریا سا رواں ہے۔

ایہام پر سیر حاصل گفتگو سے قبل اس کی رسمی تعریف ناگزیر ہے۔ ماہرین عروض اور ادبا کی پیش کردہ تعریف کے مطابق ایہام کے معنی 'وہم میں ڈالنا' ہیں۔ شعر کا بنیادی لفظ ذومعنی ہوتا ہے جن میں ایک معنی قریب کے ہوتے ہیں اور ایک بعید کے۔ شاعر کی مراد بعید کے معنی ہوتے ہیں۔ حالانکہ بہت سے اشعار اس قبیل کے بھی کہے گئے ہیں جن میں دونوں معنی مراد لیے جاسکتے ہیں اور کبھی کبھی تو قاری متذبذب ہوجاتا ہے کہ کون سے معنی مراد لے کیونکہ دونوں ہی معنی مفید مطلب معلوم ہوتے نظر آتے ہیں۔ اسی بنا پر عظیم نقاد اور عروضی شمس الرحمن فاروقی نے ایہام خالص، ایہام پیچیدہ اور ایہام مساوی نام سے اس کی تین قسمیں بتائی ہیں۔ ان اقسام کی بنیاد ہی قریب و بعید کے معنی مراد لیے جانے کے اوپر رکھی گئی ہے۔ اس صنعت کو توریہ اور توہیم وغیرہ ناموں سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ اردو زبان و ادب میں اس صنعت کی تدخیل وترقی کے تعلق سے ناقدین کی مختلف آرا سامنے آئی ہیں جن میں اسے کہیں فارسی ادب اور کہیں ہندی ادب سے مستعار بتایا گیا ہے۔ اس سلسلے میں دنیائے نقد و تذکرہ کی قدآور شخصیت محمد حسین آزاد کے نظریے کی صدائے بازگشت آج تک سنائی دے رہی ہے ''اردو میں ایہام گوئی نے ہندی دوہوں کی بنیاد پر ترقی کی ہے۔''

'گلزار نسیم' میں گوناگوں فنی خوبیوں کے درمیان رعایت لفظی کی غالب صنعت چشم تماشا کو خیرہ کرتی ہے۔ شاید ہی کوئی مصرع یا شعر رعایت لفظی سے مبرا ہو۔ اسی رعایت لفظی کے بطن سے اشتقاق، شبہ اشتقاق، سیاقۃ الاعداد،

مراعات النظیر، تضاد اور ایہام وغیرہ صنائع پیدا ہوئے ہیں۔ ایہام مجردہ (جس میں معنی قریب وبعید کے مناسبات کا کچھ ذکر نہ ہو) کے مقابلے میں ایہام مرشحہ (جس میں معنی قریب کے مناسبات مذکور ہوں) زیادہ لطیف ثابت ہوتا ہے کیونکہ ایہام مرشحہ جمالیاتی وفنی حس کو جذب کرنے کی فطری صلاحیت رکھتا ہے۔ مجرد ایہام میں قاری سرسری قرأت میں صنعت کو محسوس کیے بغیر گذر بھی جاتا ہے۔ پنڈت دیا شنکر نسیم نے ترجیحاً ایہام مرشحہ کو جابجا اختیار کیا ہے۔ حمد ونعت ومنقبت کے بعد دعائیہ اشعار کا آغاز ہوتا ہے تو نسیم یوں دعا کرتے ہیں۔

طعنہ سے زبان نکتہ چیں روک
رکھ لے مری اہل خامہ میں نوک

'خامہ' کی لفظی مناسبت سے قاری کا خیال یک لخت نوک قلم کی جانب مبذول ہو جاتا ہے جو ایہام کی اصطلاح میں معنی قریب ہیں جبکہ شاعر کی مراد قلمکاروں اور شعرا کے درمیان خود کی 'عزت وتوقیر' ہے۔ اگرچہ آورد کا احساس قارئین کو مثنوی کی قرأت کے دوران مسلسل ہوتا رہتا ہے، لیکن مثنوی کے حوالے سے بات کی جائے تو اس کے نفس مضمون کے مقابلے میں اس کا انداز پیشکش زیادہ اہم ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کو فنی زیورات سے سجانے کے لیے آورد اور عرق ریزی کو بڑا عیب نہیں قرار دینا چاہیے۔ نسیم نے ایک ہلکے سے اشارے اور ترشح کے ساتھ لفظ 'خامہ' کا سہارا لیتے ہوئے بڑی خوبصورتی سے 'نوک' کا استعمال کیا ہے۔ 'خواستگاری جناب باری' سے یعنی دعائیہ حصے کا آخری شعر بھی بڑے غیر محسوس طریقے سے قاری کو وہم میں ڈال دیتا ہے۔

جو نکتہ لکھوں کہیں نہ حرف آئے
مرکز پہ کشش مری پہنچ جائے

'نکتہ' اور 'حرف' ایک قریبی مناسبت رکھتے ہیں لیکن شاعر لکھنؤ کے قدآور شعرا کے مقابل ہے۔ لفظوں کی نکتہ چینی کا ماحول عام ہے۔ نکتے اور نقطے دونوں پر خوب خوب گرفت شاعرانہ تہذیب ہے۔ ایسی فضا میں نسیم کی حضرت باری سے دعا ہے کہ معاصرین ان کے نکتوں میں 'عیب' نہ تلاش کر سکیں۔

نسیم مثنوی کی کہانی کا آغاز کرتے ہیں۔ 'صہبائے کہنہ' کو 'دو آتشہ' کرتے ہوئے تشنگان ادب کے آگے اشعار ومصارع کے ساغر وپیمانے کا دور شروع ہوتا ہے۔ پورب کا شہنشاہ سلطان زین الملوک پانچویں فرزند کے دیدار سے نابینا ہو جاتا ہے۔ عیسیٰ چشم کحال 'گلستان ارم' میں نمو پانے والے 'گل بکاؤلی' کا عرق بادشاہ کے لیے تجویز کرتا ہے۔

اس نے تو گل ارم بتایا
لوگوں کو شگوفہ ہاتھ آیا

ایہام مرشحہ کے ذریعے 'گل' کی مناسبت سے 'شگوفہ' چمنستان کی اکائی کا اشارہ بن جاتا ہے لیکن شاعر تو اسے 'موضوع بحث' کی حیثیت سے پیش کر رہا ہے کہ ارباب سلطنت، خواص اور عوام کی زبان پر 'گل ارم' کا ہی چرچا تھا۔ کہانی کے تسلسل میں جب یہ خبر راندہ درگاہ بادشاہی تاج الملوک کو ملتی ہے تو اس موقع کا ذکر کرتے ہوئے نسیم کی طبیعت 'گل' کی مناسبت سے ذومعنی لفظ تلاش کر کے لاتی ہے۔ 'گل' و 'گلشن' کے ساتھ 'ہوا' کا لفظ کیسا مناسب معلوم پڑتا ہے۔ نسیم کو ایسی ہی 'دھن' لگی رہتی ہے۔

گل کی جو خبر سنائی اس کو
گلشن کی ہوا سمائی اس کو

ادھر تو شہزادے کے چاروں سادہ لوح بھائی جمعیت کے ساتھ آگے آگے نکلے، ادھر تاج الملوک بھی گل تلاش کرنے کی 'دھن' میں افتاں وخیزاں چلا۔ لیکن چاروں بھائیوں کی تلاش بسیار کا نتیجہ یہ نکلا

بلبل ہوئے سب ہزار جی سے
گل کا نہ پتہ لگا کسی سے

'بلبل'، 'ہزار' اور 'گل' کا حسین مثلث جہاں رعایت لفظی کی ایک نادر فضا تیار کرتا ہے وہاں 'بلبل' کا محاوراتی پہلو اور 'ہزار' کا توریہی پہلو ہر فن دوست طبیعت میں وجد کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔

آخر کار چاروں بے عقل شہزادے 'فردوس' میں دلبر نامی بیسوا کی محل سرا کے قریب پہنچ جاتے ہیں۔ مسافروں کو جوئے میں مکر وفریب کے ذریعے لوٹ لینا دلبر بیسوا کا شغل تھا۔ دروازے پر اسی مقصد سے اس نے نقارہ نصب کر رکھا تھا۔ شہزادے بھی بغیر سوچے سمجھے اپنی بد عقلی کا نقارہ بجا بیٹھتے ہیں۔

بے جا و بجا نہ سمجھے ان جان
نقارہ بجا کے ٹھہرے نادان

مذکورہ شعر میں تجنیس کے پہلو بہ پہلو ایہام کا رنگ نہایت نکھرا ہوا ہے۔ اردو شعرا کے یہاں بعض مقامات پر ایک لفظ کے بجائے جملے کے دو یا سہ لفظی ٹکڑے سے لطیف ایہام پیدا کیا گیا ہے جو شعر کے جزوی مفہوم کو معنوی پہلو سے متنوع کرتے ہوئے 'ادماج' سے قریب تر ہوتا ہوا معلوم پڑتا ہے۔ یہاں شعر کے ایک ٹکڑے سے دوہرے معنی برآمد ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں مومن کا یہ شعر پیش کیا جا سکتا ہے۔

شب جو مسجد میں جا پھنسے مومن
رات کاٹی خدا خدا کرکے

مومن کے شعر میں 'خدا خدا کرکے' جس طرح قریب وبعید کے دو معنی کی طرف اشارہ کر رہا ہے اسی طرح نسیم کے درج بالا شعر میں 'ٹھہرے نادان' سے دو معنی برآمد ہوتے ہیں۔ ایک تو قریب کے معنی ہیں کہ جیسے دق الباب کرنے والا دستک دیکر توقف کرتا ہے، وہ نادان شہزادے بھی نقارہ بجا کر ٹھہرے۔ بعید کے مرادی معنی یہ ہیں کہ وہ سب غور وفکر کیے بغیر نقارہ بجا کر نادان ٹھہرے۔ ان اشعار کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ نسیم کے ذہن پر لکھنوی رنگ کیسا چڑھا ہوا ہے کہ قافیوں کا مصرف برائے مصرف نہیں کیا بلکہ اسے بھی صنعتوں سے باندھ دیا ہے۔

شہزادہ تاج الملوک جب شہر 'فردوس' میں وارد ہوتا ہے اس وقت تک اس کے احمق برادران دلبر کی فریب کاریوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ تاج الملوک ایک دایہ کے گھر قیام پذیر ہوتا ہے جو تاج الملوک کے چہرے میں اپنے گم شدہ بیٹے کی شباہت پا کر اسے گھر لے جاتی ہے۔ تاج الملوک کو وہیں اپنے بھائیوں کے حالات سے آگاہی ہوتی ہے۔ حسن تقدیر سے اسے زر ومال بھی ہاتھ آتا ہے اور دلبر کا سارا فریب بھی اس پر آشکار ہو جاتا ہے۔ تب وہ اپنے عزم کا اظہار یوں کرتا ہے۔

سوچا کہ اب تو ہم ہیں آگاہ
جیتے ہیں تو جیت لیں گے ناگاہ

'جیتنا' اور 'جینا' دو مختلف مصادر ہیں جن کی الگ الگ شکلوں سے شبہ اشتقاق تو برآمد ہوا ہی ہے اسی 'جیتے' لفظ میں اشتقاق کے شبہ کی وجہ سے ایہام بھی اپنی جھلک دکھاتا ہے اور پڑھنے والا فن کی تہ در تہ سحرکاری میں کھو سا جاتا ہے۔

آخرش اپنے عزم واستقلال اور حکمت ودانائی کے بوتے پر تاج الملوک دلبر بیسوا کو زیر کر لیتا ہے۔ دلبر تاج الملوک سے ازدواج کی خواستگاری کرتی ہے تب تاج الملوک اپنے مقصد کو آشکار کرتا ہے کہ اسے 'ارم' سے 'گل بکاؤلی' کی دستیابی مقصود ہے۔ دلبر اسے پریوں کے ساتھ مقابلے سے منع کرتی ہے تو تاج الملوک کے یہ الفاظ ہوتے ہیں۔

انسان کی عقل اگر نہ ہو گم
ہے چشم پری میں جائے مردم

کس فنکارانہ صناعی کا ثبوت دیتے ہوئے نسیم نے مردم کے دونوں معنوی پہلوعیاں کیے ہیں اور کمال یہ ہے کہ اگر 'مردم' کے معنی قریب 'پتلی' کو ملحوظ رکھا جائے تو اس کی

مناسبت سے لفظ 'چشم' موجود ہے۔ اگر معنی بعید 'آدمی' مراد لیے جائیں تو آغاز شعر میں لفظ 'انسان' موجود ہے۔ اس طرح اس شعر میں ایہام مرشحہ کے ساتھ ایہام مبینہ (جہاں معنی بعید کے مناسبات ذکر کیے جائیں) کا بھی لطف حاصل ہوتا ہے۔ نسیم کا خاص کمال یہی ہے کہ وہ لفظ کے ہر زاویے کو دیکھتے ہیں اور شعر کے مختلف الفاظ کے ساتھ معنوی طریقے سے باندھ کر اس کے شش پہلو روشن کردیتے ہیں۔

تاج الملوک راہ مقصد کی منزلوں کو طے کرتا ہوا ایک ویران جنگل میں جا پہنچتا ہے۔ دراصل یہ جنگل بادشاہ ارم کی سرحد تھی جہاں ایک مہیب صورت دیو پہرہ پر متعین تھا۔ تاج الملوک کی اس موقع پر کیا حالت ہوئی، اسے بیان کرتے ہوئے نسیم نے لکھا ہے۔

سر پر پایا بلا کو اس نے
تسلیم کیا قضا کو اس نے

شاید ہی کہیں ایہام مجردہ اس سے زیادہ پر اثر اور لطیف ہوتا ہو۔ لفظ 'تسلیم' کی دوہری معنوی حیثیت کی جانب کہیں کوئی اشارہ نہیں کیا گیا۔ البتہ مثنوی میں خود کہانی کا متن تمہیداً اور تدریجاً کچھ اشارے کرجاتا ہے۔ اگر 'قضا' کو دیو کا استعارہ مان کر شعر کے مضمون پر نظر کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ تاج الملوک خوف کے زیر اثر اسے آداب بجا لایا۔ وہیں دوسرے رخ سے پورے منظر اور تاج الملوک کی بے سروسامانی پر نظر کی جائے تو قاری اس مفہوم تک پہنچتا ہے کہ تاج الملوک نے اپنی موت کو یقینی سمجھا۔

پھر جب تاج الملوک اپنی حکمت سے دیو کو رام کرلیتا ہے تو دیو اپنے دوسرے بھائی کو آواز دیتا ہے۔ دوسرا دیو صدائے بازگشت کی طرح آتا ہے۔ تب پہلا دیو اپنے بھائی سے تاج الملوک کا تعارف ان لفظوں میں کرواتا ہے۔

حال اس نے کہا کہ قول ہارا
ہے پیر، یہ نوجواں ہمارا

شعر میں لفظ 'نوجوان' فوری قرینہ دیتا ہے کہ 'پیر' سے 'بوڑھا شخص' مراد لیا جائے لیکن تاج الملوک تو نوجوان ہے۔ دوسرے معنی ہیں کہ یہ نوجوان شخص ہمارا 'مرشد و استاذ' ہے اور یہی معنی مراد ہیں۔ اس شعر میں واہمہ پیدا کرنے کے لیے لفظ 'نوجوان' کا سہارا لیا گیا ہے۔ اس اشارے یا ترشیح کے باعث یہاں ایہام مرشحہ ہے لیکن ترشیح بھی دو طریقے سے دیا جاتا ہے۔ کہیں معنی قریب کے مناسبات تضادِ لفظی کی صورت میں ہوتے ہیں، کہیں تضاد کے علاوہ کوئی اور مناسبت ہوتی ہے۔ اس بنا پر ایہام مرشحہ کی بھی ایہام تضاد اور ایہام تناسب کے نام سے اقسام ذکر ہوئی ہیں۔

'گلزار نسیم' کی اصل کہانی میں زین الملوک اور فرخ (بکاؤلی پری اس نام سے مرد بنی ہوئی تھی) کے مابین گفتگو میں ضمنی کہانیاں بھی آتی ہیں۔ فرخ بادشاہ زین الملوک سے ایک ایسے بادشاہ کی حکایت بیان کرتا ہے جسے اولاد نرینہ نہ تھی۔ ہر بار اس کے یہاں بیٹی متولد ہوتی تھی۔ بادشاہ ہر دفعہ قتل دختر کے عظیم گناہ کا مرتکب ہوتا تھا۔ اس بار جب بیگم امید سے ہوئیں تو اس ظالم بادشاہ نے قسم کھائی کہ بیٹی جننے کی صورت میں دختر و زوج دونوں کو قتل کردے گا۔ حکمت خداوندی سے پھر دختر ہی پیدا ہوئی۔ اہل خانہ نے زن و دختر کو شرِ سلطان سے محفوظ رکھنے کے لیے نجومیوں اور رمالوں کو اپنا ہمنوا کرلیا اور بادشاہ کو اطلاع دی گئی کہ بیٹا تولد ہوا ہے لیکن ایک خاص عمر تک بادشاہ سلامت اپنے فرزند کو نہیں دیکھ سکتے۔ ایک مدت کے بعد دیدار پسر کا آرزومند سلطان بیتاب ہوا اور بیٹے کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس واقعہ کو چند الفاظ کے پردوں میں بڑے اختصار سے نسیم نے ذکر کیا ہے۔

وہ گندم جو نما تھی بالی
مردانہ لباس سے نکالی

'گندم' اور 'جو' کے کنایہ میں نسیم نے پوری حکایت کا جو خلاصہ کیا ہے وہ قابل تعریف تو ہے ہی، گندم اور جو کے دو معتبر اشاروں نے 'بالی' لفظ میں غضب کا ایہام پیدا کیا ہے۔ گندم اور جو کی زرعی بالیاں کس نے نہیں دیکھیں لیکن نگاہ شاعر کا مقصود و مرکوز تو شہزادہ نما شہزادی کی 'کم عمری' ہے۔ حالانکہ یہ بات پوری طرح محسوس ہورہی ہے کہ نسیم نے بڑی ذہنی کاوش اور عرق ریزی سے مضمون کو ان چند الفاظ میں باندھ کر پیش کیا ہے۔ اصطلاحی پیرائے میں کہیے تو آورد کی بو مشام نقد میں پوری طرح محسوس ہورہی ہے لیکن نسیم مضمون کے ساتھ ساتھ ایہام کی صنعت کو پہنچانے میں پوری طرح کامیاب ہوئے ہیں۔ کسی طرح کے انسداد یا معنوی انفصال کا شائبہ تک نہیں گذرا۔

مثنوی 'گلزار نسیم' میں از اول تا آخر رعایت لفظی کے بعد جس صنعت کی بہتات ہے وہ ایہام ہی ہے۔ یقیناً 'گلزار نسیم' سرتاسر اس کی شمیم سے معطر ہے۔ ایہام کے خدوخال سنوارنے میں اکثر جگہوں پر رعایت لفظی نے اپنا کردار ادا کیا ہے اور ایہام کو واضح سے واضح تر کر دکھایا ہے۔ بنظر اختصار ایسے چند اشعار اس مثنوی سے پیش کیے جاتے ہیں۔

اس گل کے ہاتھ جو زر آیا — جاں بازی کو سوئے دلبر آیا
(زر= مال، سنہری رنگت)

آہستہ پھرا وہ سرو بالا — سایہ نہ اس پری پہ ڈالا
(سایہ= آسیب، پرچھائیں)

منھ دھوتی جو آنکھ ملتی آئی — پر آب وہ چشم حوض پائی
(پر آب= پانی سے بھری، ڈبڈبائی ہوئی)

بولا جب اس نے باندھے بازو — کھلتا نہیں کس طمع پہ ہے تو
(کھلنا= باندھنا کا متضاد، ظاہر ہونا)

دیکھے جو جوہرات کے ڈھیر — سب من کی ہوس سے ہوگئے سیر
(من= قیمتی جواہر، دل)

وہ چتر کے زیر سایہ بیٹھے — افسر سب پایہ پایہ بیٹھے
(پایہ= تخت کا پایہ، عہدہ)

کر یاد کہیں چہ ذقن کو — کودے نہ کنویں میں باولی ہو
(باولی= کنویں پر بنی عمارت، دیوانی)

سلطاں فیروز رشکِ جم تھا — نوشہ مسند پہ جم کے بیٹھا
(جم= جمشید بادشاہ، ڈٹ)

اژدر نظر آیا در کا سایہ — سمجھا وہ پلنگ چار پایہ
(پلنگ= بستر، چیتا)

یوسف کی خبر لے او زلیخا — زنداں میں ہے وہ عزیز مرتا
(عزیز= بادشاہ مصر، پیارا)

اس بات سے انکار مشکل ہے کہ دیا شنکر نسیم کو جس طرح بیانیہ پر قدرت حاصل ہے اسی طرح فن پر بھی ان کی گرفت نہایت مضبوط ہے۔ یہ نسیم کی افتادِ طبع تھی، مذاق لکھنؤ کا اثر تھا یا اساتذہ لکھنؤ و دبستان دہلی سے حریفانہ کشاکش تھی کہ انھوں نے اپنی مثنوی کو صنعتوں کے نقطۂ نظر سے بھی ایک طلسم کدہ بنادیا۔ ایہام گوئی کے تناظر میں دہلوی شعرا نے الفاظ کو معنویت کے اعتبار سے وسیع کیا ہی تھا، دیا شنکر نسیم نے بھی بشمول تمام لکھنوی شعرا کے اپنا خاطر خواہ حصہ ادا کیا۔ غزلوں، نظموں اور دیگر ان اصناف میں جہاں جذبات اولیت رکھتے ہوں، یہ صنعت غیر ضروری تصور کی جاسکتی ہے لیکن مثنوی جیسے بیانیہ اور فنی لحاظ سے پیچیدہ صنف سخن میں اسے تزئین کاری اور حسن شاعری پر ہی محمول کرنا چاہیے۔

حوالہ جات

1 گلزار نسیم مرتبہ رشید حسن خاں
2 آب حیات از محمد حسین آزاد
3 تعبیر کی شرح از شمس الرحمن فاروقی
4 اردو شاعری میں ایہام گوئی از مولوی عبدالحق
5 تاریخ ادب اردو از جمیل جالبی
6 اردو شاعری کے دبستان: نورالحسن نقوی

■

Sarvar Mahdi
Assistant Professor(Urdu)
H.S.College Udakishunganj
Madhepura -852220 (Bihar)
Mob.: 9452259955

اشک کی شاعری میں خوف اور تنہائی

غلام مصطفیٰ ضیا

پروین کمار اشک جدید اردو شاعری کا معتبر نام ہے۔ ویسے تو اشک صاحب کی شاعری میں اور بھی بہت سارے موضوعات ہیں جنھیں مکالمے کا حصہ بنایا جاسکتا ہے، لیکن میں ان کے شعری مجموعے 'چاندنی کے خطوط' سے تنہائی اور خوف کے وہ مناظر پیش کرنا مناسب سمجھوں گا جو پروین کمار اشک نے اپنی شاعری میں جیے ہیں اور جن سے ان کا شاعرانہ مزاج میل کھاتا دکھائی دیتا ہے۔

چاندنی کے خطوط میں اشک کی روح کو جھانکنا در اصل ہمارے عہد کے موضوعات کو تلاش کرنا ہے۔ میں اس ضمن میں قبل از وقت کچھ بھی نہیں کہہ سکتا ہوں کہ اشک نے اپنے عہد کو مکمل طور پر شاعری کے سانچے میں ڈھال کر پیش کر دیا ہے، لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ ان کے شریف اور خاموش مزاج تک جو آوازیں پہنچ رہی تھیں اور جن تجربات نے ان سے شعری تصاویر بنا رکھیں تھیں وہ واقعی ہمارے عہد کے بڑے مسائل ہیں۔

آج کا انسان کربناک زندگی، بھیڑ بھاڑ میں تنہائی، شہروں اور بازاروں میں جس خوف کا شکار ہے وہ خود اس انسان کا اپنا بنایا ہوا مسئلہ ہے۔ مستقبل قریب اور ماضی قریب دونوں ہی اب انسان کے لیے محض کتابی دنیا رہ گئے ہیں۔ یعنی ہم انسان تو ہیں لیکن ہمارا معیار قدروں سے منطبق نہیں رہا ہے، ہمارے اپنے رشتوں سے جذباتی نہیں ہے، اور سب سے اہم مسئلہ یہ کہ ہم مستقبل سے پر امید نہیں ہیں۔ ایسا انسان صرف روبوٹ کہا جاسکتا ہے یا اس روبورٹ نامی آلے کی طرح رہ جاتا ہے، وہ کسی بھی حالت میں دوسروں پر بھروسہ نہیں کرسکتا اور نہ ہی کوئی ایسا تجربہ کرنے میں خیر کا اُمید وار ہوسکتا ہے۔

پروین کمار اشک نے انسان کی اس حالت کو خود اپنے اندر محسوس کرتے ہوئے پیش کیا ہے۔ وہ تیز رفتار زندگی کی موجوں میں جنم لینے والے شاعر تھے جس سے ہم کرۂ ارضی پر انسان کے لیے تاریخ کی تبدیلی کے تیز ترین گذرے دو سو سالوں میں دیکھتے ہیں۔ اشک ایسی تبدیلی کو انسانی قدروں کے موافق نہیں سمجھتے ہیں۔ جس کا انھوں نے اپنی شاعری میں بارہا ذکر بھی کیا ہے۔ مثلاً

مہاجر کا مکاں خالی ہے لیکن
میں در کھولوں تو کوئی بد دعا دے
بزرگوں کا بس اک کمرا بچا کر
تو جب چاہے پرانا گھر گرا دے

اشک صاحب کے ایسے اشعار کی روشنی میں مظہر امام صاحب کا ان کی کتاب پر موجود تبصرہ قابل غور ہے، وہ فرماتے ہیں:

''بچھڑنے کا دکھ اور گھر آنے کی طلب کو بڑی اپنائیت، نرمی اور رسان کے ساتھ پیش کرنا شروع کر دیا، عجیب بات ہے کہ بے گھر ہونے کا تجربہ تو اس سے پہلے کی نسل کو ہوا تھا، مگر اس تجربے سے پھوٹنے والا کرب نئی نسل کے حصے میں آیا۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ جن مکانوں میں نئی نسل پروان چڑھی اس کے مکیں، بے گھر ہونے کے ہولناک تجربے سے تازہ تازہ گزرے تھے۔ لہٰذا ان کے چاروں طرف اُداسی بقول شاعر بال کھولے پھر رہی تھی۔''

(چاندنی کے خطوط، ص10)

وہ مہاجر جن کے در کھولنے والے موجود ہیں اشک ان کی اس کیفیت کو یہاں سمجھتے ہوئے پیش کر رہے ہیں، نئی نسل پرانے حالات سے مطابقت کی خیر خواہ نہیں ہوسکتی ہے اور پرانے لوگوں کے لیے نئی بستیاں کوفت کا سبب ہیں، یہی وہ موڑ ہے جس سے آگے نکل کر ہم ایک بالکل نئے دور میں داخل ہوجائیں گے اور پرانی قدروں سے کلیتاً نابلد ایک نئے سماج کا سویرا کر دیں گے۔ لیکن اشک کی شاعری ایسے موڑ پر کھڑے دو لوگوں کی داستان کی طرح ہے جو کشمکش و پیچ میں ہیں۔ ایک ہے جو دو قدم پیچھے کھینچنا چاہتا ہے اور ایک دوسرا ہے جو دس قدم آگے بڑھنے کا خیر خواہ ہے اشک فرماتے ہیں۔

کر دیا راکھ جس سے وقت کے انگاروں نے
اشک اسی بستی میں اپنا بھی تو گھر ہوتا تھا

وقت کی تپش اس قدر گہری ہے کہ اشک اس سے محسوس کرتے ہوئے اپنے ماضی کے گھروں کی راکھ تک ڈھونڈنے میں ناکام نظر آتے ہیں اور ایک طرح کے اکیلے پن سے نبرد آزما ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اشک کی شاعری میں غم وحزن کا احساس بھی حالات کے رہین منت ہے، جیسے۔

اس سے زیادہ میرا اس کا کیا رشتہ
وہ دکھ دیتا ہے میں شکر مناتا ہوں

اشک نے اپنی حسی دنیا کو جس طریقے اور جن اطوار پر دیکھا ہے انھیں اس طرح بھی پیش کیا ہے۔

بھیڑ میں اکثر شامل ہم　　بھیڑ میں اکثر دونوں گم
گھر میں رہوں تو حکم سفر　　سفر سے لوٹوں تو گھر گم

آج کا شاعر خود اپنی تلاش کا ہی متقاضی نہیں ہے وہ اپنے متعلقات میں بھی کوئی رشتہ یا تعلق پیدا کرنے میں ناکام ہوتا جا رہا ہے۔ یہ شاعر نہیں در حقیقت معاشرے کی ایک یونٹ ہے جس سے شاعری کی زبان حاصل ہے۔ یونٹ سے یہاں ایسی یکسوا کائی مراد لی جائے جو لمحوں اور قسطوں میں تقسیم زندگی کو محسوس کرنے کی شعوری کاوش اور ذہنی صلاحیت کو بروئے کار لا سکنے کی حالت میں ہے تو میرے خیال میں اس لفظ کی وضاحت اور تفصیل کا انشراح ممکن ہے کہ ہوسکے۔ معاشرے کی یہ کیفیت جو اشک کو ہزاروں کے بیچ تنہا چھوڑ کر رکھ دیتی ہے اس سے وہ ایک جگہ یوں پیش کرتے ہیں۔

بیچ میں اک تنہا تھا اشک
چاروں اور عتاب سا تھا

حالات واقعی کربناک ہوسکتے ہیں اور وہ کسی بھی انسان کو عتاب جیسی ایک کیفیت کے بیچ تنہائی کے ہمراہ چھوڑ کر خود تماشائی ہوسکتے ہیں۔ آج کا انسان نسبتاً بہت ہی آرام دہ، دولت اور آسائش کے ساتھ زندگی جی رہا ہے، سفر کی مشکلات سہل ہیں دور دراز نامی کوئی مقام نہیں رہ گیا ہے،

اشیا کے ذخائر ہیں اور خریدنے والے بھی پسند و ناپسند میں آزاد ہیں، یعنی زندگی کو کسی بھی زاویے سے دیکھیں تو اس میں گزرے وقتوں کی پریشانیاں بالکل غائب ہیں، ایک ایک روٹی کو ترسنے والے درجنوں بسکٹ شوق فرماتے ہیں اور یہ کوئی ارتقائی چیز نہیں ہے بلکہ بستر پر جیسے کوئی کروٹ بدل کر دوسری جانب ہوسکتا ہے ایسے ہیں پچھلے دو سو سالوں میں ایک زبردست کروٹ بدل کر وقت کچھ کا کچھ ہو چکا ہے، دوسرے لفظوں میں یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ ہمارے مردہ دوبارہ زندگی پا کر اس دور کی اگر کسی ایک چیز کو بھی دیکھ لیں تو وہ حیرت سے ہی مر جائیں۔ لیکن ان سب تبدیلیوں، ظاہری آسائشوں، ترقی یافتہ دنیا کی کامیابیوں کے بیچ ایک انسان ہے جو یہ محسوس کر رہا ہے کہ اس سے ان سب حالات نے چوطرفہ عتاب کا شکار بنا کر تنہائی کا رفیق کار بنا دیا ہے۔ اشک کے لیے یہ تنہائی شاعری بنتی گئی اور انھوں نے اس سے ہر طریقے سے پیش بھی کیا ہے، فرماتے ہیں۔

میں تالاب کی قید میں منجمد ہوں
یہ پانی کسی سمت بہتا نہیں ہے
میرا آئینہ اشک کہتا ہے مجھ سے
بہت دن ہوئے تم کو دیکھا نہیں ہے

آج ہم جس دور سے گذر رہے ہیں، یہ اپنی پہچان کا دور رہا ہی نہیں ہے بلکہ وہ آئینہ جس کے سامنے ایک کردار کی صورت میں ہم بچپن، جوانی، بڑھاپے کو دیکھتے تھے اور خود محسوس ہوتا تھا کہ ہماری زندگی میں خود ہمارا اپنا ایک عکس ہے، زندگی ہم سے ہے اور ہماری رضامندی یا ہمارا چاہنا ہمارے فیصلے یا ہمارا چلن ہی در اصل تعمیر کا وسیلہ ہے۔ اشک کے جس مجموعۂ کلام کو میں نے اپنے اس مقالے میں مطالعے کے طور پر سامنے رکھا ہے یعنی ''چاندنی کے خطوط'' اس میں وہ بارہا اپنے عہد کی روداد سناتے نظر آتے ہیں۔ اشک کی شاعری میں موت کے غلبے کی کیفیت کا اندازہ لگانا بھی ضروری ہے یہ احساس ان کے لیے کافی تکلیف دہ رہا ہے اور وہ موت جیسے تجربے کو زندگی میں اور اپنی شاعری میں محسوس کرتے نظر آتے ہیں، مثلاً

لاکھ تو چہرہ بدل کر چھپ کے گھومے بھیڑ میں
وہ تجھے پہچان لے گا ڈھونڈ کر لے جائے گا۔

اسی طرح ان کی شاعری میں ایک دوسری بھیانک تصویر مکان اور گھر کے الفاظ کی صورت میں ابھر کر سامنے آتی ہے۔ جس سے وہ تنہائی اور اکیلے پن کے ساتھ منسلک سمجھتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

غم کے سفر سے لوٹ کر پہنچا جب اپنے گھر
بانھوں میں لے کے رو پڑا میرا مکاں مجھے

گھروں کے اندر کوئی نہیں تھا دیواروں پر نام لکھے تھے
کتنے جنگل سمائے ہیں اس میں گھر میں رہ کر جو شخص تنہا ہے

یا

رہتا نہ میرے ساتھ مکاں دیکھ تو لیتا
جلتا نہ میرے غم میں دھواں دیکھ تو لیتا

اس عہد میں ہماری تعمیر کاری اشک کی شاعری میں اور عام مشاہدات کی رو سے بھی انسان کی تنہائی کا ایک بڑا ذریعہ ہے، آج ستر ستر منزلہ عمارتیں، عظیم الشان مکانوں کے مہیب سایے، بلند بانگ گھروں کے خالی خالی کمرے، یہ سب ہر انسان کو بڑے سے بڑے شہر میں بھی اکیلا بناتے جا رہے ہیں۔ غریب لوگوں کی جھونپڑیوں میں گھر کے سارے افراد ایک ہی دستر خوان پر کھانا کھا کر ایک دوسرے کی معمولی کھانسی تک سے بھی باخبر رہا کرتے تھے، والدین اولاد کو چوبیسوں گھنٹے سامنے پا کر تسلی بخش رہا کرتے تھے، بچوں کی پرورش دادا دادی، نانا نانی کی کہانیوں اور جن پریوں کی انجان دنیا میں گم صم ہوا کرتی تھی، ایسے حالات میں یہ بات کسی طرح بھی قابل قبول نہیں تھی کہ گھر کا کوئی کمرہ یا صحن میں کوئی جگہ کھلکھلاہٹ، زندگی سے بھرپور سانسوں کی رہین منت نہ ہو۔ لیکن آج بڑی بڑی حویلیوں کی دیواروں میں نام کی تختیاں لٹکا دی گئی ہیں، عہدے چپکا دیے گئے ہیں، پیسے کی چکا چوند نے عمارتیں تو بنوائیں ہیں لیکن ان میں ہنسی خوشی کو جگہ دینا بھول گئے ہیں۔ پیسے انڈیل کر پڑوسیوں اور مہمانوں کے راستوں میں دیواریں کھڑی کر دی گئیں ہیں، ہنسنے ہنسانے والوں کا نام و نشان تک غائب ہوتا جا رہا ہے۔ ان بھی کیفیات کو اشک کی شاعری میں ایک مجبور ترین زندگی کی صورت میں پڑھا جا سکتا ہے، وہ گھر یا مکان جو رہنے کی جگہیں تھیں آج ان کی دیواروں پر موٹے حروف سے لکھا جا رہا ہے کہ اندر آنا منع ہے، اشک کے مزاج میں پنجابیت تھی اور ایک پنجابی اردو شاعر ان سب حالات میں تنہائی اور خوف کے مشترکہ احساسات سے روگردانی نہیں کر سکتا تھا۔ ان کی شاعری کی اس فضا کو کسی ایک معمولی نقطۂ نظر یا عام بیانیہ سے تعبیر نہیں کیا جانا چاہیے، کوئی بھی تخلیق کار اپنے احساسات، مشاہدات اور تجربات کو جن زوایوں سے پیش کرتا ہے، قاری کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ ایسے تجربات کی اطلاقی اور مشاہداتی صورتوں کو محسوس کرے۔

پروین کمار اشک میں ایک باغی انسان موجود تھا جو انھیں بارہا مجبور کیا کرتا تھا کہ وہ کسی بھی قید میں نہ رہیں اور کسی خاص منشور کے تحت اپنے احساسات کی قربانی دینے سے حتی الامکان گریز کریں، مثلاً ان کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

میرے سایے میں درد پلتے ہیں
مثل دیوار ہوگیا ہوں میں
قبر میں گھر بنا لیا میں نے
ہاں! زمیں دار ہوگیا ہوں میں

یہ وہ کیفیت ہے جس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا، خود انسان کی ذات میں موجود ایسے کردار کو جینا پڑتا ہے۔ اگر خود کسی انسان کے اپنے ہی سایے میں درد پلنے لگ جائیں اور وہ انجماد کا شکار ہونے لگے تو دیوار میں موجود بے حسی سے زیادہ اس کا اپنا وجودی تصور بھی ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اشک کے کسی ایک ہی شعری مجموعے کی یہ خاص کیفیت نہیں ہے بلکہ ان کا سارا شعری سرمایہ لگ بھگ لگ بھگ اس انداز کا نمونہ ہے۔ اس قبیل کے دوسرے اشعار کو مشاہدے میں رکھا جائے تو ان کی شاعری میں خوف اور تنہائی کا پہلو مزید نکھر کر سامنے آتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً

میرے آنسو پینے شام کو اک چڑیا
میری گود میں آبیٹھے اڑ کر چپ چاپ

اسی طرح ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں۔

میں دیکھوں اشک تو آئینہ بولے
ذرا چہرا بدل حالات والا

یا

دوا دعا کی کمی تو نہیں مگر یہ درد
جو آنکھ اٹھا کے بھی دیکھے نہ دوسروں کی طرف

ان کا ایک مخصوص بیانیہ ہے، ایک ایسا انسانی تصور ہے جو کئی طرح کے مصائب میں صرف انسان ہونے کی حالت کو پیش کرتا دکھائی دیتا ہے۔ پرندوں کو اپنے دکھوں میں شامل کر لینے والے، دیواروں سے گفتگو کرتے نظر آتے، آئینے سے شہادت وصولنے والے اور سب سے اہم یہ کہ ہر جانب مایوسی اور لاچاری کے در و دیوار میں بند کرداروں کی تلاش ان کی شاعری کا مرکزی نقطۂ نظر ہے جس سے کسی طرح بھی انکار نہیں کیا جا سکتا، اشک ہمارے عہد کے ایک بے مثال اور انوکھی وضع کے شاعر تھے جو تنہائی میں جیے اور بالکل خاموشی میں دنیا سے رحلت فرما گئے۔ ان کی شاعری کا ہر ایک کردار اپنی حقیقی دنیا میں جیتا جاگتا انسان ہے جس سے لگ بھگ آج کے حالات میں ہر دوسرے انسان کے درمیان تلاش کیا جا سکتا ہے اس لیے کہ خوف اور تنہائی تو موجودہ نسل کا بڑا ہی اہم اور پیچیدہ نفسیاتی مسئلہ ہے جس سے آج کا ہر ایک شاعر فلسفی عالم اور نکتہ داں پیش کرتا نظر آتا ہے۔

■

Dr. Ghulam Mustafa Zia
R/o, Sanai Tehsil Surankote
District: Poonch - 185121 (J&K)
Mob.: 7889368623

مخمور صدری

اخبار 'سحر سامری' لکھنؤ

'سحر سامری' اودھ کا ایک بے باک، بے لاگ اور مقبول عام اخبار تھا۔ لکھنؤ سے یہ ہفتہ وار اخبار 17 نومبر 1856 مطابق 1273ھ کو جاری ہوا۔[1] مالک اور مہتمم پنڈت بیج ناتھ تھے جو پنڈت صاحب کے مطبع سرائے معالی خاں کے پاس بال کرشن کے چھتے سے متصل واقع تھا، چھپ کر شائع ہوتا تھا۔[2] اس کے پہلے چار نمبر امیر مینائی نے مرتب کیے تھے اور پانچویں نمبر سے اس کی ادارت رگھبر زائن عیاش کی طرف منتقل ہوئی۔[3] جو اخبار کے آخر تک اس کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے اور اخبار خوش اسلوبی کے ساتھ برابر وقت پر شائع ہوتا رہا۔[4] کچھ عرصے کے بعد عیاش صاحب بھی رخصت ہوئے اور پنڈت بیج ناتھ نے خود ادارت سنبھالی لیکن یہ باران سے نہ اٹھ سکا اور منشی شنکر دیال فرحت کو انھوں نے ادارتی ذمے داری سونپ دی۔ فرحت صاحب کے زمانۂ ادارت میں اخبار اور مطبع کے جملہ ذمے داروں کے نام پرنٹ لائن میں شائع ہوتے تھے۔[5] ماہانہ چندہ 12 آنے، سالانہ پیشگی 7 روپے 8 آنے اور سال گزرنے کے بعد 10 روپے 8 آنے تھا۔[6]

''مالک پنڈت بیج ناتھ، مہتمم منشی بہاری لال، پرنٹر منشی درگا پرشاد، ایڈیٹر منشی دیال شنکر فرحت، کاتب کنور چندی سہائے نیال، پریس مین رجن لال، مطبع ثمر ہند لکھنؤ۔''

اخبار 'سحر سامری' کی ظاہری ساخت طلسم لکھنؤ سے بہت مشابہت تھی۔ اس کا سرورق بیل بوٹوں سے آراستہ ہوتا تھا۔ لوح کے اوپری سرے پر چاند کا نشان ہوتا تھا اور چاروں طرف اشعار درج ہوتے تھے۔ اس کی ظاہری وضع سے لگتا تھا کہ دونوں اخبار ایک ہی مدیر نکال رہا ہو۔ پہلا صفحہ اخبار کے منظوم اشتہار سے پُر ہوتا تھا، جو اخبار کا مکمل تعارف نامہ تھا۔[7] عام طور پر آٹھ صفحات پر مشتمل دو کالم ہوتے تھے۔ خبریں دوسرے صفحے سے شروع ہوتی تھیں۔ لکھنؤ کی تازہ خبریں ملنے پر ضمیمہ بھی شائع ہوتا تھا، کبھی ضرورت کے مطابق صفحات کی تعداد بھی بڑھادی جاتی تھی۔ اخبار کے پہلے کالم میں لکھنؤ، واجد علی شاہ اوران کے مقدمے کی خبروں کو خاص جگہ دی جاتی تھی۔ قارئین کی دلچسپی کے لیے لطیفے اور پہیلیاں وغیرہ بھی چھاپ دیے جاتے تھے۔ دوسرے کالم میں ہندستان کے دیگر مقامات اور بیرونی ہند کی خبریں اردو، فارسی اور انگریزی اخبارات سے اخذ کی جاتی تھیں۔ ان اخباروں میں صادق الاخبار دہلی، دہلی اردو اخبار، سلطان الاخبار، کشف الاخبار، گلشن نوبہار، تاج الاخبار، اخبار مرتضائی، حبیب الاخبار، مفید خلائق، جام جہاں نما کے علاوہ انگریزی اخبار سرکاری گزٹ اور سینٹرل اسٹار، وغیرہ شامل ہیں۔ اخبار کے اپنے نامہ نگار تھے۔ خبر کی صحت کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ اخبار کا اسلوب مرصع، مقفی اور حکائی انداز میں ہوتا تھا جو خصوصیت سے لکھنؤ میں پسند کیا جاتا تھا۔ ترتیب بھی اچھی ہوتی تھی، خبروں کو مختلف عنوانات کے تحت سلیقے سے ترتیب دیا جاتا تھا۔

محمد عتیق صدیقی نے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ 'سحر سامری' کا آخری شمارہ 18 مئی 1857 (جلد 1، نمبر 23،27 شہر رمضان المبارک 1273ھ) کا دستیاب ہوا ہے۔ ممکن ہے اس کے اور شمارے نکلے ہوں گے جو ہم تک نہ پہنچے ہوں۔ اسی بیچ پورے ہندوستان میں بغاوت شروع ہوگئی۔ لکھنؤ کی زندگی پر بھی اس کے اثرات پڑے اور اخبار بند ہوگیا۔

موضوعات کے اعتبار سے سحر سامری بہت اہمیت کا حامل اخبار ہے۔ ان کے صفحات میں آزادی کھونے کا دکھ، غلامی کے شدید احساس، انگریز اور انگریزی نظام سے بیزاری کے ساتھ ساتھ اس دور کے لکھنؤ کی اقتصادی زبوں حالی اور سماجی بے اطمینانی کی چلتی پھرتی تصویریں ہم کو نظر آتی ہیں۔ انقلاب حکومت جو تبدیلیاں اپنے جلو میں لایا تھا اور اس کے جو اثرات لکھنؤ اور اہالیان لکھنؤ پر مرتب ہوئے تھے ان کے پورے پورے اور مستند نقشے بھی ان اخباروں میں ہم کو ملتے ہیں۔ سحر سامری کی ناقص فائل علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی لائبریری میں محفوظ ہے۔[8]

اخبار سحر سامری اس دور میں جب کہ اخبار سن طفولیت سے گزر رہا تھا اور سرکار کمپنی کا اثر وسطوت ہندوستانی آفتاب کو گہنا رہا تھا اس کا ایڈیٹر بے جھجک بے باک ہو کر سرکار کمپنی بہادر پر تنقید کرتا تھا۔ سلطان واجد علی شاہ کا صرف ثنا خواں ہی نہیں تھا بلکہ ان کی آمد کا سخت منتظر بھی تھا اور سرکار کمپنی بہادر کو نہ صرف غاصب اور بدعہد تصور کرتا تھا بلکہ اس کو ظالم اور دغاباز، حیلہ جو اور فریب کار بھی سمجھتا

تھا۔ لیکن یہ سب تصورات ذہن میں پوشیدہ ہی نہیں تھے بلکہ صفحات قرطاس پر حقائق بن کر عوام میں مشتہر ہوتے تھے۔ وہ سرکار کمپنی کی ملازمت کو بھی اپنے سلطان کے ساتھ بے وفائی پر محمول کرتا تھا۔ اس کے بیانات نہایت اشتعال انگیز اور شورش خیز ہوتے تھے۔ انگریز دشمنی کا لاوا اس کے ہر جملے سے ابل رہا تھا۔[9]

اخبار 'سحر سامری' کا جب اجرا ہوا تھا تو پورا ہندوستان بالخصوص لکھنؤ نہایت بحرانی دور سے گزر رہا تھا۔ ہر طرف طوائف الملوکی پھیلی تھی۔ قتل، خون ریزی، چوریاں اور آتش زنی کی واردات عام سی بات تھی، انسانی زندگی سخت کشمکش میں مبتلا تھی۔ کمپنی سرکار کی غیر معمولی سختیاں، غیر متوقع بے ایمانیاں عوام و خواص کے حوصلے پست کر رہی تھیں۔ یہ اخبار اپنے عہد کے لکھنؤ کی سیاسی افراتفری، معاشی بدحالی اور بے انتظامی کا عکاس تھا۔ اس اخبار میں بارک پور میں چربی والے کارتوسوں پر دیسی سپاہ کی بغاوت، ایرانی فوج کی پیش قدمی اور انگریزوں کے خلاف ملک میں چاروں طرف پھیلنے والی بے چینی اور شورش کی خبریں تواتر کے ساتھ شائع ہوتی تھیں۔

اخبار 'سحر سامری' میں ہمیں معزول واجد علی شاہ کے قیام کلکتہ کے کوائف، ان کے مقدمے کی خبریں، جن کی پیروی کے لیے ان کی والدہ اور ان کے ولی عہد لندن گئے تھے، اور واجد علی شاہ کے متعلقین و متوسلین سے متعلق خبریں تفصیل سے ملتی ہیں۔ ان خبروں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ اودھ واجد علی شاہ کے ساتھ انگریزی حکومت نے بڑی زیادتی اور ناانصافی کی ہے۔ دوسرے یہ کہ برطانوی انصاف پر بہ ظاہر ہر شخص کو بھروسہ تھا اور اسی کی بنا پر اس کا بھی یقین تھا کہ واجد علی شاہ کو ان کا کھویا ہوا اقبال اور اودھ والوں کو ان کا کھویا ہوا بادشاہ واپس مل جائے گا۔ ہر خبر کی تہ میں امید کی یہی فسوں کاری کارفرما نظر آتی ہے۔[10] اخبار 'سحر سامری' کو واجد علی شاہ سے بڑی عقیدت تھی۔ اخبار کو بھی یقین تھا کہ واجد علی شاہ کی دوبارہ حکومت قائم ہو جائے گی۔ چنانچہ ملکہ انگلستان سے اپیل کے لیے واجد علی شاہ کی والدہ اور ولی عہد بہادر کے انگلستان پہنچنے اور وہاں کی تفصیلات کو 'خبر فرحت اثر' کے عنوان سے یکم دسمبر 1856 کے اخبار میں شائع کیا تھا:

خبر فرحت اثر: ''مرزا باقر صاحب، مرزا ولی عہد بہادر کے مصاحب، سفر ولایت میں ولی نعمت کے ہمراہ تھے۔ اقبال کی طرح مقبول بارگاہ تھے۔ وہاں پہنچ کر ولی نعمت نے نامہ بری کا منصب عنایت کیا، حضرت سلطانی عالم کے پاس رخصت کیا۔ انگریزی ڈاک کے جہاز پر سوار ہوئے۔ 16 ربیع الاول 1273ھ کو دریا سے پار ہوئے۔ حضرت کے نام اپنے حضور کی تحریر لائے۔ گھڑی وغیرہ اور بہت سے تحائف دل پذیر لائے۔ ان کی زبانی بے دل چسپ کہانی ہے۔ ابھی تک ملکۂ فرنگ مصروف سیر و شکار ہیں، مسافران لندن محو انتظار ہیں۔ مگر تیر مدعا نشانے کے قریب تر ہے۔ ملکۂ فرنگ کی شکار سے جلد پلٹنے کی خبر ہے۔ بڑے بڑے انگریز جلیل الشان، اونچی اونچی کچہری، پارلیمنٹ کے ارکان ہم زبان ہیں کہ دادگستر کے آنے تک تیغ انصاف کے جوہر نہاں ہیں۔ ادھر ملکہ شکار سے پھریں ادھر برگشتہ طالعوں کے دن پھر جائیں گے، جتنے ستارے گردش میں ہیں رشک ندامت کی طرح چشم فلک سے گر جائیں گے۔ پھر وہی بادشاہ اودھ کا دور دورہ ہوگا۔ وہی حشمت کا انداز، وہی سلطنت کا ظہور ہوگا۔ شکستہ خاطروں کو تسلی دیتے ہیں۔ اراکین دولت کو تشفی دیتے ہیں کہ گھبرانے کی بات نہیں، دنیا کی کسی بات کو ثبات نہیں، ان ہی حکام پارلیمنٹ نے اپنے اپنے مکانات خالی کر دیے۔ ایک ایک کو آنکھوں میں جگہ دی، دلوں گھر دیے، ملکۂ فرنگ نے پرچہ پیام بھیجا، جناب عالیہ (والدہ واجد علی شاہ) کے نام بھیجا کہ بادشاہی کوٹھی میں اتر لیجیے۔ ہر طرح کا سامان آرام سرکار سے بے خطر لیجیے... اضطراب کا مقام نہیں، گھبرانے کا ہنگام نہیں، ڈیڑھ مہینے میں ہم آتے ہیں، تمھیں مراد کو پہنچاتے ہیں...''[11]

اودھ کی ضبطی کے بعد یہ عام خیال ہو گیا تھا کہ ہندوستان کی باقی تمام ریاستوں کا بھی ایک ایک کر کے خاتمہ ہو جائے گا اور اس طرح ساری ریاستیں ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر نگیں ہو جائیں گی۔ اس سلسلے کی یکم دسمبر 1856 سحر سامری میں 'متفرقات' کے عنوان سے ایک خبر ملتی ہے:

''اخبار سے مخل ہے کہ سارا راجپوتانہ ممالک انگلیشیہ میں شامل ہوگا، حیطۂ تصرت کمپنی انگریز بہادر میں داخل ہوگا۔ لیکن زمانہ اس کے ظہور کا کسی پر ظاہر نہیں، کوئی اچھی طرح اس سے ماہر نہیں، جتنا عیاں ہے برملا بیاں ہے، حیدرآباد، کشمیر اور گوالیار میں بدانتظامی سے بڑا فتور ہے، پہلے ان ہی ملکوں کا انتظام منظور ہے۔''[12]

اودھ پر کمپنی انگریز بہادر کا تسلط ہوتے ہی تقریباً سات آٹھ لاکھ آدمی بے روزگار ہو گئے۔ ہر طرح کی تباہی کے ساتھ گاؤں کے گاؤں ویران ہوتے چلے گئے۔ سید خورشید مصطفیٰ رضوی نے ایک انگریز رغز ریز کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''ہزاروں شرفا، امرا اور حکام جو شاہی زمانے میں بڑے عہدوں پر فائز تھے، اور عیش و عشرت کی زندگی گزارتے تھے، مفلسی اور محتاجی کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور ان کے ماتحت ملازم اور مصائب بے روزگاری کا شکار ہیں۔[13] اودھ کی شاہی فوج کو بھی برخاست کر دیا گیا جو ستر ہزار پر مشتمل تھی۔ جس کے نتیجے خوفناک بن کر سامنے آئے۔ سر سید احمد خاں نے بھی لکھا ہے کہ ''جب افغانستان سرکار نے فتح کیا، لوگوں کو بڑا غم ہوا، جب گوالیار فتح ہوا، پنجاب فتح ہوا، اودھ لیا گیا، لوگوں کو کمال رنج ہوا، کیوں ہوا؟ اس لیے کہ ان کے پاس کی ہندوستانی عملداریوں سے ہندوستانیوں کو بہت آسودگی تھی۔ نوکریاں اکثر ہاتھ آتی تھیں، ہر قسم کی ہندوستانی اشیا کی تجارت بہ کثرت تھی۔ ان عملداریوں کے خراب ہونے سے زیادہ افلاس اور محتاجی ہوتی تھی۔''[14]

11 دسمبر 1856 کے اخبار سحر سامری کی اس خبر سے اندازہ ہوتا ہے:

''7 فروری سے 25 اگست 1856 تک بحکم نواب گورنر صاحب بہادر بعضے افسران افواج کی تقسیم (تنخواہ) کے لیے خزانہ کمپنی بہادر سے احکام جاری ہوئے۔ علی بخش خاں رسالہ دار، اور نادر حسین خاں کمیدان پلٹن اصغری، دو دو سو روپے کی ماہواری (مقرر) ہوئی۔ جو لوگ توپ خانوں کے داروغہ، یا تلنگوں کے کپتان تھے۔ بڑی بڑی عمارت کے سامان تھے۔ ان کے لیے سو سو روپے تنخواہ ٹھہری۔ نجیبوں کے افسروں کو اسی اسی روپے دینے کی ماہ بہ ماہ ٹھہری۔ بخشی مریٹ صاحب کے نام پچاس میں پنشن کی تقسیم کا حکم آیا، سرکار نے افسروں (فوج) کو تو خوب مطمئن فرمایا۔ خدا کرے کہ ملازمین شاہی کی بھی پرورش ہو جائے۔ ہزار آدمی خزانے کا نوکر بے معاشی سے تڑپ رہا ہے، ان کی بھی باری آئے، رعیت پروری دور و نزدیک مشہور ہو جائے.... امید کی کوفت بے معاشوں کے دلوں سے دور ہو جائے۔''[15]

اسی شمارے میں بے عنوان سے ایک خبر ملتی ہے جس میں لکھنؤ کے تاجروں نے سرکار کمپنی کے خلاف احتجاجاً اپنی دکانیں بند کر دی تھیں۔ یہ احتجاج ایک ہڑتال کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ اس کو دیکھتے ہوئے سرکار کمپنی نے ایک اشتہار جاری کر کے قانون واپس لے لیا۔ تب ساری دکانیں کھلیں:

''شرف الدولہ بہادر، تنخیات مستاجر نے، دوکانداران یحییٰ گنج پر ان دنوں کڑی کی، سب دوکانداروں نے دوکانیں بند کر کے تاروالی کوٹھی کی راہ لی، ڈپٹی کمشنر بہادر کی پناہ لی، بے داد کی داد چاہی، اپنی مراد چاہی، کئی دن تک بازار بند رہا، خرید و فروخت کا کاروبار بند رہا، آخر ڈپٹی کمشنر بہادر کا مزاج انصاف پر آیا، مستاجر کے نام ایک مضمون کا پروانہ جاری فرمایا کہ اگر دستور کے خلاف نیا سیاق نکالو گے، آپ

کو آفت میں ڈالوگے، دوسرے کو یہ مستاجری عطا ہوجائے گی، آزار رسانی تمہارے حق میں بلا ہوجائے گی، جب جاری یہ پروانہ ہوا، فریادی اپنے گھر کو روانہ ہوا، ناشاد گئے تھے شاد آئے۔''16

لکھنؤ پر جب سرکار کمپنی کا پورا تسلط ہوگیا تو لکھنؤ کی معاشی حالت بہت خراب ہوگئی، ضروریات زندگی کی قلت سے لوگ نان شبینہ کے محتاج ہوگئے۔ اجناس کی قیمتیں آسمان کو چھونے لگیں۔ اس مہنگائی کا اثر عوام پر گہرا پڑا۔ اخبار سحر سامری نے 15 دسمبر 1856 کے شمارے میں 'لکھنؤ میں غلہ کی نایابی' کے عنوان سے اس دور کے حالات اور حکمرانوں کی بداعمالیوں اور بدانتظامیوں کا انکشاف اپنے لکھنوی اسلوب میں یوں کیا ہے:

''ان دنوں غلے کی گرانی ہے، گرانی خاطر کی ارزانی ہے۔ اس قدر مہنگا اناج ہے (کہ) آسیائے فلک بھی دانے کو محتاج ہے۔ فاقہ کشوں کی برق آہ شرر بار سے قرص ماہ جل گیا۔ گردہ نان خورشید لشکر غم پاؤں کے نیچے کچل گیا۔ جو رفاقہ سے افاقت نہیں۔ کون ہے جسے درد شاقہ سے رفاقت نہیں۔ بے معاشی نے ہر قماش کے آدمی کا اطمینان کھو دیا، جس دانا نے حال بربادیٔ سلطنت سنا، رو دیا۔ دور عہد شاہی کیا مٹا، گویا گیہوں گھن لگا۔ ایک تو معاش نہیں، جائے تلاش نہیں۔ دوسرے وفور غم سے گندمی رنگ ہر بشر نیلا ہوا۔ گویا مفلسی میں آٹا گیلا ہوا۔ یہ مثل ہے ایک دوست کی زبانی۔ 'چار بلائے چودہ آئے۔ دے دال میں پانی'۔ میزبان مہمان کو کیا بلائیں، نہ خود کھائیں، نہ ان کو کھلائیں۔ خون دل بجائے شراب ہے۔ لخت جگر کباب ہے۔ بدحواسی سے زوال اعتدال مزاج ہوا۔ ہر غریب روٹی کے ٹکڑے کو محتاج ہوا...... ایک روپیہ کا سولہ سیر آتا ہے۔ بنیوں کی بن آئی۔ گو خریداروں کو گھاٹا ہے۔ تیل مہنگا، گھی سستا ہے۔ محتاج روتا ہے، تو انگر ہنستا ہے۔ چکنی چپڑی باتوں سے تدبیر نہیں چلتی، بہت سر پٹکتے ہیں دال نہیں گلتی، حاکم اس طرف عنان توجہ موڑتا نہیں، بس کیا کریں، اکیلا چنا بھاڑ پھوڑتا نہیں....''17

اخبار سحر سامری کے مطالعے سے اس عہد کے اودھ کا پورا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ سیاسی بحران، بے انتظامی، عوام کی زبوں حالی، لوٹ مار اور صنعتوں کی بربادی کو اخبار نے بہت ہی دردانگیز انداز میں پیش کیا ہے جس کو پڑھ کر روح کانپ اٹھتی ہے اور شاہی رعیتوں کے ساتھ جو کچھ ہوا، آنکھیں خون کے آنسو رونے لگتی ہیں۔

اسی طرح کی ایک خبر ملاحظہ ہو:

''زہے خط لکھنؤ: افسوس ہے کہ بے معاشی نے سب کو مجبور کردیا، بڑے بڑے طبیعت داروں کو معذور کردیا، ورنہ یہاں کے صناع تو ایسی ایسی صنعتیں دکھاتے کہ دیکھنے والوں کے ہوش جاتے، ہیہات کہ یہ خطہ اب بالکل بے چراغ ہوگیا، دست نیرنگی روزگار سے تاراج یہ باغ ہوگیا۔ فلک نے سہارا معاش کا بگاڑ دیا، سہاگھر تلاش کا مٹا دیا، ہزاروں گھبرا کر شہر سے نکل گئے ہزاروں سسکتے ہیں، بے مائیگی سے جانوں پر آبنی ہے۔ سر پٹکتے ہیں ارحم الرحمین رحم فرمائے تو پناہ ہے نہیں تو اب یہ شہر چند ہی روز میں تباہ ہے۔''18 (نادری، ص 400)

'سحر سامری' سرکار کمپنی کی ملازمت کو اپنے سلطان شاہ کے ساتھ غداری اور بے وفائی پر محمول کرتا تھا۔ اگرچہ معاشی بدحالی اور فاقہ کشی کی وجہ سے ہر کوئی دوچار تھا۔ اس کے باوجود کوئی شاہی ملازمت چھوڑ کر سرکار کمپنی بہادر کا نوکر یا پنشن خوار ہونا بہت معیوب سمجھتا تھا۔ اگر کوئی اتفاقاً یہ حالت مجبوری اسے قبول کر بھی لیتا تھا تو اسے طعنہ دیا جاتا تھا اور اسے سماج میں ذلیل کیا جاتا تھا۔ اس کی ایک مثال دیکھیے:

''حیدر علی کپتان پلٹن نادری کے حضرت کے ملازم قدیم تھے، حق نمک ولی نعمت سے خوب ادا ہوئے یعنی باوجود اس کے کہ حضرت سلطان عالم نے ان کو بدستور ملازم رکھا تھا، نمک پروردہ قدیم کا خیال پرورش لازم رکھا تھا باعث خام طبعی سے پینشن سرکار انگریزی لی۔ عنایت شاہی پر مطلق نظر نہ کی خدائے کریم ہمارے شاہ جہاں پناہ کو جلد کامیاب فرمائے آئینہ مراد سے شاہد مقصود جلوہ دکھائے۔''19

1857 کی جنگ آزادی سے قبل ہر اخبار میں یہ خبر اس قدر عام تھی کہ شاہ ایران فوج لے کر ہندوستان آرہا ہے اور انگریزوں سے جنگ کرے گا۔ سحر سامری میں بھی اس عنوان کے تحت خبریں ملتی ہیں۔ اس سے انگریزوں کے خلاف ہندوستانیوں کی بے بسی اور مفلوج ذہنیت کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ شاہزادہ شیراز کی آمد کے بارے میں اخبار نے لکھا کہ

''ایک شیراز کا شہزادہ مع دس ہزار سپاہ جرار اور پندرہ ضرب توپ رعد خروش قدم بڑھائے چلا آتا ہے۔ ہمت مردانہ وجرأت... بہادران بیشہ دلاوران جسارت کو دکھاتا ہے، قریب پہنچ کے سرکاری فوج سے بے شک دست وگریباں ہوگا۔ خدا جانے کس کس کا جامہ حیات چاک دامان ہوگا۔''20

اٹھارہ سوستاون کی جنگ کا آغاز تو مئی کے مہینے میں ہوا مگر 1857 کے اوائل ہی سے بغاوت کے بادل ہندوستان کے آسمان پر منڈلانے لگے تھے۔ اس سلسلے کی ان گنت خبریں سحر سامری میں ملتی ہیں۔ لکھنؤ میں جب کارتوسوں کا معاملہ سامنے آیا تو سحر سامری بھی پیچھے نہ تھا۔ اس اخبار نے بھی دبی ہوئی چنگاریوں کو اور ہوا دی جس سے ملک میں انگریز دشمنی اور بغاوت کا ماحول گرم ہوگیا۔ اس سلسلے کی ایک خبر اخبار 'سحر سامری' میں شائع ہوئی تھی:

''سابق صحائف اخبار سے معلوم ہوا تھا کہ سپاہیان بارک پور عرف اچانک کے واسطے حکم سرکار ہوا ہے کہ ہندوؤں کو ایسے کارتوس ملیں جن کا منہ چربی سے بند ہو اور اہل اسلام کو وہ دیے جائیں جن کا منہ خوک کی چربی سے پیوند ہو یہی باعث ہنگامہ وفساد بے شمار ہے۔ چنانچہ وہ حکم سپاہیوں نے نہ مانا ہر ایک حفظ دین وایمان مناسب جانا۔ اب صاحب سلطان الاخبار فینکس سے ناقل ہے انداز دخل اندازی ملت حاصل ہے کہ دوبارہ وہی حکم برم پور کے سپاہیوں کے واسطے صادر ہوا اور افسر پلٹن کے اطلاع دینے پر ہر فرد وبشر پر ظاہر ہوا۔ چنانچہ سپاہیان ہندو واسلام نے اپنے اپنے مذہب کا پاس کیا، سب نے متفق اللسان جواب دیا کہ احکام سرکار ہمارے سر آنکھوں پر مگر اس حکم کی تعمیل میں فتور ہیں بیشتر جان جائے یار ہے مگر ایمان نہ چھوڑیں گے صرف شکم پروری کے واسطے راہ دین مبین سے رخ نہ موڑیں گے۔ جب افسر نے جواب ان سے صاف پایا اور ان کا محض نظر آیا فوراً چند ضرب توپیں اور سواران جنگی طلب کیے۔ سپاہیان جنگ سب درست کیا۔ لڑنے بھڑنے پر ہر ایک کمر کو چست کیا تمام شب بیدار ہے۔ سعی وکوشش سے ہر طرح ہوشیار رہے کہ مبادا گوروں کی پلٹن بے خبر پا کر حملہ آور ہو اور غفلت قوم

اخبار سحر سامری کے مطالعے سے اس عہد کے اودھ کا پورا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ سیاسی بحران، بے انتظامی، عوام کی زبوں حالی، لوٹ مار اور صنعتوں کی بربادی کو اخبار نے بہت ہی دردانگیز انداز میں پیش کیا ہے جس کو پڑھ کر روح کانپ اٹھتی ہے اور شاہی رعیتوں کے ساتھ جو کچھ ہوا، آنکھیں خون کے آنسو رونے لگتی ہیں۔

میں سب انتظام ابتر ہو۔ غرض کئی روز تک بڑا شور شغف ہوا۔ سرفروشاں راہ دین و ایمان کو یہ امر منظور نہ ہوا۔ اکثر مردم قرب و جوار مال و متاع خانگی زیر زمین دفن کر کے خوف جان سے فرار ہوئے اور مشہور ہے کہ انیس رجمنٹ کے سپاہی اس قدر شور و شر پر تیار ہیں کہ اپنے افسر سے بے اطلاع کلکتہ کی طرف چلے گئے۔ اسلحہ حرب و ضرب سب اپنے ساتھ لے گئے۔ ہمارے نزدیک سرکار عالی وقار کی دانائی سے یہ نہایت بعید ہے کہ رعیت و سپاہ اس قدر ستم شدید ہے۔ خصوص اس زمانے میں کہ ہر طرف سے آتش ہنگامہ جنگ و جدل شعلہ بار ہے، چار جانب سے معرکہ کارزار نمودار ہے۔''[21]

کارتوس کی یہ چنگاری جو برہم پور اور بارک پور کی چھاؤنیوں سے اٹھی تھی۔ آہستہ آہستہ پورے ہندوستان میں آگ کی طرح پھیل جاتی ہے۔ لکھنؤ جہاں کے لوگ انگریزی سرکار سے پہلے ہی سے نالہ تھے اور خار کھائے بیٹھے تھے۔ ہندوستان کے دیگر شہروں کی طرح لکھنؤ فوجی چھاؤنی میں بھی اس کی شروعات ہوگئی تھی۔ جو 'لکھنؤ' کے زیر عنوان سحر سامری نے لکھا تھا کہ

''لکھنؤ:......ان دنوں نیا گل موسیٰ باغ میں شگفتہ ہوا۔ مانند بوئے گل افشائے راز نہفتہ ہوا۔ چھ سو جوانان پلٹن مئیکلس صاحب جو فی الحال ملازم سرکار کمپنی بہادر تھے، کارتوس کاٹنے پر یہاں سے باہر ہوگئے، عدول حکمی پر کمر باندھ کر کشادہ پیشانی سے آمادہ فساد و شر ہوئے۔ ایک چٹھی اس پلٹن سے نزدیک افسران فوج میڈیانوں روانہ ہوئی۔ آخر کار یہ بات افسانہ ہوئی سرکار کو تدارک مد نظر ہوا، منظور دفعیہ آتش شر ہوا، وہ لوگ نافرمانی کے باعث راہ فرمانبرداری سے پھر گئے، فوج جنگی سرکاری ان کے سروں پر سر دست آ پہنچی، نرغے میں گھر گئے، کچھ تدبیر بن نہ آئی دست و پاچہ ہوئے منھ کی کھائی، رنگ چہروں کا خوف سے دھواں ہوا، ہوش چھوٹ گئے، دل ہراساں ہوا، مقابلے سے منھ پھر گیا، پیٹھ دی بغلیں جھانکنے لگے۔''[22]

(11 مئی 1857)

اسی طرح 18 مئی 1857 کے اخبار سحر سامری میں 'خبر بنگالہ' کے عنوان سے ایک خبر قران السعدین سے نقل کی گئی ہے۔ اس وقت سرکار کمپنی کو بغاوت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ انھوں نے بنگال کے تمام نواب لفٹنٹ گورنر کو خطوط کے ذریعے اطلاع دی گئی تھی کہ وہ ہوشیار رہیں اور اپنے علاقوں کی حفاظت کریں:

''اخبار کلکتہ سے روایت ہے۔ دوراندیشی کی حکایت ہے کہ ان دنوں نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کی طرف سے اس مضمون کی سرکلر چٹھیاں زیب قلم ہوئی ہیں۔ بنگالہ کے سب محشریوں (مجسٹریٹوں؟) کے نام رقم ہوئی ہیں کہ اپنے اپنے علاقوں کی خبرداری و حفاظت کریں، ہوشیاری کا دم بھریں۔ یہ خیال صبح و شام ہے۔ نہایت اندیشے کا مقام ہے کہ انیسویں رجمنٹ کے سپاہی جو نوکری سے یک قلم موقوف ہوئے ہے، بغض و عناد میں مصروف ہوئے ہیں......''[23]

اخبار سحر سامری میں مولوی احمد اللہ شاہ کے متعلق بھی خبریں ملتی ہیں، جب فروری 1857 میں وہ لکھنؤ سے فیض آباد چلے آئے تو فیض آباد پر ایک مجاہدانہ رنگ آ گیا اور ان میں فرنگیوں اور عمال کمپنی سے انتقام لینے کی آگ بھڑکنے لگی۔ آپ کے پاس ہزار ہا فدا کار جمع ہونے لگے اور ہر ایک اسلحہ سے آراستہ تھا، اس کے ساتھ ہی ان کو باضابطہ جنگی تربیت اور قواعد کی تعلیم دی جانے لگی۔ یہ خبریں حکام تک پہنچیں، انہوں نے کوتوال شہر کو آپ کے پاس بھیجا کہ قواعد اور اسلحہ بندی کیا معنی رکھتی ہے۔[24] فیض آباد کے ڈپٹی کمشنر یہاں کی جو رپورٹ 17 فروری 1857 کو لکھی اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ 16 فروری کو شام کے وقت لفٹنٹ تھرمس بورن کو اطلاع ملی کہ ایک فقیر مع اپنے چند مریدوں کے شہر کی سرائے میں مقیم ہے۔ لوگ جوق در جوق اس کی زیارت کو آتے ہیں۔ فقیر کا کھلا ارادہ ہے کہ وہ لوگوں میں بغاوت پھیلا کر ان کو بلوہ کے لیے آمادہ کرے۔ چنانچہ تھرمس بورن مع چند سپاہیوں کے وہاں پہنچا اور دیکھا کہ سڑک اور دروازے کے علاوہ سرائے کے اندر بھی لوگوں کا بے حد ہجوم ہے۔ مولانا اس وقت نماز کے لیے (غالباً مغرب کی) تشریف لے گئے تھے۔ واپسی تھرمس بورن نے ان سے بات کی اور کہا کہ وہ ہتھیار جمع کر دیں۔ جب فیض آباد چھوڑیں گے تو ہتھیار واپس مل جائیں گے۔ اس پر مولانا احمد اللہ نے جو فقیرانہ لباس میں تھے، مردانہ وار جواب دیا کہ ''ہم ہتھیار نہیں دیں گے کیونکہ یہ ہمیں اپنے پیر سے ملے ہیں'' اس جواب اور تکرار پر سول گارڈ کے سپاہی بلائے گئے۔ پھر درخواست کی گئی کہ ''ہتھیار واپس کر دو اور آزادی سے شہر کے باہر جا سکتے ہو۔'' جواب پھر دو ٹوک پایا کہ ''فقیر اپنی مرضی سے شہر چھوڑے گا'' اس جواب پر سپاہیوں کو حملے کا حکم دیا گیا۔ ادھر سے مولانا کے ہمراہیوں نے (بموجب رپورٹ تقریباً دس تھے) مقابلے کی ٹھان لی۔ مولانا نے اسپیشل اسسٹنٹ (لفٹنٹ) پر تلوار سونت لی مگر لفٹنٹ مذکور نے مقابلے کی ہمت نہ کی، وہاں سے ہٹ گیا اور پہرہ بٹھا دیا تاکہ وہ مجمع منتشر ہو جائے جو جامع مسجد کے قریب جمع ہو گیا تھا۔ اس کے بعد اس نے مزید فوجی کمک طلب کر لی اور ڈپٹی کمشنر فوربس کو اطلاع کر دی جو دورے پر گیا ہوا تھا۔ 17 فروری کو فوربس مع چند افسروں کے مولانا کے پاس گیا۔ اس کی فہمائش اور سوالات کے جواب بھی اسی دلیری اور بے باکی سے ملے۔ اس پر طے کیا گیا کہ ان فقیروں، پر اچانک حملہ کیا جائے۔ پہرہ دار دستہ، مددگار دستہ، جو رائفل اور سنگینوں سے مسلح تھا۔ اور دیگر سپاہ حملہ آور ہو۔ مگر مولانا کے ساتھیوں نے یہ اشارہ سمجھ لیا اور وہ سب تلواریں سونت کر سپاہیوں پر ٹوٹ پڑے۔ لفٹنٹ ٹامس بری طرح زخمی ہوا جس کو مولانا نے گھائل کیا۔ مولانا کے تین ہمراہی شہید ہوئے خود مع چند جاں نثاروں کے زخمی ہو کر گرفتار ہوئے اور این۔ آئی ہسپتال میں زیر علاج رہے۔[25] اس کی تائید 9 مارچ 1857 کے اخبار 'سحر سامریؔ' کی اس خبر سے بھی ہوتی ہے۔

''فیض آباد سے ایک آشنائے ہمدم کا خط آیا۔ یہ حال صاف لکھا پایا کہ ایک شخص مسلمان رئیس زادگان ملک دکن سے، سات آٹھ آدمی ہمراہ لے کے سرائے فیض آباد میں مقیم تھے۔ آپ کو فقیر قرار دے کے انگریزوں سے مستعد جہاد بے خوف و بیم تھے۔ ہر گلی کوچے میں مع ہمراہیان خاص ہتھیار باندھے پھرتے تھے کہ شہر مردمان پولس یہ حال دیکھ کر براہِ تعرض گھیرتے تھے۔ رفتہ رفتہ خبر ہوئی کہ بلوے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ سپاہیان سرکار نے تنگ و دو بے شمار کی، ہتھیار لے لینے میں تکرار کی۔ کہا کہ یا ''سب ہتھیار دے دو یا اسی وقت اپنا راستہ لو'' جواب دیا ''کہ نہ ہم ہتھیار دیں گے نہ کسی سے جھگڑا فساد مول لیں گے۔'' الغرض کوتوال صاحب اور تھرمس بورن کمشنر نے سنا، استفسار حال کے واسطے طلب کیا۔ ان کو انکار ہوا۔ نہ جانے میں اصرار ہوا۔ آخر صاحب موصوف (کمشنر) خود تشریف فرما ہوئے بہت فہمائش کی وہ ایک نہ شنوا ہوئے۔ ناچار ایک کمپنی بلا کے حفاظت کا کام کیا۔ رپورٹ اس مضمون کا بہ مقام بھدرسہ کہ فیض آباد سے پانچ کوس ہے، ڈپٹی کمشنر بہادر کے نام کیا، صاحب بہادر یہ حال سنتے ہی سوار ہوئے، مقام واردات پر وارد وہ عالی مقام ہوئے۔ بہنگام طلوع آفتاب جمیع صاحبان والا جناب رونق افزا ہوئے۔ حاکمانہ، بلکہ ناصحانہ سمجھایا مگر وہ کج فہم برسر راستی نہ ذرہ ہوئے۔ حاکم سے مقابلہ آسان جانا، اس شعر کا مضمون نہ پہچانا۔

ہر کہ بافولاد و بازو پنجہ کرد
ساعد مسکین خود را رنجہ کرد

افسر پلٹن نے سرائے میں جس دم قدم بڑھایا۔ شاہ

صاحب کی طرف سے ایسی ایک تلوار استقبال کی چلی کہ افسر کا ہاتھ جھوٹا ہوا، زخم کاری کھایا۔ ڈپٹی کمشنر بہادر نے حکم دیا کہ لینا، ایک ایک کو جانے نہ دینا۔ پلٹن کے تلنگے مسلح تھے۔ اسی دم چار آدمی گولیوں کی ضرب سے بے جان کیے، اور شاہ صاحب مع چار آدمی زخمی ہوئے، گرفتار بلا دبے رحمی ہوئے۔''26

ایک خبر گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی سے متعلق ہے۔ یہ خبر اپنے انداز بیان اور مواد کے اعتبار کے بہت اہم ہے۔ اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ 1857 قبل ویلزلی کے بعد جنھیں جوش غصب والحاق میں خاص شہرت حاصل ہوئی وہ لارڈ ڈلہوزی کی ہے۔ جب ڈلہوزی گورنر جنرل بن کر ہندوستان آیا تو اس نے جھاڑو اٹھالیا اور ہر علاقے کو کوڑے کرکٹ کی طرح سمیٹ کر انگریزی اقتدار میں ڈالنا شروع کردیا۔ دیسی حکمرانوں کے احساسات کو نظر انداز کرتے ہوئے اندھادھند کمپنی کے مقبوضات بڑھانے میں مصروف ہوگیا۔ ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کمپنی کے قبضے میں آگیا۔ ایک ایک کرکے سارے تخت ٹوٹ گئے۔ جو سلامت رہے وہ کمپنی کا دم بھرنے لگے۔ لارڈ ڈلہوزی پر طنز کرتے ہوئے اخبار سحر سامری لکھتا ہے:

''اخبار موروودہ لندن سے مبرہن ہوا کہ لارڈ ڈلہوزی خیر خواہ ہند، ترقی طلب سرکار کمپنی انگریز بہادر مبتلائے رنج محن ہوا۔ یعنی پشت راہوار سے گر کر مانند تیمور لنگ ہوا۔ بے راہ چلنے سے دل تنگ ہوا۔ مہتمم گلشن نوبہار فرماتے ہیں کہ شاید دود آہ دل درویشان ہند کا یہ اثر ہے۔ بمزلہ زہر ہلاہل قند مکرر ہے لیکن زہے نصیبت کہ زیادہ عروج پایا، یعنی ان دنوں وزیر مہمات کا عہدہ ہاتھ آیا۔ خدا معلوم ہے کہ آئندہ کیا مرتبہ حاصل ہو۔ پیغام دل آزاری ہے کہ لارڈ ڈلہوزی کو (ہندوستان کا گورنر جنرل بننے کی) ہوس دوبارہ ہوئی۔ یہ تجویز آشکار ہوئی کہ خرمہرہ ہائے باقی بنگالہ و ہند آکے پھر چنے۔ ہر ایک مالدار تونگر محتاج ہوکر اپنا اپنا سر دھنے اس حسن نیت سے ارباب پارلیمنٹ کے حضور میں سوال دیا اور انھوں نے نیک کرداری سمجھ کر منظور کیا۔ کس واسطے کہ ہندوستان میں بھی دو چار ریاستیں باقی ہیں اور وہ اس شکار بازی نامور مشاق ہیں۔ جس وقت ان ریاستوں کا (لارڈ ڈلہوزی کو) خیال آتا ہے ان کے دل میں ضبط نہ ہونے سے ملال آتا ہے۔''27

یکم دسمبر 1856 کی ہی اشاعت میں تار برقی کے ایجاد کی ایک خبر ملتی ہے کہ اہل فرنگ کے طرز پر ایک ہندوستانی نے بھی تار برقی ایجاد کی ہے لیکن پیسے کی مجبوری اور سامان کی کمی کی وجہ سے اپنے کام کو انجام دینے سے قاصر ہے۔ خبر میں پہلے مغربی ایجادات پر روشنی ڈالی گئی ہے اس کے بعد تار برقی کی ایجاد کا ذکر کیا ہے:

''اہل فرنگ جو ایجاد کرتے ہیں، نئی باتیں نکالنے پر مرتے ہیں۔ غور کیجیے کیسا فروغ خاطر انھیں حاصل ہے، کیسا اطمینان کامل ہے۔ نہ معاش کی فکر ہے نہ مفاد کا ذکر ہے۔ اگر اس پر بھی کسب کمال نہ کریں جائے تعجب ہے۔ ہاں اگر ہم میں سے کوئی کوئی طرح کا اختراع بھی کر جائے تعجب بالائے تعجب ہے۔ کیونکہ جو ذی کمال ہے، پریشان حال ہے جو صاحب ہنر ہے، در بہ در ہے...

یہاں مفتی گنج میں ایک بزرگ ہیں، مقبول انام، میر منور علی نام، ہنر شناس ہنرور، وضع دار نیک سیر۔ ان کے خلف الرشید ذہین اور سعید۔ نام ان کا میر محمد تقی عرف میر نبی صاحب۔ طبیعت ان کی ہر فن کے ساتھ مناسب۔ انھوں نے بہ زور طبع وقار تار برقی بنالیا۔ سیکڑوں آدمیوں کو دکھایا۔ بے سامانی سے مجبور ہیں۔ بے زری سے معذور ہیں۔ طول نہیں دی جاسکی۔ سامان اس کا نہیں لی جاسکتی۔ صرف اس قدر بھی حیرت افزائی ناظرین بنادیا ہے کہ ایک سرا تار کا گھر کے اندر لگا دیا ہے دوسرا سرا گھر سے باہر ڈیوڑھی کے اندر۔''28

بہرحال اخبار 'سحر سامری' اس دور کے باشندگان لکھنؤ کے حالات وجذبات کا صحیح عکاس اور آئینہ دار تھا جس میں اس دور کے لکھنؤ کے عوام کی جیتی جاگتی تصویریں اور انگریز کمپنی بہادر کی ستم ظریفیاں اور سفاکیاں، دغا بازیاں اور بدعہدی بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔29

حواشی

1 امداد صابری، تاریخ صحافت اردو، جلد اول، ص 513، چوڑی والان، دہلی 1953
2 نادر علی خاں: اردو صحافت کی تاریخ (57-1822)، ص 98-397، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1987
3 اخبار سحر سامری، یکم دسمبر 1856 جلد اول، نمبر 3، بحوالہ مضمون محمد عتیق صدیقی، سحر سامری، نیا دور، لکھنؤ، مئی 1960
4 نادر علی خاں: اردو صحافت کی تاریخ (57-1822)، ص 398، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1987
5 ڈاکٹر طاہر مسعود: اردو صحافت انیسویں صدی میں، ص 13-312، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 2009
6 نادر علی خاں: اردو صحافت کی تاریخ (57-1822)، ص 399، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1987
7 ڈاکٹر طاہر مسعود: اردو صحافت انیسویں صدی میں، ص 313، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 2009
8 اخبار سحر سامری، یکم دسمبر 1856 جلد اول، نمبر 3، بحوالہ مضمون محمد عتیق صدیقی، سحر سامری، نیا دور، لکھنؤ، مئی 1960
9 نادر علی خاں: اردو صحافت کی تاریخ (57-1822)، ص 8-407، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1987
10 اخبار سحر سامری، یکم دسمبر 1856، جلد اول، نمبر 3، بحوالہ مضمون محمد عتیق صدیقی، سحر سامری، نیا دور، لکھنؤ، مئی 1960
11 ایضاً
12 ایضاً
13 سید خورشید مصطفی رضوی، تاریخ جنگ آزادی ہند 1857، ص 131، یو پبلشرز، اردو بازار، لاہور 2007
14 سر سید احمد خان، اسباب بغاوت ہند، ص 29
15 اخبار سحر سامری، یکم دسمبر 1856، جلد اول، نمبر 3، بحوالہ مضمون، محمد عتیق صدیقی، سحر سامری، نیا دور، لکھنؤ، مئی 1960
16 سحر سامری، 2 شہر ربیع الثانی 1273ھ، مطابق 11 ماہ دسمبر 1856، روز دوشنبہ، جلد 3، بحوالہ مضمون محمد عتیق صدیقی، سحر سامری، نیا دور لکھنؤ، مئی 1960)
17 ایضاً، (اخبار سحر سامری، 15 دسمبر 1856، بحوالہ مضمون محمد عتیق صدیقی، سحر سامری، نیا دور، لکھنؤ، مئی 1960، بحوالہ صابری، تاریخ صحافت اردو، جلد اول، ص 515-514
18 نادر علی خاں: اردو صحافت کی تاریخ (57-1822)، ص 400، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1987
19 ایضاً، ص 401
20 ایضاً، ص 406
21 ایضاً، ص 5-404
22 خبار سحر سامری، یکم دسمبر 1856، جلد اول، نمبر 3، بحوالہ مضمون بحوالہ محمد عتیق صدیقی، سحر سامری، نیا دور، لکھنؤ، مئی 1960
23 اخبار سحر سامری، 18 مئی 1857، جلد اول، نمبر 27، بحوالہ مضمون بحوالہ محمد عتیق صدیقی، سحر سامری، نیا دور، لکھنؤ، مئی 1960
24 مفتی انتظام اللہ شہابی، ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علما، ص 77، زاویہ پبلشرز، لاہور
25 سید خورشید مصطفی رضوی: تاریخ جنگ آزادی ہند، 1857، ص 26-425، یو پبلشرز، اردو بازار، لاہور 2007
26 اخبار سحر سامری، یکم دسمبر 1856، جلد اول، نمبر 3، بحوالہ مضمون محمد عتیق صدیقی، سحر سامری، نیا دور، لکھنؤ، مئی 1960
27 20 اپریل، اخبار سحر سامری 1856، بحوالہ اردو صحافت اور جنگ آزادی 1857، معصوم مرادآبادی، ص 170، خبردار پبلی کیشنز، دریا گنج، دہلی 2008
28 اخبار سحر سامری، یکم دسمبر 1856، بحوالہ ڈاکٹر طاہر مسعود، اردو صحافت انیسویں صدی میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 2009
29 نادر علی خاں: اردو صحافت کی تاریخ (57-1822)، ص 8-407، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1987

■

Dr. Md. Makhmoor Sadri
Research Associate, Dept of Urdu
Faculty of Arts
Delhi University
Delhi - 110007

عالمی تناظر میں اردو میڈیا

امتیاز رومی

عالمی سطح پر اردو میڈیا کی تاریخ بھی انتہائی قدیم اور مستحکم ہے اور اس کا سرا انیسویں صدی سے ہی ملتا ہے۔ تاہم اس کا باقاعدہ آغاز بیسویں صدی کے نصف سے ہوتا ہے جب ہند و پاک کے تارکین وطن یورپ، امریکہ، افریقہ اور ایشیا کے مختلف ممالک میں آباد ہوتے ہیں۔ ان ممالک میں اردو اخبارات و رسائل کی اشاعت کے پس منظر میں بنیادی طور پر دو مقاصد کارفرما ہیں۔ اول انیسویں صدی میں ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے آزادی دلانے کے لیے برطانوی ہند کے باہر کئی ممالک سے اخبارات و رسائل کی اشاعت عمل میں آئی۔ جن کے پس پشت انگریزی حکومت کے خلاف ماحول سازی کرنا، اس کے پروپیگنڈے کا جواب دینا اور دنیا کی توجہ ہندوستان کی آزادی کی جانب مبذول کرانا تھا۔ دوم ہندوستان کی آزادی اور تقسیم ہند کے بعد ہند و پاک کے تارکین وطن نے جب نئے ملک میں اپنی بستیاں بسالیں تو اپنی زبان اور تہذیب و ثقافت کی بقا اور آپسی میل جول کو فروغ دینے کے لیے اخبارات و رسائل نکالنے کی جانب توجہ دی۔ اس کے علاوہ صنعتی انقلاب کے بعد یورپین اور امریکن حکومت کے نشریاتی اداروں نے برصغیر میں اپنے تہذیبی اور ثقافتی فروغ کے لیے اردو نشریات کا سہارا لیا جس میں ریڈیو کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

انیسویں صدی دراصل سیاسی اعتبار سے کافی اتھل پتھل کی شکار رہی اور مسلم ممالک بالخصوص ترکی میں خلافت عثمانیہ زوال پذیر۔ ان تمام احوال و کوائف کو اردو اخبارات میں مسلسل بیان کیا جاتا رہا اور عثمانیوں کے متعلق خبریں پابندی سے شائع ہوتی رہیں۔ اس واقعے سے ہند و ترکی کے تعلقات کو استحکام ملا اور مراسم مزید بہتر ہوئے۔ ترجمے کی شکل میں خبروں کا لین دین شروع ہوا اور ہندوستان کی خبریں ترکی کے اخبارات میں اور ترکی کی خبریں ہندوستانی اخبارات میں شائع ہونے لگیں۔ اس طرح دونوں ملکوں کے تعلقات کو پختگی ملی اور دونوں ایک دوسرے کے غم گسار بن گئے۔ چنانچہ اس رشتے کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے، ہندوستانی مسلمانوں کو عثمانی خلافت سے قریب کرنے اور ہندوستان کو انگریزوں سے آزادی دلانے کے لیے استنبول میں اردو اخبار کی اشاعت عمل میں آئی۔

عالمی منظرنامے پر ترکی ایک ایسا ملک ہے جس سے اردو زبان و تہذیب کے قدیم ترین مراسم ہیں۔ جس کا آغاز ہندوستان میں ترکوں کی آمد سے ہوتا ہے۔ انھوں نے ہندوستان کے تہذیبی و ثقافتی اور لسانی دھارے میں خود کو شامل کرکے ایک نیا رنگ دیا اور اردو زبان کی لفظیات میں ترکی الفاظ کا اضافہ کیا۔ نیز حدود سلطنت کی وسعت کے ساتھ ساتھ اردو زبان کا دائرہ بھی وسیع کیا۔ دوسری طرف ہندوستانی مسلمان جب ترکی گئے تو اپنے ساتھ یہ زبان بھی لے گئے۔ 1453 میں سلطان محمد فاتح نے جب قسطنطنیہ (استنبول) فتح کیا تو اس سلسلے میں اور تیزی آئی۔ بہت سے ہندوستانی مسلمان استنبول میں آباد ہوگئے۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی آتے آتے اس تعداد میں کافی اضافہ ہوا اور یہ تعداد اتنی ہوگئی کہ انیسویں صدی کے نصف آخر میں استنبول سے اردو اخبارات نکلنے لگے۔ ظاہر ہے کوئی بھی اخبار نکالنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے قارئین کی خاطر خواہ تعداد موجود ہو۔ ہندوستان میں 1857 کی جنگ انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کی پہلی جدوجہد تھی جس کی آواز پوری دنیا میں محسوس کی گئی۔ اس کے بعد ہندوستانی ادیبوں، دانشوروں اور آزادی کے متوالوں نے دنیا کے مختلف گوشوں سے انگریزوں کے خلاف آواز بلند کرنے کے لیے اخبارات کا سہارا لیا۔ اس حوالے سے ترکی اور استنبول کا نام بہت اہم ہے۔ استنبول اس زمانے میں قسطنطنیہ کہلاتا تھا جہاں سے 23 مارچ 1878 میں 'ترجمان شوق' نام سے پندرہ روزہ اخبار سکندر آفندی نے جاری کیا جو اردو کے علاوہ عربی میں بھی شائع ہوتا تھا۔ سکندر آفندی چوں کہ ہندوستان کے شہر دہلی اور لکھنؤ میں رہ چکے تھے اس لیے 1857 کے حادثات سے بخوبی واقف تھے۔ چناں چہ انھوں نے اپنے اخبار میں پہلی جنگ آزادی کی جدوجہد اور انگریزوں کے مظالم کو قسط وار شائع کرنا شروع کیا جو بے حد مقبول ہوا۔ جب انگریزوں کو اس اخبار کے متعلق علم ہوا تو انھوں نے 1880 میں اسے بند کروادیا۔ اسی طرح 1857 کی ناکام جنگ آزادی کے بعد ایک ہندوستانی منشی سید قادر بخش ترکی چلے گئے۔ وہاں سے انھوں نے سلطان عبدالحمید کے نام پر 1880 میں 'سلطان الاخبار' کے نام سے ایک اخبار نکالا جس میں انگریزوں کے ظلم و جبر کی داستان بیباکی سے بیان کی جاتی تھی۔ بقول امداد صابری ''سلطان

> استنبول یونیورسٹی ترکی میں اردو زبان و ادب کے استاذ اور محقق پروفیسر خلیل طوقار کی تحقیق کے مطابق منشی 1880 میں اردو کا پہلا اخبار 'پیک اسلام' کے نام سے نکلا جو اردو اور ترکی دونوں زبانوں میں شائع ہوتا تھا۔ اس اخبار کے مدیر نصرت علی خان تھے جو انگریزوں کے خلاف سرگرمیوں میں شرکت کرنے کی وجہ سے ہندوستان سے جلا وطن کردیے گئے تھے۔ اس کے بعد 'جہان اسلام' اور 'الدستور' بھی شائع ہوا اور ان دونوں اخبارات کے نسخے بھی استنبول کی لائبریریوں میں موجود ہیں تاہم پہلے اخبار 'پیک اسلام' کا کوئی نسخہ دستیاب نہیں ہوا۔

الاخبار ترکی سے یہ ہفتہ وار اخبار یکم جنوری 1880 میں سلطان عبدالحمید کے نام پر جاری ہوا۔ آٹھ صفحات پر یوم پنج شنبہ کو نکلتا تھا مہتمم جناب منشی سید قادر بخش صاحب تھے مطبع بظوی میں یہ اخبار چھپتا تھا۔''

(امداد صابری، غیر ممالک میں اردو کے انقلابی اخبارات ورسائل، مشمولہ اردو صحافت، مرتبہ انور علی دہلوی، اردو اکادمی دہلی، 2009، ص 64)

استنبول یونیورسٹی ترکی میں اردو زبان و ادب کے استاذ اور محقق پروفیسر خلیل طوقار کی تحقیق کے مطابق مئی 1880 میں اردو کا پہلا اخبار 'پیک اسلام' کے نام سے نکلا جو اردو اور ترکی دونوں زبانوں میں شائع ہوتا تھا۔ اس اخبار کے مدیر نصرت علی خان تھے جو انگریزوں کے خلاف سرگرمیوں میں شرکت کرنے کی وجہ سے ہندوستان سے جلا وطن کردیے گئے تھے۔ اس کے بعد 'جہان اسلام' اور 'الدستور' بھی شائع ہوا اور ان دونوں اخبارات کے نسخے بھی استنبول کی لائبریریوں میں موجود ہیں تاہم پہلے اخبار 'پیک اسلام' کا کوئی نسخہ دستیاب نہیں ہوا۔

(ڈاکٹر خلیل طوقار، جہان اسلام، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور، 2011 ص 36)

اس تحقیق کی رو سے معلوم ہوتا ہے کہ 1880 میں استنبول میں اردو صحافت کا آغاز ہوگیا اور پے در پے تین اخبارات نکلے۔ جب کہ امداد صابری کے مطابق 1878 میں ہی 'ترجمان شوق' نکلا اور 1880 میں سلطان الاخبار نکلا۔ گویا ترکی میں اردو صحافت کا یہی نقطہ آغاز ہے۔ مئی 1914 میں استنبول سے ایک ہفتہ وار 'جہان اسلام' بیک وقت عربی، ترکی اور اردو زبان میں جاری ہوا جس کا اردو حصہ ابوسعید دیکھتے تھے۔ اس اخبار کو غازی انور پاشا اور عزت پاشا کی قیادت حاصل تھی۔ اس اخبار میں مصر کے نیشنلسٹ رہنما فرید بے، منصور عارفت اور ہندوستان کے لالہ ہردیال وغیرہ کی انقلابی تحریریں شائع ہوتی تھیں۔ ابتدا میں یہ اخبار ہندوستان میں بھی آتا تھا تاہم اگست 1914 کے بعد ہندوستان آنے پر پابندی لگادی گئی۔

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں استنبول اور اس کے گردونواح میں اردو بولنے اور پڑھنے والوں کی تعداد اس قابل ہوگئی تھی کہ اخبار نکالنے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ تاہم پہلی جنگ عظیم کے ساتھ ہی اردو کے اولین دور کا خاتمہ ہوگیا۔ انگریزوں کے عہد میں ہندوستانیوں پر ہورہے جبر واستحصال کے خلاف حریت پسندوں کے دلوں میں کس قدر غم وغصہ تھا مذکورہ اقتباس سے اس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ ترکی سے نکلنے والے اخبارات چونکہ انقلابی خیالات کے حامل اور انگریزی حکومت کے مظالم کے خلاف بیباک تھے لہٰذا ان اخبارات پر بھی کڑی نگاہ رکھی جاتی تھی اور موقع ملتے ہی بند کرادیے جاتے تھے۔

انیسویں صدی میں ترکی سے نکلنے والے یہ اخبارات عالمی سطح پر اردو میڈیا کی بنیادی تاریخ ہیں جو تقریباً ڈیڑھ سو سالوں کو محیط ہونے جارہا ہے۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ بیسویں صدی یا اکیسویں میں بھی ترکی سے کوئی اردو اخبار نہیں نکلا۔ گویا وہی اول اور وہی آخر ہوگیا۔ البتہ پروفیسر خلیل طوقار نے اردو زبان کی ترویج واشاعت کے لیے استنبول یونیورسٹی سے 'ارتباط' نام کا ایک علمی و ادبی رسالہ جاری کیا جس کے وہ مدیر اعلیٰ ہیں۔ تاہم یہ رسالہ بھی ان کی ذاتی مصروفیات اور طبیعت کی مسلسل ناسازی کی وجہ سے دو چند شماروں کے ساتھ ہی تعطل کا شکار ہوگیا۔ لیکن انٹرنیٹ کے آنے کے بعد چند اردو ویب سائٹس ضرور وجود میں آئیں جن سے ترکی میں اردو صحافت کا ایک ربط موجود ہے۔ اس کے علاوہ ٹی آر ٹی ترکی حکومت کا نشریاتی ادارہ ہے جس کا قیام یکم مئی 1964 کو عمل میں آیا۔ اس کے ریڈیو پروگرام میں اردو سروس شامل ہے اور صدائے ترکی کے نام سے اپنی اردو نشریات پیش کرتا ہے جو شارٹ ویو، سٹیلائٹ اور انٹرنیٹ پر بھی موجود ہے۔ ٹی آر ٹی کی اپنی ویب سائٹ بھی ہے جس پر براہ راست صدائے ترکی کے پروگرامز سن سکتے ہیں اور دیکھ بھی سکتے ہیں۔

برطانیہ میں بھی انیسویں صدی میں ہی اردو صحافت کا وجود ایک انقلابی رسالے کی شکل میں عمل میں آیا جس کا مقصد ہندوستان میں انگریزوں کے مظالم سے اہل برطانیہ اور دنیا کے لوگوں کو باخبر کرنا تھا۔ چناں چہ اگست 1884 میں رسالہ 'ہندوستان' لندن سے جاری ہوا۔ اس رسالے کے متعلق امداد صابری لکھتے ہیں:

''ہندوستان، یہ رسالہ نمبر 49 منیر پاک روڈ لندن سے اگست 1884 میں جاری ہوا جو اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں نکلتا تھا اس کے مالک راجہ رائے سنگھ آنریری مجسٹریٹ پرتاپ گڑھ، ایجنٹ بشیشر دیال وکیل ہائی کورٹ الہ آباد تھے سولہ صفحات پر مشتمل تھا سالانہ چندہ چار روپے آٹھ آنے تھا۔ یہ رسالہ ہندوستانیوں کے جذبات کی ترجمانی کرتا تھا۔ انگریزوں کو 1857 کے ظلم و قتل غارت گری سے آگاہ کرتا تھا انگریز ہندوستانیوں کے ساتھ جو تحقیر آمیز سلوک ہندوستان میں کرتے تھے ان کے متعلق مضامین لکھتا تھا اور ہندوستان کی تجارت پر بھی روشنی ڈالتا تھا اور وہاں کے لوگوں کو واقف کراتا تھا۔''

(امداد صابری، غیر ممالک میں اردو کے انقلابی اخبارات ورسائل، مشمولہ اردو صحافت، مرتبہ انور علی دہلوی، اردو اکادمی دہلی، 2009، ص 65)

بیسویں صدی کے اوائل میں ہی شیاما جی کرشن ورما برطانوی عہد میں لندن گئے اور وہاں انھوں نے 1905 میں 'انڈیا ہوم سوسائٹی' کے نام سے ایک تنظیم بنائی اور اس کے تحت 'انڈین سوشلسٹ' نام سے ایک اخبار جاری کیا۔ اس سوسائٹی اور اخبار کا مقصد بھی ہندوستان کو غلامی سے نجات دلانا اور انگلستان میں مقیم ہندوستانیوں کے جذبات کی ترجمانی کرنا تھا'' اس اخبار میں ایک ہندوستانی انقلابی رہنما بی ایس آر رانا کا خط بھی شائع ہوتا تھا جو فرانس کے دارالحکومت پیرس میں مقیم تھے اس وقت کا کوئی انقلابی رسالہ اور اخبار ایسا نہیں ہوتا تھا جس میں اردو کا حصہ نہ ہوتا ہو۔ یہی صورت اس اخبار کی بھی تھی۔''

(ایضا، ص 66)

اس کے علاوہ لندن سے ایک اور اخبار 1910 میں 'سوراج' نام سے جاری ہوا۔ بابو پبن چندر پال نے انگریزوں کے خلاف ماحول سازی کے لیے یہ اخبار نکالنا شروع کیا جو اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی اور بنگالی میں بھی شائع ہوتا تھا۔ انگریزوں کے خلاف انقلابیوں نے ماحول سازی کے لیے چین، جاپان، فرانس، امریکہ اور کناڈا سے بھی اردو اخبارات جاری کیے۔ چناں چہ مولانا مقبول الرحمٰن سرحدی اور شوکت علی بنگالی کی رہنمائی میں ایک وفد چین بھیجا گیا جہاں انھوں نے ایک سیرت کمیٹی بنائی اور 1905 میں 'العین' نامی رسالہ اردو اور چینی زبان میں شائع کیا۔ 1907 میں آرک لینڈ امریکہ سے ایک ماہنامہ 'سرکلر آزادی' کے نام سے اردو میں نکالا گیا۔ یہ رسالہ 'ہند و امریکن ایسوسی ایشن' کے تحت تھا جس کے سکریٹری لالہ امرناتھ تھے۔

مولانا برکت اللہ بھوپالی جب جاپان کی ٹوکیو یونیورسٹی میں بحیثیت استاذ گئے تو وہاں سے انھوں نے 1910 میں 'اسلامک 'فیریٹرنیٹی' کے نام سے ایک ماہنامہ رسالہ جاری کیا۔ جس کی کاپیاں دنیا کے مختلف گوشوں میں پہنچتی تھیں۔ جب اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوا تو برطانوی حکومت نے اپنے اثر و رسوخ کا استعمال کرکے مولانا برکت اللہ کو ٹوکیو یونیورسٹی کی ملازمت سے ہٹادیا اور اس ماہنامہ پر پابندی عائد کردی گئی۔ مولانا برکت اللہ کے ساتھیوں نے 1912 میں فرانس سے ایک اخبار 'انقلاب' جاری کیا تھا جو پژمردہ حالت میں تھا۔ تاہم جب مولانا برکت اللہ جاپان سے فرانس پہنچے تو اس اخبار میں جان آگئی اور یورپ کے علاوہ امریکہ تک اس کی گونج محسوس کی گئی۔ مگر یہ اخبار بھی زیادہ دن نہ چل سکا اور بند ہوگیا۔ مولانا برکت اللہ نے 1925 میں پھر ایک ہفت روزہ اخبار

> **اردو زبان و ادب اور صحافت و ثقافت کو عالمی سطح پر متعارف اور مستحکم کرانے میں برصغیر کے تارکین وطن کا اہم رول ہے۔ ان کی مسلسل جد و جہد اور کد و کاوش کی ایک تاریخ ہے جس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ موجودہ عہد میں اردو کی جو ادبی اور صحافتی سرگرمیاں ان ممالک میں نظر آتی ہیں ان کا تعلق ماضی کے ادوار سے بہت گہرا ہے اور ان کی ایک مستقل تاریخ ہے۔**

'الاصلاح' فرانس سے جاری کیا۔ لیکن برطانوی حکومت نے فرانس کو مولانا کے خلاف اکسایا جس کے بعد انھیں ملک بدر کردیا گیا اور فرانس سے وہ جرمنی چلے گئے اور الاصلاح کو انھوں نے یہاں سے جاری رکھا۔

یکم نومبر 1912 کو 'غدر' نامی اخبار امریکہ کے شہر سان فرانسسکو سے جاری ہوا جس کے بانی لالہ ہردیال تھے۔ دراصل یہ اخبار 'ہندی ایسوی ایشن آف پیسفک کوسٹ' کے تحت جاری کیا گیا جو بعد میں غدر پارٹی کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ اخبار بھی بہت بیباکی سے انگریزوں کے خلاف لکھتا تھا اور لوگوں کے اندر آزادی کی چنگاری پھونکنے کا کام کررہا تھا۔ اس اخبار میں لالہ ہردیال کے ساتھ مولوی برکت اللہ اور رام چندر معاونت کرتے تھے اور جب لالہ ہردیال کو انگریزوں کی شکایت پر ملک بدر کردیا گیا تو ان دونوں نے اس اخبار کو سنبھالا دیا۔ یہ اخبار بھی تیزی سے مقبول عام ہوگیا اور امریکہ اور کناڈا کے علاوہ میکسیکو، جاپان، آسٹریلیا اور فلپائن وغیرہ میں پہنچنے لگا۔

ہندوستان کی آزادی کے بعد اردو کا منظر نامہ نہ صرف ملکی سطح پر تبدیل ہوا بلکہ عالمی سطح پر بھی اس کا اثر ہوا اور عالمی تناظر میں اردو صحافت کا توسیعی عمل شروع ہوا۔ یورپ، امریکہ، آسٹریلیا، افریقہ اور ایشیا کے مختلف ممالک میں اہل اردو کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ چنانچہ آپسی میل جول اور ابلاغ و ترسیل کے لیے اخبارات و رسائل، ریڈیو اور ٹیلی ویژن چینل کا وجود عمل میں آنے لگا اور اس کے پس پشت وطن کی یاد اور احساس محرومی کو دور کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی زبان و تہذیب سے وابستگی اور اس کا فروغ واستحکام کارفرما تھا۔ انھیں اسباب وعوامل کی بنیاد پر تارکین وطن نے اخبارات و رسائل کی ضرورت شدت سے محسوس کی اور اس جانب انھوں نے پیش قدمی کی۔ ظاہر ہے اس کا فائدہ بھی ہوا اور اہل اردو کو تسکین ذوق کا سامان ہاتھ آیا اور اپنی آنے والی نسلوں کی تربیت کا ذریعہ فراہم ہوا۔

اردو زبان و ادب اور صحافت و ثقافت کو عالمی سطح پر متعارف اور مستحکم کرانے میں برصغیر کے تارکین وطن کا اہم رول ہے۔ ان کی مسلسل جد و جہد اور کد و کاوش کی ایک تاریخ ہے جس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ موجودہ عہد میں اردو کی جو ادبی اور صحافتی سرگرمیاں ان ممالک میں نظر آتی ہیں ان کا تعلق ماضی کے ادوار سے بہت گہرا ہے اور ان کی ایک مستقل تاریخ ہے۔ ان ممالک میں ادبی صحافت ہو یا اخباری صحافت یا الیکٹرانک میڈیا، ان سب ذرائع کے حوالے سے قابل قدر کام ہوا ہے۔ جہاں اردو کے ادیبوں نے ادب کو عالمی سطح پر فروغ دینے کی کوشش کی، وہیں اردو صحافیوں نے صحافت کی نشر و اشاعت میں اہم کردار ادا کیا۔ اس ضمن میں برطانیہ کا نام سب سے اہم ہے۔ بقول پروفیسر عقیل دانش 'برطانیہ اور اردو کا تعلق تقریباً 300 سال پرانا ہے۔''

(آج کے تناظر میں اردو کا تحفظ اور فروغ، مرتب: شیخ عقیل احمد، این سی پی یو ایل، نئی دہلی، 2020، ص 216)

اس کی تفصیل سے قطع نظر یہاں کی صحافتی سرگرمیوں کے تاریخی حوالوں سے سروکار ہے۔ برطانیہ میں اردو صحافت کا ماضی بہت روشن رہا ہے اور حال بھی قدرے بہتر ہے۔

یہ بھی تاریخی حقیقت ہے کہ ہندوستان کی آزادی سے پہلے ہی بی بی سی لندن سے اردو زبان کی سروس شروع کردی گئی۔ چناں چہ 11 مئی 1940 کو بی بی سی نے ہندوستانی سروس کے تحت اردو نشریات کا آغاز کیا۔ لیکن تقسیم ہند کے بعد ہندی اور اردو کے شعبے علیحدہ کردیے گئے۔ چناں چہ 1949 میں اردو شعبے سے نشریات کا باقاعدہ اہتمام کیا گیا اور جہاں نما اور سیر بین کے نام سے صبح وشام اردو کے پروگرام نشر کیے جانے لگے۔ اس کے علاوہ سائنسی، سماجی اور کھیل کود سے متعلق متعدد نشریات ہفتہ وار پیش کیے جاتے تھے۔ بی بی سی اردو سروس نے اردو زبان و ادب اور صحافت کو نہ صرف برطانیہ میں مقبولیت بخشی بلکہ دنیا بھر میں اس کے سامعین کی تعداد میں بے پناہ اضافہ ہوا اور لوگوں میں اردو کے تئیں دلچسپی پیدا ہوئی۔ دراصل دوسری جنگ عظیم میں چونکہ ہندوستان بھی اتحادی افواج میں شامل تھا اس لیے ہندوستانیوں کو اس سے باخبر رکھنے اور نازی پروپیگنڈے کا جواب دینے کے لیے ہندوستانی سروس کا آغاز ہوا۔ ''ہندوستانی سروس سے ایک ایسی ملی جلی زبان میں نشریات کا آغاز کیا گیا تھا جس پر اردو یا ہندی کا لیبل چسپاں کرنا ممکن نہیں تھا۔ بی بی سی کی ہندوستانی سروس کے ساتھ سید ذوالفقار علی بخاری کے علاوہ آل حسن اور بلراج ساہنی جیسے مقتدر سرکردہ ہندوستانی براڈ کاسٹر وابستہ ہوئے جنھوں نے براڈ کاسٹنگ کے علاوہ ادب اور اداکاری کے میدانوں میں بھی نمایاں کارنامے انجام دیے۔''

(عبید صدیقی، بی بی سی کی اردو نشریات، مشمولہ اردو کی نئی بستیاں، مرتبہ گوپی چند نارنگ، ساہتیہ اکادمی، 2006 ص 86)

برطانیہ میں 1950 کے بعد جب ہند و پاک کے تارکین وطن کی خاطر خواہ تعداد ہوگئی تو اخبار نکالنے کی جانب توجہ دی گئی۔ چنانچہ اس حوالے سے ہفت روزہ 'مشرق' کو اولیت کا درجہ حاصل ہے جس کا پہلا شمارہ 8 اپریل 1961 کو شائع ہوا۔ یہ اخبار پاکستانی نژاد ادیب اور صحافی محمود ہاشمی نے لندن سے جاری کیا جو بعد میں برمنگھم سے ستمبر 1972 تک نکلتا رہا۔ برطانیہ میں مشرق کی اولیت کی وجہ سے ہی محمود ہاشمی کو برطانیہ میں بابائے اردو صحافت کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد 'ایشیا' اور 'وطن' نکلا پھر پے در پے اردو اخبارات کا سلسلہ چل نکلا۔ جن میں 'ملت، اردو ٹائمز، عوام، آزاد، دی نیشن، جنگ اوورسیز ایڈیشن، نوائے وقت اوورسیز ایڈیشن، ملاپ، پرتاپ، آفاق، آواز، سفیر، شفق، آدرش، صدا، اجالا، راوی، انصاف اور پاکستان پوسٹ' وغیرہ شامل ہیں۔

ادبی اور مجلاتی صحافت میں بھی برطانیہ کی بہت اہم خدمات ہیں۔ اس سلسلے میں اسّی کی دہائی میں معین الدین شاہ نے ماہنامہ 'اردو ادب' جاری کیا۔ شاہ صاحب تن تنہا اسے نکالتے تھے اور بہت معیاری مضامین اس میں شائع ہوا کرتے تھے اس کے علاوہ مشاہیر ادب پر گوشے بھی شائع کیے جاتے تھے۔ اس کے بعد نوّے کی دہائی میں ماہنامہ 'صدا' اور 'سفیر اردو' سہ ماہی کا اجرا عمل میں آیا۔ اکیسویں صدی کے آغاز میں ہی یورپین اردو رائٹرز سوسائٹی کا مجلہ ماہنامہ 'پرواز' اور مقصود الٰہی شیخ کا رسالہ 'مخزن' منظر عام پر آیا۔ اس کے علاوہ بھی متعدد رسائل نکالے گئے جن سے برطانیہ میں اردو زبان و ادب کو استحکام ملا اور اردو کی مجلاتی صحافت میں خوش گوار اضافہ ہوا۔ برطانیہ میں اخبارات و رسائل کے علاوہ ٹی وی چینلز اور ویب سائٹس بھی اردو میں نشر و اشاعت کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔

جرمنی میں اسّی کی دہائی میں اردو صحافت کا باقاعدہ آغاز ہوگیا۔ اس ضمن میں جدید ادب، فورم انٹرنیشنل، اردو دنیا، صدائے پاکستان، نفرت اور حقیقت وغیرہ شائع کیے

گئے۔ اس کے علاوہ وائس آف جرمنی جسے ڈوئچے ویلے کہا جاتا ہے جو جرمنی کے بون شہر سے مختلف زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو زبان میں بھی اپنی نشریات پیش کرتا ہے۔ اس کے تحت اردو نشریات کا آغاز 14 اگست 1964 کو ہوا تھا۔ اس کے سامعین کا دائرہ برصغیر ہند و پاک کے علاوہ جرمنی، یورپ اور جنوبی ایشیا تک پھیلا ہوا ہے۔ www.dw.com/urdu اس کی ویب سائٹ بھی ہے جس پر براہ راست تمام پروگرام نشر کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ جرمنی سے کئی رسائل بھی شائع ہوئے جن میں حیدر قریشی کا رسالہ جدید ادب، ادبی اور مجلاتی صحافت میں اپنی مستحکم شناخت رکھتا ہے۔

یورپ کے اسکینڈے نیویا ممالک میں اسّی کی دہائی سے ہی اردو صحافت موجود ہے۔ 1972 میں صدائے پاکستان ڈنمارک کے دارالحکومت کوپن ہیگن سے جاری ہوا اور اسی کو اولین اردو اخبار مانا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ متعدد اخبارات و رسائل مثلاً کاروان، اخبار پاکستان، آواز، ندائے پاکستان، سفیر اور بازگشت، امن، وطن، نیوز انٹرنیشنل، پیام مشرق، کلچر اور روزن جاری ہوئے۔ ریڈیو میں آپ کی آواز اور ریڈیو ہم وطن اسی طرح ٹیلی ویژن چینل کا بھی آغاز ہوا جن میں ٹی وی لنک اور ٹی وی نسا کا نام آتا ہے۔

عالمی سطح پر اردو زبان و ادب اور صحافت کے حوالے سے دوسرا اہم ملک کناڈا تسلیم کیا جاتا ہے جہاں اہل اردو کی بہت بڑی تعداد آباد ہے۔ یہاں اردو کی صحافتی تاریخ کا سرا 1968 سے ہی ملتا ہے۔ حفظ الکبیر قریشی نے کناڈا سے 'صہبا' کے نام سے اردو کا پہلا جریدہ نکالا۔ گویا یہی کناڈا میں اردو صحافت کا نقطہ آغاز ہے۔ اس کے بعد پاکیزہ، الہلال، اردو انٹرنیشنل، سخن ور، ترجمان، پارس، اردو ٹائمز، امروز، صدائے پاکستان، کریسنٹ، ملاقات، ملت، نوائے وقت، لیڈر، چمن خیال، گل رنگ، ندائے حق، وطن، شمع، صبا، آفاق، ترجمان، آنچل، فکر و نظر، جنگ، تہذیب اور پاکستان پوسٹ وغیرہ شائع ہوئے۔ یہ اردو میں شائع ہونے والے اخبارات و رسائل کی نامکمل فہرست ہے جن سے کناڈا میں اخباری اور مجلاتی صحافت کا اندازہ ہوتا ہے۔ کناڈا کا شہر ٹورنٹو چوں کہ اردو کا مرکز مانا جاتا ہے اس لیے ان میں بیشتر اخبارات و رسائل ٹورنٹو سے شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن چینل پر بھی اردو کے پروگرام نشر کیے جاتے ہیں۔ اس طرح کناڈا میں بھی اردو صحافت اور میڈیا کی روشن تاریخ ہے۔

امریکہ کے کئی شہروں میں اہل اردو کی بڑی تعداد موجود ہے لہٰذا میڈیا کے تمام ذرائع پر اردو زبان کی نمائندگی یہاں پائی جاتی ہے۔ یہاں سے روز نامہ، ہفت روزہ، پندرہ روزہ، ماہنامہ اور سہ ماہی کی شکل میں متعدد اردو اخبارات و رسائل شائع ہوئے۔ جن میں اردو ٹائمز، پاکستان پوسٹ، صدائے پاکستان، پاکستان کرانیکل، نوائے ہیوسٹن، محاسب، ملت، عوام، مشعل، دھنک، اردو دنیا، ہم لوگ، آواز، ندا اور زاویہ وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں سے چند انٹرنیٹ پر موجود ہیں البتہ بیشتر کے صرف نام ہی دستیاب ہوئے ان کے بارے میں مزید معلومات نہ مل سکی۔ ان اخبارات و رسائل میں خبروں اور مضامین کے علاوہ اردو شعر و ادب کے حوالے سے بھی مواد ہیں اور اخباری صحافت کے ساتھ ساتھ ادبی صحافت میں بھی ان کی اہم خدمات ہیں۔ امریکہ میں شائع ہونے والے اخبارات عموماً مفت تقسیم کیے جاتے ہیں اور اس کے اخراجات اشتہارات سے پورے کیے جاتے ہیں جو کہ امریکہ میں اردو اخبارات کے فروغ و استحکام میں بہت معاون ہیں۔

امریکہ میں اردو اخبار تقریباً نصف صدی مکمل کرنے کو ہے۔ بقول تقی عابدی امریکہ کا پہلا اردو اخبار 'کریسنٹ' ہے جس کے بانی اور مدیر ڈاکٹر مظفر شکوہ تھے۔ تاہم آج اردو ٹائمز امریکہ کا سب سے بڑا اخبار ہے جو تقریباً تین دہائیوں سے مسلسل شائع ہو رہا ہے اور امریکہ کے تمام بڑے شہروں سے اس کے ایڈیشنز نکلتے ہیں جن میں نیویارک، نیو جرسی، شکاگو، ہیوسٹن، کیلی فورنیا اور میری لینڈ شامل ہیں۔ اس اخبار کے بانی اور مدیر خلیل الرحمن ہیں جنھوں نے امریکہ میں اردو اخبار کو استحکام بخشنے میں بڑی جد و جہد کی۔

امریکی حکومت کا نشریاتی ادارہ وائس آف امریکہ بھی اردو زبان میں ریڈیو، ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ پر نشر و اشاعت کا فریضہ عرصہ دراز سے انجام دے رہا ہے۔ وائس آف امریکہ نے 1953 میں ریڈیو پر اردو نشریات کا آغاز کیا اس کے بعد 2005 میں ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ کو بھی اردو زبان سے وابستہ کر دیا۔ اس ادارے نے اردو میڈیا کو عالمی سطح پر متعارف کرانے اور اہم مقام دلانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ وائس آف امریکہ پر برصغیر ہند و پاک کی خبروں کے علاوہ عالمی صورت حال اور اردو کی ادبی و ثقافتی سرگرمیاں بھی پیش کی جاتی ہیں۔ چناں چہ امریکہ کی تہذیبی و ثقافتی زندگی میں وائس آف امریکہ کی اردو سروس کا کردار قابل تحسین ہے۔ اس کے علاوہ تھرڈ ورلڈ براڈ کاسٹنگ اور ریڈیو شکاگو پر بھی اردو پروگرام پیش کیے جاتے ہیں۔ ٹیلی ویژن چینلوں میں بی بی سی اردو، اے آر وائی گولڈ اور تھرڈ ورلڈ براڈ کاسٹنگ کے ذریعے اردو پروگرام نشر کیے جاتے ہیں۔

خلیجی ممالک میں اردو صحافت اور زبان و ادب کی تاریخ بھی بہت قدیم ہے۔ ہند و پاک کے اہل اردو کی بہت بڑی تعداد خلیجی ممالک میں مقیم ہیں جنھوں نے اپنی زبان و تہذیب کے فروغ و استحکام کے لیے شعر و ادب کے ساتھ ساتھ مجلات بھی شائع کیے۔ اخبارات کے معاملے میں عرب کے نمائندہ اخباروں نے اردو کے لیے ان میں صفحات مخصوص کر کے ضمیمے شائع کیے۔ اس سلسلے میں کویت ٹائمز، صوت الخلیج، عرب ٹائمز، قطر گلف ٹائمز، المدینہ اردو، اردو نیوز اور الریاض ڈیلی اردو خبروں کی اشاعت میں اہم رول ادا کر رہے ہیں۔ 'خلیج کے دیگر ممالک میں کئی چھوٹے بڑے اردو اخبارات و رسائل کے علاوہ سعودی عرب سے ایک مکمل اردو روز نامہ 'اردو نیوز' شائع ہو رہا ہے۔ سعودی عرب سے ہی حج کے ایام میں 'المدینہ' کے نام سے اردو بولنے اور سمجھنے والے حاجیوں کی سہولت کے لیے اردو اخبار شائع کیا جاتا ہے جس کی اشاعت چالیس ہزار سے شروع ہو کر لاکھ کے ہندسے کو چھو رہی ہے۔''

(گلزار جاوید، خلیجی ممالک میں اردو، مشمولہ اردو کی نئی بستیاں، مرتبہ گوپی چند نارنگ، ساہتیہ اکادمی، 2006 ص 15-414)

خلیجی ممالک میں اخبارات و رسائل کے علاوہ کئی ریڈیو اور ٹیلی ویژن چینل بھی اردو میں اپنی نشریات پیش کر رہے ہیں۔ جن میں سعودی ریڈیو نشریات (1950) ابوظہبی ریڈیو کی اردو نشریات (1970)، قطر ریڈیو سروس (1980) اور ریڈیو کویت کے علاوہ آل انڈیا ریڈیو، ریڈیو پاکستان اور بی بی سی، وائس آف جرمنی اور وائس آف امریکہ کی اردو نشریات بہت مقبول ہیں۔ نیز متحدہ عرب امارات سے کئی گھنٹے ٹیلی ویژن پر اردو میں پروگرام نشر کیے جاتے ہیں جن میں شارجہ ٹی وی بہت اہم ہے۔

اردو زبان و ادب اور صحافت کے حوالے سے ماریشس کا نام بھی محتاج تعارف نہیں۔ یہاں اردو بولنے، لکھنے اور پڑھنے والوں کی بڑی تعداد ایسی ہے جن کے آبا و اجداد کی زبان اردو تھی۔ لہٰذا اردو کے تئیں ماریشس میں سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر بہت کام ہو رہا ہے۔ جہاں تک ماریشس میں اردو صحافت کے آغاز کی بات ہے تو بیسویں صدی کے نصف سے ہی اس کا تاریخی سرا ملتا ہے۔ ماریشس میں اردو صحافت کے حوالے سے ڈاکٹر علی عادل محمد لکھتے ہیں: ''مسلمانوں نے جو سب سے پہلا اردو مذہبی اخبار نکالا تھا اس کا نام ''روشنی'' تھا۔ اس کے مدیر طیب ایوب تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک اور اردو اخبار

''البدر'' شائع ہوا تھا جس کے مدیر حافظ جمال احمد تھے۔ غالباً 1950 میں مولانا چدوڑ نے اردو میں ایک مذہبی اخبار شائع کیا تھا جس کا نام ''الہلال'' تھا۔ یہ بات اغلب ہے کہ ایک اچھے نظام کی کمی اور اردو پڑھنے والوں کی قلت سے یہ اخبارات چند ہی سالوں میں سرے سے غائب ہوگئے۔''

ماریشس میں اردو زبان و ادب اور صحافت کی صورت حال بھی قدرے بہتر ہے۔ یہاں سے دی مینارٹ، رسالہ مہتاب اور صدائے اردو کے نام سے اخبارات و رسائل نکلے۔ اس کے علاوہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن چینل پر اردو کے پروگرام نشر کیے جاتے ہیں جنھیں ماریشس میں بڑے شوق سے دیکھا اور سنا جاتا ہے۔

بنگلہ دیش کے دارالحکومت ڈھاکہ سے 1906 میں حکیم حبیب الرحمٰن نے 'المشرق' نام سے ایک ماہنامہ جاری کیا۔ جس کی طباعت کلکتہ سے ہوتی تھی۔ 1923 میں حکیم حبیب الرحمٰن نے ڈھاکہ سے 'جادو' نکالا۔ اس کے علاوہ ماہنامہ اختر، العلاما، روزنامہ پاسبان پھر قیام پاکستان کے بعد سہ روزہ 'مشرقی پاکستان' ماہنامہ خاور، دلربا، امین، منشور، سرفراز، خاتون، مشرق، رفتار، مشعل، نقیب اور نشیمن وغیرہ جریدے نکلے۔ 1971 میں قیام بنگلہ دیش کے بعد چاٹگام سے مصحف، سنگ میل اور فکر نو، نیا آدم، رفتار، افشاں، ضیا، اخبار بنگلہ دیش، انتخاب، افق، صدائے آگہی، صدائے زنداں، صدائے بازگشت، صبح امید، سہ ماہی ادب وغیرہ شائع ہوئے۔ ''بنگلہ دیش سے جو اخبارات شائع ہوئے ہیں۔ خصوصاً 1977 سے لے کر 1990 تک کے عرصے میں یہ قابل رشک ہے۔ 1999 میں 21 فروری کو بین الاقوامی یوم السنہ اعلان کرنے کے بعد بنگلہ دیش میں اردو زبان اور اہل اردو کے بارے میں گورنمنٹ کا نظریہ بھی بدل گیا ہے۔ اب مالی تعاون کی کوئی فکر نہیں، صرف سرپرستی کی ضرورت ہے۔ اس سرپرستی کے لیے بہت سی انجمنیں کام کر رہی ہیں۔''

(ڈاکٹر محمد غلام ربانی، بنگلہ دیش میں اردو صحافت: ماضی اور حال، مشمولہ اردو صحافت کے دو سو سال، مرتبہ ارتضیٰ کریم، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی، 2017، جلد اول، ص 93-92)

جاپان میں این ایچ کے ورلڈ، جاپانی حکومت کا نشریاتی ادارہ ہے جو پوری دنیا میں اور مختلف زبانوں میں اپنی نشریات پیش کرتا ہے۔ اس کے تحت ریڈیو جاپان نے 3 دسمبر 1942 سے اردو سروس کا آغاز کیا لیکن اس کی باقاعدہ نشریات 1955 سے جاری ہے۔ ریڈیو جاپان پر اردو میں متعدد معلوماتی، تہذیبی اور ثقافتی پروگرام پیش کیے جاتے ہیں جو ہند و پاک میں بے حد مقبول ہیں۔ اس کے علاوہ اردو نیٹ جاپان، پاک جاپان نیوز، اردو ورلڈ نیوز اور اردو نیٹ پوڈ کاسٹ وغیرہ آن لائن پورٹل کے طور پر اردو زبان میں نشر و اشاعت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ چائنا ریڈیو انٹرنیشنل سے بھی بیسویں صدی کے نصف سے ہی اردو نشریات جاری ہے۔ آسٹریلیا سے صدائے وطن سڈنی، اخبار جہاں، نوائے وقت، عالمی اخبار کے علاوہ پاکستانی اخبار جنگ، ڈان اور بی بی سی کی اردو سروس جاری ہے اور ایس بی ایس کے تحت ریڈیو سڈنی کے ذریعے اردو پروگرام پیش کیے جاتے ہیں۔ روس کے نشریاتی ادارے ریڈیو ماسکو سے صدائے روس کے نام سے دوسری عالمی جنگ کے زمانے میں ہی اردو میں متنوع پروگرام پیش کیے گئے۔ ریڈیو تہران ایران سے اردو سروس انقلاب ایران کے بعد ہی سے جاری ہے۔ اس کے علاوہ سحر ٹی وی، اسلامک ریپبلک آف ایران براڈ کاسٹنگ کی ایک شاخ، سحر یونیورسل نیٹ ورک کا ایک حصہ ہے۔ یہ چینل انٹرنیشنل سطح پر برصغیر کے علاوہ یورپ، سینٹرل ایشیا، قفقاز اور شمالی افریقہ کے کچھ حصوں میں، دنیا کی چار زبانوں میں اپنی نشریات پیش کرتا ہے جن میں اردو کے علاوہ آذری، کردش اور بوسنیا زبانیں شامل ہیں۔ اس کے پروگرام ٹیلی ویژن چینل اور سوشل میڈیا پلیٹ فارم کے ساتھ ساتھ اس کی ویب سائٹ www. urdu.sahartv.ir پر بھی موجود ہیں۔ نیز ایران میں متعدد اردو کی ویب سائٹس بھی ہیں جو اردو زبان و ادب اور صحافت و ثقافت کے فروغ میں معاون ہیں۔

گویا بیرون ہند و پاک اردو میڈیا کی تاریخ کوئی نئی نہیں ہے بلکہ انیسویں اور بیسویں صدی سے ہی اس کا سرا ملتا ہے۔ ان ممالک سے شائع ہونے والے اردو اخبارات و رسائل کی فہرست اتنی طویل کہ ہے جن کا شمار بہت مشکل ہے۔ اس کے علاوہ عالمی سطح پر اردو میڈیا کو متعارف کرانے اور مقبول عام بنانے میں سب سے اہم کردار ریڈیو نشریات کا ہے۔ چوں کہ ریڈیو کا تعلق براہ راست عوام سے ہوتا ہے اس لیے بیشتر ممالک کی حکومتوں نے اپنی بات عوام تک پہنچانے کے لیے ریڈیو نشریات کا سہارا لیا اور اپنی تہذیب و ثقافت اور پالیسیوں سے دنیا کو روشناس کرانے کے لیے دنیا بھر کی متعدد زبانوں میں پروگرام نشر کرایا۔

مجموعی طور پر عالمی تناظر میں اردو میڈیا کا جائزہ لینے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی تاریخ انتہائی قدیم اور روایت بہت مستحکم ہے۔ چوں کہ انیسویں صدی کے اواخر میں ہی اردو صحافت نے بیرون ہند اپنا قدم رکھ دیا تھا اور دنیا کے مختلف گوشوں میں باقاعدہ اردو اخبارات نکلنے لگے تھے لہٰذا اردو کی نئی بستیوں سے اردو میڈیا کی ایک روشن تاریخ وابستہ ہوگئی۔ بیسویں صدی میں اس میں مزید تیزی آگئی اور زبان و ادب کے فروغ کے لیے رسائل و جرائد بھی کثرت سے شائع ہونے لگے اور جب ریڈیو، ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ کا وجود عمل میں آیا تو ان ذرائع پر بھی اردو کی نمائندگی درج ہوئی۔ اردو کی نئی بستیوں میں مقیم اہل اردو نے بے شمار اخبارات و رسائل نکالے، بڑے بڑے میڈیا اداروں نے ریڈیو پر اردو سروس کا آغاز کیا، ٹیلی ویژن چینلوں پر اردو پروگراموں کا سلسلہ شروع ہوا جن پر زبان و ادب اور تہذیب و ثقافت کے حوالے سے ہر دم متنوع پروگرام، تازہ ترین حالات و واقعات اور اردو کی سرگرمیاں پیش کی جاتی ہیں۔ انٹرنیٹ کی دنیا میں بے شمار اردو کی ویب سائٹس بنائی گئیں اور دنیا بھر کی خبریں بالخصوص برصغیر کی تمام اہم خبریں، مضامین اور کالمز ان پر اپلوڈ کیے جاتے ہیں۔ اس طرح ڈیجیٹل ورلڈ میں بھی اردو کی نمائندگی بڑھانے میں یہ ویب سائٹس بحسن و خوبی اپنے فرائض انجام دے رہی ہیں۔ اردو کی ان نئی بستیوں میں جب تک اہل اردو موجود ہیں غیر سرکاری سطح پر بھی اردو میڈیا فروغ پاتا رہے گا جب کہ سرکاری اور ملکی سطح پر میڈیا کے چند بڑے ادارے ہند و پاک میں اپنی نمائندگی قائم رکھنے کے لیے اردو میڈیا کا سہارا بنتے رہیں گے یا اپنی تہذیب و ثقافت کے فروغ کے لیے اردو میڈیا کو سہارا بناتے رہیں گے۔

> **اردو کی نئی بستیوں میں مقیم اہل اردو نے بے شمار اخبارات و رسائل نکالے، بڑے بڑے میڈیا اداروں نے ریڈیو پر اردو سروس کا آغاز کیا، ٹیلی ویژن چینلوں پر اردو پروگراموں کا سلسلہ شروع ہوا جن پر زبان و ادب اور تہذیب و ثقافت کے حوالے سے ہر دم متنوع پروگرام، تازہ ترین حالات و واقعات اور اردو کی سرگرمیاں پیش کی جاتی ہیں۔**

■

Imteyaz Rumi
13/5, Noor Nagar, Jamia Nagar
New Delih-110025
Mob.: 9810945177

نساخ

حیات و خدمات

ابوالبرکات جیلانی

عبدالغفور خان، خالدی نساخ نہ صرف بنگال بلکہ ہندوستان کے عظیم ادبی ستون میں شمار کیے جاتے ہیں۔ نساخ نہ صرف ادبی صلاحیت رکھتے تھے بلکہ ایک افسر کی خاصیت بھی ان کے اندر تھی۔ وہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ڈپٹی مجسٹریٹ ڈپٹی کلکٹر بھی تھے۔ ادبی دنیا میں جس طرح انھوں نے اپنا ایک الگ مقام بنایا وہیں دفتری کام میں انھوں نے اپنا ایک الگ عکس چھوڑا ہے۔ نساخ نے اپنا علمی و ادبی سفر جاری رکھا اور بے پناہ دفتری کام کاج میں مصروف رہنے کے باوجود اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بھی انجام دیتے رہے۔ ان کا تبادلہ جہاں جہاں ہوا ان کے نئے نئے دوست و شاگرد بنتے رہے۔ شعر و شاعری کی محفلیں بھی گرم ہوتی رہیں۔ تصنیف و ترتیب، تدوین و ترجمہ کا ذوق ہمیشہ رہا۔

نساخ کا نام عبدالغفور تھا کنیت ابومحمد، خطاب خان بہادر اور تخلص نساخ۔ اپنے نام کے ساتھ خالدی بھی لکھا کرتے تھے۔ بقول نساخ ان کا شجرہ نسب خالد بن ولیدؓ سے ملتا ہے۔ اپنی سوانح حیات میں لکھتے ہیں کہ ان کے بزرگ مغل دورِ حکومت میں ہندوستان آئے۔ یہاں انھیں حکومت کی جانب سے جاگیریں عطا ہوئیں۔ ان کے بزرگوں نے ضلع فرید پور (مشرقی بنگال) میں سکونت اختیار کی۔ نساخ نے اپنی خودنوشت میں اپنے اجداد کی ایک مکمل فہرست دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''خاکسار عبدالغفور متخلص بہ نساخ، ڈیپوٹی کلکٹر ڈھاکہ، برادر خودنواب عبداللطیف خان بہادر، سی۔ آئی۔ ای، وزیر ریاست بھوپال، ابن جناب قاضی فقیر محمد مرحوم، موئف نسخۂ جامع التواریخ وکیل عدالت دیوانی صدر کلکتہ ابن قاضی محمد رضا ابن قاضی محمد شفیع ابن قاضی عبدالشکور ابن قاضی محمد اشرف ابن قاضی عبدالوہاب ابن قاضی عبدالرسول ابن شاہ عبدالدین محمد ابن شاہ، بدیع الدین احمد ابن شاہ احمد ابن محمد قاسم ابن ابوعبداللہ حسین ابن شمس الدین محمد ابن ابواسماعیل نجم الدین ابن علی ابن عبدالعزیز ابن محمود ابن محمد، ابن عبداللہ ابن ابوعبداللہ محمد ملقب شرف المعالی عمدۃ الدین معروف بہ ابن القیر انی ابن نصر ابن صغیر ابن واعز ابن محمد ابن خالد ابن نصر ابن واعد ابن عبدالرحمان ابن حضرت مہاجر حضرات سیف اللہ خالد ابن ولید مخزومی رضی اللہ عنہ۔

(مرتبہ عبدالسبحان، خودنوشت سوانح حیات نساخ، ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ، 1986، ص 1,2)

اس طرح نساخ کا سلسلہ نسب اکتیسویں پشت میں حضرت خالد بن ولید تک پہنچتا ہے۔ نساخ کے والد مولوی فقیر محمد 1816 میں تلاش معاش میں کلکتہ آئے یہیں نساخ کی پیدائش 1249ھ میں ہوئی۔ ''بقول نساخ وہ بروز منگل عین نماز عید کے قبل پیدا ہوئے۔ گویا اسلامی تاریخ کے اعتبار سے یکم شوال 1249 ھجری میں پیدا ہوئے۔ نساخ کا تعلیمی سفر ساڑھے چار برس کی عمر میں شروع ہوا اور شعر گوئی کا شوق سات سال کی عمر سے شروع ہوا۔ نساخ خود لکھتے ہیں:

''میں سات برس کی عمر سے کچھ کچھ شعر موزوں کرتا تھا۔ ان دنوں جو شعر کہے تھے وہ یاد نہیں اور بھی یاد بھی رہنے سے قابل لکھنے کے نہیں تھے۔'' (ایضاً، ص 9)

سات برس کی عمر میں مدرسہ عالیہ کلکتہ میں ان کا داخلہ ہوا۔ اسی دوران نساخ کی والدہ ماجدہ کا انتقال ہوگیا۔ والدہ کے انتقال سے ٹھیک ستائیس دنوں کے بعد نساخ کے والد قاضی فقیر محمد کا انتقال 1259 میں ہوا۔ والد کے مرنے کے بعد بڑے بھائی نواب عبداللطیف نے اپنے بھائیوں کی پرورش، خورد و نوش اور تعلیم کی ذمے داری خوب نبھائی۔ سنہ 1847 میں نساخ اور ان کے بڑے بھائی عبدالباری کو ہگلی کالج میں اعلیٰ تعلیم کے لیے داخل کیا گیا۔ یہاں ان کی ملاقات مولوی رمضان اللہ اور مولوی رشیدالنبی وحشت سے ہوئی اور یہ ان کے تلمیذ ہوئے۔ اس کے بعد اپنے زمانے کے مانے جانے عالم حافظ اکرام احمد صیغم رام پوری کی شاگردی اختیار کرلی۔ بارہ تیرہ سال کی عمر میں اس لائق ہوگئے کہ اپنے کلام کی اصلاح خود کرلیتے اور دوسروں کو بھی اصلاح دینے لگے اس طرح ان کا تخلیقی سلسلہ چلتا رہا۔ 1852 میں ہگلی کالج سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد تلاش معاش کے لیے ڈھاکہ گئے وہیں بڑے بھائی عبداللطیف کی مدد سے سیشن جج کے دفتر میں ملازمت اختیار کرلی کچھ ہی دنوں بعد صدر دیوانی عدالت میں مترجم ہوئے۔ سنہ 1862 میں وہ ڈپٹی کلکٹر و ڈپٹی مجسٹریٹ کے عہدے پر فائز ہوگئے۔

راج شاہی کے قیام کے دوران نساخ کی شادی مرزا ہمایوں بخت خلف مرزا خرم بخت کی دختر نیک اختر سے ہوئی۔ وہیں ان کے یہاں ایک بیٹی کی پیدائش ہوئی لیکن اسی دن اللہ کو پیاری ہوگئی۔ اگست 1866 میں نساخ کا تبادلہ بھاگل پور کمشنری کے ضلع بانکا میں ہوتا ہے یہاں ان کا قیام فروری 1869 تک تھا بان کا کے ہی قیام کے دوران ان کے بیٹے ابوالقاسم محمد کی پیدائش ہوئی جن کا تاریخی نام مظہر الحق تھا۔ ابوالقاسم محمد بھی بڑے شاعر گزرے ہیں۔ بنگال کے استاد شاعر و غالب ثانی کہے جانے والے مولانا وحشت کلکتوی ان کے شاگرد ہیں۔ نساخ چونکہ سرکاری ملازم تھے اکثر و بیشتر ان کا تبادلہ ہوتا رہا مگر ادبی سلسلے سے مضبوط ڈور کے ساتھ بندھے رہے۔ جہاں بھی جاتے اپنی پہچان چھور جاتے خواہ وہ سرکاری کام کاج ہو یا پھر ادبی محفلیں۔

نساخ کی شخصیت بڑی دل آویز تھی۔ ان کے احباب کا دائرہ بڑا وسیع تھا۔ اپنے دور کے ادبا، شعرا و فضلا سے ان کی اچھی خاصی دوستی تھی۔ ان کی خاصیت یہ تھی کہ وہ جس جگہ بھی تفریح کے لیے یا پھر سرکاری کام کے سلسلے سے گئے وہاں انھوں نے دوست پیدا کر لیے۔ چنانچہ سخن شعرا اور خودنوشت سوانح میں ان کے احباب اور ملنے جلنے والوں کی ایک کثیر تعدا کا ذکر ہے۔ اس سے ان کی شخصیت اور ہردلعزیزی کا پتہ چلتا ہے۔

نساخ اپنے تخلص کے لیے اکثر موضوع بحث رہے نساخ شروع شروع میں مجبور تخلص کرتے تھے چنانچہ ان کے پہلے دیوان 'دفتر بے مثال' دو میں قطعے اسی تخلص کے ملتے ہیں۔

کیوں نہ لکھے ناسخ و آتش کی غزلوں کا جواب
ہندتک شہرہ ہے فکر صائب مجبور کا
ناسخ و آتش زبان کی گور میں لگ جای آگ
وصال کی گرمی کا مضمون گر سے مجبور سے

(نساخ، دفتر بے مثال، مظہر العجائب کلکتہ 1280ھ، ص 148)

تخلص بدلنے کے سلسلے میں مختلف ادیبوں نے اپنی رائے پیش کی ہے سبھوں کا کہنا ہے کہ انھیں ناسخ لکھنوی کا حریف وحریف غالب بننے کا خیال ہوا۔ اس خیال کے زیر اثر انھوں نے اپنا تخلص بدل کر نساخ رکھا جو ناسخ کا صیغہ مبالغہ ہے۔ لیکن 'تذکرۃ المعاصرین' میں نساخ کے تخلص کی تاویل میں حاجی ناظر محمد عبداللہ تخلص آشفتہ نے ایک خوبصورت قطعہ میں اس طرح وضاحت کرتے ہیں، ملاحظہ فرمائیں:۔

شکل نساخ چہ آئینہ معنی آمد
کہ از وجہہ ارباب سخن تورانی
چہرہ پرداز نظامی بودو سعدی ہم
جلوہ افروز رخ انوری و خاقانی

حضرت نساخ نے شاعری اور نثری دونوں صنف میں طبع آزمائی کی اور دونوں میں کامیاب بھی نظر آتے ہیں بہت کم شاعر یا ادیب ایسے ہیں جنھوں نے شاعری اور نثر دونوں فن میں اپنی صلاحیت کا مظاہرہ کیا ہو اور اس میں کامیاب ہوئے ہوں ان میں سے ایک نساخ کی شخصیت ہے جنھوں نے شعری اور نثری اصناف ادب میں بیش بہا سرمایہ بطور یادگار چھوڑا ہے نثر کی بہ نسبت شاعری کا ذخیرہ زیادہ ہے مگر وہ دونوں میں مسلم نظر آتے ہیں۔ نساخ نے اپنے اردگرد کے ماحول کے اثرات کو قبول کیا انھوں نے ماحول کے زیر اثر کبھی لکھنوی انداز میں شاعری کی تو کبھی دہلی کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں۔ اس لیے دونوں دبستانوں کی جھلکیاں ان کی شاعری میں واضح طور پر عیاں ہیں۔

رشیدالنبی وحشت اور اکرام احمد ضیغم جیسی باکمال ادبی شخصیت کے زیر سایہ نساخ کی شاعری بھرپور پروان چڑھی اور نساخ نے ایک قادر الکلام شاعر کے طور پر اردو ادب کی تاریخ میں اپنا منفرد مقام بنالیا۔ شاعری کی حیثیت سے دیکھیں اور صنعتِ تضاد کے ساتھ، موقع ومحل کی مناسبت سے ممکنہ صنعتوں کو برتنے کا سلیقہ، لفظ و معنی، کا ارتباط اور مضمون باندھنے کا جو دل آویز انداز ہے وہ نساخ کی تخلیقی قوت کے ساتھ لسانی ترتیب کا جواز فراہم کرتے ہیں۔ انتخاب الفاظ میں مہارت، عروض وبلاغت پر دسترس اور مصرعے موزوں کرنے کے سلیقے نے اسلوب میں جدت، طرز ادا میں ندرت پیدا کی ہے۔ شعر ملاحظہ فرمائیں۔

سچ سچ جو مجھ سے پوچھیے تو فن شعر میں
نساخ اپنے وقت کے تم بھی امام ہو

فارسی شعر۔

خدایا شوخی ارنی عنایت کن زبانم را
بزن آتش زشمع لن ترانی جسم و جانم را

ان کی شاعرانہ صلاحیت کے بارے میں ڈاکٹر صدرحق لکھتے ہیں:

انھوں نے ماحول کے زیر اثر کبھی لکھنؤ کی پیروی کی تو کبھی رنگ دہلی کی۔ اسی لیے دونوں دبستانوں کے خد وخال کے واضح نقوش ان کی شاعری (غزل ہو یا قطعہ، رباعی ہو یا سراپا) میں ہم پاتے ہیں یعنی لکھنوی شاعری کی جملہ خصوصیات مثلاً زیورات اور لباس کی تفصیل' محبوبہ کے اعضائے بدن کا تذکرہ' رشک ناہید کے رقص وسرود کا ذکر، داغ جنوں، محیر العقول مبالغہ، توسل، ثقیل، مشکل اور غریب الفاظ کا استعمال، دوراز کار مضامین کی تلاش، رعایت لفظی وغیرہ گویا ان کی اس طرز کی شاعری کاغذی پھولوں کا ایک گلدستہ ہے جس میں رنگ تو ہے مگر خوشبو کا کہیں پتہ نہیں اور رنگ دہلی میں سادگی زبان و بیان چست اور استوار فارسی ترکیبیں، داخلی جذبات کی عکاسی کے سلسلے میں، ہجر نصیبی، نالہ آہ و فریاد، دیدار یار کی تمنا، وصل و نامرادی وغیرہ لیکن ان خصوصیتوں کے باوجود ان کی شاعری میں ایک چیز کھٹکتی ہے اور وہ شدتِ احساس اور خلوص جذبات کا فقدان اور اسی کمی کی وجہ ان کی شاعری میں تڑپ نہیں۔

(ڈاکٹر صدرالحق، نساخ (حیات وخدمات) انجمن ترقی اردو پاکستان، 1977، ص 309)

اردو اور فارسی دونوں زبان میں شاعری کرنے والے نساخ جو کہ بنگال میں شاعری کے موجد سمجھے جاتے ہیں جنھوں نے اپنی بیش بہا 22 تصنیفات یادگار چھوڑی ہیں جن کے دواوین، تذکرے، رباعیاں، نظمیں اور غزلیں وغیرہ اہم ہیں۔

بنگال میں اردو اور فارسی ادب کو فروغ دینے میں نساخ نے جو نمایاں کردار ادا کیا ہے اس کا ثانی کوئی نہیں۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ انیسویں صدی کے بنگال میں اردو اور فارسی شاعری کے موجد نساخ ہیں۔ ان کی تصنیف کردہ سخنِ شعرا اور تذکرۃ المعاصرین اردو گو اور فارسی گو شاعروں کا ایک انسائیکلوپیڈیا ہے ان کی اس تصنیف میں ایسے ایسے شاعروں کا ذکر ہے جسے دنیا آج بھلا چکی ہے انھوں نے ایک بیش قیمتی خزانہ آنے والے نسلوں کے لیے بطور یادگار چھوڑا ہے۔ ان کے انتقال کے بعد محمود آزاد نے انھیں خاتم الشعرا اور عبدالرؤف وحید نے انھیں امام الشعرا کہا ہے۔

نساخ کی شاعرانہ صلاحیت کے مدنظر ان کی رباعی کی بات کی جائے تو جناب اس فن میں بھی صاحب دیوان ہیں۔ نساخ کے دو مجموعہ ہائے رباعیات 'ترانۂ خامہ' اور 'نصرۃ المسلمین' ہیں۔ دونوں مجموعوں کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے یہاں بھی ستم ظریفی دیکھیے کہ اردو کے معتبر نقاد شمس الرحمن فاروقی نے کہا کہ جعفر علی حسرت لکھنوی اور اموجان دہلوی (رباعیات عجائبات اموجان ولی 1318 ہجری) کے علاوہ کسی پرانے اردو گو شاعر نے رباعیات کا دیوان مرتب نہیں کیا۔ جبکہ نساخ کی رباعیات ان لوگوں سے 16 سال قبل ہی (ترانۂ خامہ 1302 ہجری و نصرۃ المسلمین 1303 ہجری) چھپ چکی تھیں۔ اس کے علاوہ سلام سندیلوی نے قدیم شعرا سے لے کر جدید شعرا کی رباعی گوئی کے حوالے سے تفصیلی گفتگو کی ہے لیکن عبدالغفور نساخ کی رباعی کے حوالے سے کچھ کہنا گوارہ نہیں کیا۔ جبکہ نساخ کی دو رباعیات کے مجموعے منظر عام پر آ چکے تھے۔ ان دونوں مجموعوں میں رباعیوں کی مجموعی تعداد 225 ہے سلام سندیلوی نے نساخ کی صرف رباعی نقل کر کے اپنے دامن کے بوجھ کو ہلکا کر لیا۔ رباعی کا نمونہ ملاحظہ فرمائیں:

اب عشق میں رسوائی سی رسوائی ہے
جب دیکھیے آک خلق تماشائی ہے
پر حیف وہ حال سن کے فرماتے ہیں
نساخ جنوں زدہ ہے سودائی ہے

(اردو رباعیات، سلام سندیلوی 1963، ص 825)

لہٰذا نساخ کی رباعی 'ترانۂ خامہ' اردو زبان و ادب کی اولین رباعیوں کا دیوان ہے جسے لوگوں نے فراموش کر دیا ہے۔

نساخ شاعر کے علاوہ باصلاحیت تنقید نگار بھی ہیں۔ اپنے دور میں انھوں نے تنقید نگاری کا آغاز کیا اس نے اردو ادب میں ایک نئی جہت پیدا کی۔ ان کی تنقید نے کئی

تنقید نگاروں کو جنم دیا ہے یہ حضرت ناسخ کی دین ہے کہ انیسویں صدی عیسوی میں بہت ساری تنقید کی کتابیں منظر عام پر آئیں۔ انھوں نے آتش، ناسخ اور امیر پر اعتراضات کیے وہیں انیس و دبیر کے کلام کے فنی وفکری نقائص بیان کیے بلکہ ان نقائص پر مشتمل ایک کتاب 'انتخاب نقص' کے عنوان سے شائع کیا۔ جس سے اہل لکھنؤ کے درمیان ہلچل مچ گئی اور یہ کتاب اردو زبان کو اپنی ملکیت سمجھنے والوں کی انانیت پر سامنے سے حملہ تھا اس وار کا مقابلہ کرنے کے لیے پورا لکھنؤ متحد ہو گیا تاہم ناسخ کے اعتراضات کی وجہ سے تنقید نگاری کا دور شروع ہوا۔ ناسخ کی کتاب نقص منظر عام پر آنے کے بعد جو تنقید کی کتابیں شائع ہوئیں ان میں ''طومار اغلاط، تطہیر الاوساخ (محمد رضا معجز ناسخ کے شاگرد تھے)، رد ناسخ وجواب انتخاب نقص (منشی مظفر ہنر)، سنان دلخراش (منیر شکوہ آبادی) کے علاوہ گستاخی معاف، تفضیح اور تردید الایرادات وغیرہ منظر عام پر آئیں۔ غرض اس عہد کی قد آور ادبی شخصیتوں نے ناسخ کی ہمت افزائی کرنے کے بجائے انھیں ان کی گستاخی پر محمول کیا۔ ناسخ پر خوب کیچڑ اچھالے گئے۔ ان کا تعلق چونکہ بنگال سے تھا اس نسبت سے ان کے بنگالی پن کو نشانہ بنایا گیا، حالانکہ وہ ہرگز بنگالی نہ تھے ان کے اجداد عربی نسل تھے۔ ان کے شعروں میں خامیاں نکال کر انھیں کمتر اور معمولی شاعر ثابت کرنے کی خوب کوشش کی گئی۔ تاہم ناسخ کے اعتراضات کی وجہ سے تنقیدی رجحان کو بڑھاوا ملا۔

اگر ہم ناسخ کے تنقیدی شعور کا پتہ لگانا چاہیں تو ان کے کلام کی اصلاح سے بھی ملتا ہے جو انھوں نے اپنے اولین دیوان دفتر بے مثال کے دوسرے ایڈیشن میں اشعار کو بدل کر قلم بند کیا۔ بعض کے مصرعوں میں تبدیلی کی، بعض کی ترتیب میں تبدیلی کی اور بعض اشعار کے الفاظ کو بدل کر اس کی جگہ دوسرے الفاظ استعمال کیے۔ ان کے اس عمل کو ان کی خود پر کی گئی تنقید کا حصہ تصور کیا جا سکتا ہے۔

بہر کیف ناسخ کی شخصیت ایک ناقد کی حیثیت سے بھی اردو ادب میں اپنا نمایاں مقام رکھتی ہے۔ ان کا رسالہ 'انتخاب نقص'، فن تنقید نگاری کی تاریخ میں ایک گراں بہا اضافہ ہے۔

ناسخ نے جو بیش بہا ادبی سرمایہ چھوڑا ہے ان میں چار دیوان جس میں دفتر بے مثال اولیں دیوان ہے۔ اس کی سال ترتیب 1860 اور سال طباعت 1863 ہے جو مظہر العجائب پریس کلکتہ سے طبع ہوا۔ ابتدائی دس صفحوں پر مشتمل مولوی نجم الدین حسین نادر یمن سنگھ، مولوی عبید اللہ العبیدی مدنی پوری اور مولوی ریاضت اللہ اوج راقم اخبار دوربین باشندہ پٹنہ کی فارسی میں تقریظیں ہیں۔ دیوان کے آخری تین صفحوں پر مصنف نے فارسی میں اپنے حالات زندگی اختصار کے ساتھ، اسباب شعر گوئی اور ترتیب دیوان کے متعلق لکھا ہے۔ ناسخ نے دفتر بے مثال کے اس ایڈیشن کا ایک نسخہ مرزا غالب کو بھیجا۔ اس کی رسید میں مرزا غالب نے ناسخ کو جو خط لکھا اس میں دفتر بے مثال کی بے حد تعریف کی ہے۔ ناسخ نے غالب کے اس خط کو اپنے دوسرے ایڈیشن میں بطور مقدمہ شامل کر دیا۔ غزلیں لکھنوی رنگ میں کہی گئی ہیں۔ یہ دیوان ناسخ لکھنوی کے دیوان دفتر پریشان کے جواب میں تصنیف تھا۔

اشعار نساخ: نساخ کے دوسرے دیوان کا تاریخی نام ہے جس سے 1283ھ تاریخ نکلتی ہے۔ یہ دیوان منشی نولکشور پریس لکھنؤ میں رمضان المبارک 1291ھ 1874 میں طبع ہوا۔ تین صفحوں پر مشتمل تقریظ بہ زبان فارسی ہے۔ اشعار کی مجموعی تعداد ایک ہزار چھ سو بیاسی ہے۔ غزلوں کے علاوہ انیس قطعات، ایک قصیدہ ناتمام، آٹھ رباعیاں اور 34 معمیات ہیں جن میں اردو معمیات کی تعداد صرف 9 ہے۔ 71 متفرق اشعار اور ایک مثلث خواجہ آتش لکھنوی کی غزل پر موجود ہے۔

ارمغان: نساخ کا تیسرا دیوان ہے اور نام 'ارمغان' تاریخی۔ 1877 میں یہ دیوان مطبع نظامی کانپور سے شائع ہوا۔ دیوان کا سال ترتیب 1292ھ ہے جیسا کہ خود نساخ نے لکھا ہے۔ اس دیوان میں صرف 85 صفحات تک غزلیں ہیں۔ رباعیات اور 3 معمیات مرقوم ہیں اور بقیہ صفحے تقریظوں اور تاریخی قطعات پر مشتمل ہیں۔ آخری صفحہ پر غلط نامہ درج ہے۔ نساخ کے اس دیوان میں غزلوں اور فردیات کے علاوہ 9 قطعے، 50 رباعیاں جن میں ایک رباعی فارسی کی ہے اور تین معمات ہیں۔ معمی اردو میں صرف ایک ہے اس کے علاوہ نساخ کا فارسی کلام شامل ہے۔

ارمغانی: نساخ کا چوتھا اور آخری دیوان ہے جو مطبع نامی لکھنؤ سے ماہ نومبر 1886 میں طبع ہوا۔ اس دیوان کا سال ترتیب 1302ھ اور اس کا 'ارمغانی' نام بھی تاریخی ہے۔ اس دیوان کا حجم 116 صفحہ ہے لیکن غزلیں اور ابیات صرف 71 صفحات پر مشتمل ہیں اور 28 صفحوں پر محیط مشہور شخصیتوں مثلاً سلاطین، خلفا، نساخ کے متعلقین مشہور شعرا و ادبا ان کے معاصرین اور بعض دواوین کی ترتیب سے متعلق تاریخی قطعات وغیرہ ہیں۔ 18 صفحوں پر مشتمل منظوم تقریظیں و تاریخی قطعات اردو و فارسی میں اس وقت کے شعرا کے لکھے ہوئے ہیں۔

اس کے علاوہ دو فارسی معمیات بھی ہیں۔

چشمہ فیض: چشمہ فیض فریدالدین عطار رحمتہ علیہ کے 'پند نامہ' کا منظوم ترجمہ ہے گویا ان کی یہ نظم ان کی فارسی دانی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ چشمہ فیض کے ترجمے کا مقصد اپنے بڑے بھائی عبداللطیف کے جگر گوشوں کی تربیت سے تحریر فرمائی تھی۔ اس کتاب کا سال اشاعت 1874 ہے۔ منشی نول کشور پریس لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ حمد، نعت و مناجات کے بعد منظوم ترجمہ آگے بڑھتا ہے۔ نساخ کے ترجمے میں صفائی ہے۔ غیر مستعمل اور متروک الفاظ سے پرہیز کیا گیا ہے اور زبان صاف ستھری ہے، سادہ اور رواں ہے جو پڑھنے والے کو اپنے جانب کھینچ لیتی ہے۔

شاھد عشرت: سراپائے تماشا اس کتاب کا نام ہے۔ سراپائے معشوق کی شاعرانہ تصویر کھینچی ہے۔ سال اشاعت 1864 میں شاہد عشرت کے بننے کے لیے مٹیا برج میں ایک بزم مشاعرہ منعقد ہوئی۔ تقاریظ کے ساتھ ساتھ محبوب کی قامت، دوپٹہ، فرق مو، گوہر فرق، زلف، چوٹی، موباف، جبیں، چیں، خال جبیں وغیرہ کی تعریف ملتی ہے۔ اس تعریف میں نساخ نے خوبصورت تشبیہات کا استعمال کیا ہے۔ خاتمے پر نساخ اپنی تعریف خود بیان فرماتے ہیں اس کے علاوہ اپنے استاد رشیدالنبی وحشت کے گزرنے کا افسوس بھی ظاہر کیا ہے۔

مرغوب دل: مرغوب دل نساخ کی فارسی رباعیوں کا ایک بیش بہا مجموعہ ہے۔ نساخ نے شاہد عشرت جس سال ترتیب دیا اسی سال انھوں نے اپنی فارسی رباعیوں کے مجموعے مرغوب دل کو بھی مرتب کیا۔ مرغوب دل تاریخی نام ہے۔ نساخ نے اپنی فارسی صلاحیتوں کا مظاہرہ پیش کیا اور یہ ثابت کیا ہے کہ وہ انیسویں صدی کے ایک اچھے فارسی گو شاعر بھی ہیں۔ 'مرغوب دل' ان کی فارسی رباعیات کا ردیف وار مجموعہ ہے جو 1882 میں زیور اشاعت سے آراستہ ہوا۔

گنج تواریخ: گنج تواریخ نساخ کے تاریخی قطعات کا مجموعہ ہے جو ماہ اکتوبر 1874 میں منشی نول کشور پریس سے شائع ہوا۔ اس میں آغاز اسلام سے لے کر اس وقت کے مشاہیر اسلام کی تاریخ وفات قلم بند کی ہے۔ یہ تمام قطعات فارسی میں کہے گئے ہیں۔

کنزالتواریخ: کنزالتواریخ ایک رسالہ ہے جس میں گنج تواریخ ہی کی طرح تاریخی قطعے اور شعر کہے گئے ہیں۔ اس کا اصلی نام ضمیمۂ گنج تواریخ ہے اور تاریخی نام کنزالتواریخ نکلتا ہے۔ 1294ھ میں شائع ہوا اور نظامی کی جانب سے شکریہ مندرج ہے۔ بیشتر قطعات فارسی میں ہیں۔ تین قطعات تاریخ شاہ باغ ڈھاکہ کی تعمیر میں اردو میں کہے گئے ہیں اس کے علاوہ دو قطعات تاریخ اپنے بڑے بھائی نواب عبداللطیف خان کی بیٹی کی شادی

اورایک قطعہ تاریخ ترتیب دیوان جناب خواجہ عبدالغفار رئیس ڈھاکہ متخلص بہ اختر سے متعلق اردو میں ہیں۔

مظہر معما: یہ رسالہ 15 صفحات پر مشتمل ہے اس کا تاریخی نام 'مظہر معما' ہے۔ مطبع بحرالعلوم لکھنؤ سے 1302 اشاعت پذیر ہوا اور سال ترتیب 1296 ہے۔ اس رسالے میں معموں کی مجموعی تعداد 39 ہے 29 معمے فارسی میں اوردس اردو میں ہیں۔

ترانہ خامۂ : ترانہ خامۂ' نساخ کی اردو رباعیوں کا مجموعہ ہے۔ ترانہ خامہ معروف بہ مرغوب جان۔ تاریخی نام ترانہ خامہ ہے۔ سال 1302ھ میں مطبع بحرالعلوم لکھنؤ سے طبع سے ہوا۔ رباعیاں عشق اورلوازمات عشق پر مشتمل ہے۔

باغ فکر معروف بہ مقطعات نساخ : باغ فکر تاریخی نام ہے اور مقطعات نساخ عرفیت ہے۔ سال ترتیب 1303ھ او ر سال طباعت رمضان المبارک 1304ھ مطابق ماہ جون 1887 اس کی اشاعت مطبع نامی لکھنؤ سے باہتمام ابوالحسنات قطب الدین احمد ہوئی۔ اس کے بعد محمد خالد عابدی نے 1977 میں مرتب کر کے بھوپال بک ہاؤس بھوپال سے شائع کروایا ہے۔ باغ فکر میں قطعات کی مجموعی تعداد 131 ہے۔ اس رسالے میں اشعار نساخ کے 17 قطعے اور ارمغان دیوان سوم کے 6 قطعے بھی شامل ہیں۔ مضامین کے لحاظ سے قطعات زیادہ تر عشقیہ ہیں۔ ہجر کی جان کنی اور اس کی اتبلا، وصل محبوب میسر نہ ہونے کا شکوہ معشوق کی جفا کاریاں، نالہ وفریاداور فغانِ دلِ ناکام اور بد نام ہوجانے کا خوف وغیرہ کے علاوہ ایک دونعتیہ قطعے بھی ہیں اور بے ثباتی عالم پر بھی ایک قطعہ ہے۔ زبان آسان اور صاف ستھری ہے۔ باغ فکر نساخ کی قادرالکلامی کا ثبوت ہے۔

نصاب زبان اردو حصہ دوم (حصہ نظم) : نصاب 'اردوزبان' نساخ کا ترتیب دیا ہوئی کتاب ہے۔ سرورق پر انگریزی کی کچھ تحریر ہیں۔ اس کتاب کواردوزبان کے امتحان کا نصاب کلکتہ یونیورسٹی کے سینٹ نے 1864 کے ایل۔ اے کے امتحان کے لیے مقرر فرمایاہے اسی کتاب کا دوسرا حصہ جس کو مولوی عبدالغفور متخلص بہ نساخ نے کپتان ولیم ناسولیس کی تصحیح سے چھپوایا۔ یہ نسخہ کلکتہ یونیورسٹی کے رجسٹرار کے لیے چھاپا گیا۔ اس کتاب میں ذوق، ظفر، مومن، رند، قبول، سودا اور گویا کی غزلیں اور سودا، ذوق، غالب، مومن اور گویا کے قصیدے شامل ہیں۔

منتخبات دواوین شعرا ہند: یہ تصنیف اردو کے چند شعرا کی غزلوں اور قصیدوں کا مجموعہ ہے اسے نساخ نے ترتیب دیااور کیپٹن ولیم ناسولیس نے کالج پریس کلکتہ سے 1864 میں طبع کرایا۔ اصل میں یہ 'نصاب اردو حصہ دوم' ہے۔ اس کتاب کوبھی ایل۔ اے کے امتحان کے لیے ترتیب دیا گیاتھا۔ اس کتاب میں بھی ذوق، ظفر، مومن، رند، قبول، سودا، غالب، گویاکے قصائداورغزلیں شامل ہے۔

سخن شعرا : سخن شعرا اردو شاعروں کا ایک ضخیم تذکرہ ہے۔ سخن شعرا تاریخی نام ہے جس سے تاریخ 1281ھ نکلتی ہے۔ سال ترتیب ماہ رمضان 1281ھ اور سال اشاعت 1291ھ بمطابق اکتوبر 1874 ہے۔ تذکرہ منشی نولکشور پریس لکھنو سے طبع ہوئی۔ جس میں دو صفحوں پر مشتمل تاریخی قطعات ہیں۔ سخن شعرا میں نساخ نے اردو شاعروں کے کلام کا انتخاب پیش کرنے کے ساتھ ساتھ شاعروں کا مختصر حال بہ زبان اردو پیش کیا ہے۔ یہ نساخ کا ایک اہم کارنامہ ہے جس نے ہندوستان کے بیشتر شاعروں کوگمنام ہونے سے بچالیا۔

قطعہ منتخب : قطعہ منتخب جمادی الاولی 1291ھ بمطابق جولائی 1874 میں منشی نولکشور لکھنؤ سے طبع ہوئی۔ 1276ھ میں یہ کتاب ترتیب دی گئی تھی۔ نساخ نے اپنے قطعہ منتخب میں صرف ان شاعروں کوجگہ دی جنھوں نے قطعہ لکھاہے۔ قطعوں کے انتخاب کے ساتھ ساتھ شعرا کے مختلف حالات بھی لکھ دیے ہیں۔

قند پارسی : قند پارسی جولائی 1872 مطبع نولکشور پریس سے طبع ہوئی۔ جس میں فارسی گوشعرا، بزرگان، صوفیائے کرام وغیرہ کے فارسی کلام کے انتخاب کو یکجا کردیا گیا۔ تقریباً دس فارسی گوشعرا کے کلام کا انتخاب درج ہے۔ اس میں کچھ ایسے شعرا کا ذکر ہے جسے دنیائے ادب فراموش کررہی تھی۔ نساخ نے اپنے تذکرے کے ذریعے انھیں پھر سے دنیائے ادب میں شمار کردیا۔

زبان ریختہ : زبان ریختہ 16 صفحوں کا ایک چھوٹا سارسالہ ہے جوزبان اردو سے متعلق ہے اور مطبع نولکشور لکھنؤ 1874 بمطابق جمادی الاول 1291ھ میں طبع ہوا۔ زبان ریختہ تاریخی نام ہے اوراس سے سال 1275ھ نکلتا ہے۔ رسالے کا پورانام 'رسالۂ درتحقیق زبان اردوئے معلّی ہے۔ نساخ نے زبان ریختہ میں اردو زبان کی مختصر تاریخ بیان کی ہے۔ انھوں نے لفظ کی وضاحت کچھ اس طرح کی ہے:

''معماروں کے محاوروں میں ریختہ اس مصالحہ کو کہتے ہیں جس کوواسطے استحکام درودیوار کے چند اجز مخلوط کرکے بناتے تھےاور چونکہ زبانِ اردو کےنظم میں بھی الفاظِ عربی مثل اللہ و رسول فارسی مثل دل و زبان و ترکی . . . . و... عبرانی...ویونانی....وہندی... وسنسکرت، و تامل... وتلنگو... وزبان گجرات... وزبان چینی۔ زبان امریکا کی ترتیب ہے۔ اس لیےاس کانام ریختہ رکھا گیا۔''

انتخاب نقص : انتخاب نقص بھی 32 صفحات کا ایک رسالہ ہے جو مطبع نظامی کانپور سے محرم 1296ھ میں اشاعت پذیرہوا۔ نساخ نے اس کتاب میں ناسخ، آتش، امیر لکھنوی، انیس، دبیر جیسے قادر الکلام شعرا کے نقص چن چن کر گنوائے ہیں۔

خودنوشت سوانح حیات نساخ: خودنوشت سوانح حیات نساخ کا ایک نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال میں موجود ہے۔ سنہ 1986 میں ڈاکٹر عبدالسبحان نے اسے ترتیب دیا جسے ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال نے شائع کیا۔ جس میں ڈاکٹر عبدالسبحان کا ایک مقدمہ بہ زبان انگریزی درج ہے جس سے نساخ کی زندگی اوران کی خودنوشت کے بارے میں بیش بہا معلومات حاصل ہوتی ہے۔ بقول عبدالسبحان یہ خود نوشت غالباً 1886 میں لکھی گئی تھی، کیونکہ اس میں جو واقعات ہیں ان میں نساخ کے بڑے بھائی خان بہادر عبداللطیف کے وزیر ریاست بھوپال ہونے تک کے واقعے کوقلم بند کیا گیا ہے جو 1886 میں پیش آیا تھا۔

ان کی تمام ادبی خصوصیات کومد نظر رکھتے ہوئے یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ نساخ بیک وقت ایک اچھے شاعر، ایک اچھے تذکرہ نگار، ایک بڑے نقاد،ایک پرہنر سوانح نگار، اردوو فارسی کے ایک بڑے خدمت گار کے علاوہ ایک سچے ڈپٹی مجسٹریٹ رہے۔

عبدالغفور نساخ' انیسویں صدی عیسوی کے ان جید ادیبوں اور شعرا میں سے ہیں جنھیں فی الواقع جامع کمالات اور کثیر الجہات کہا جانا چاہیے۔ ان کا تعلق چونکہ برصغیر کے اس پوربی خطے سے تھا جواُس زمانے کے ادبی مرکزوں یعنی، لکھنؤ، دلی اور رام پور وغیرہ سے بہت دور واقع تھااور ان مرکزوں کے اکثر ادبا وشعرا، بر بنائے معاصرانہ چشمک یا احساس برتری دور دراز کے خطوں کے ادیبوں اور شاعروں کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ اس لیے عبدالغفور نساخ جیسے باکمال جامع الکلام شخص کوبھی بروقت وہ شہرت نہیں ملی جس کے وہ حق دار تھے۔ لوگ ان کا نام جانتے ہیں مگر ان کے کام سے واقف نہیں۔ لوگوں کو یہ علم نہیں کہ شعروسخن کے علاوہ نساخ نے اورکون سی علمی وادبی خدمات انجام دی ہیں۔ ہماری ادبی تاریخ میں ان کی کیاقدروقیمت ہے۔

■

Dr. Abul Barkat Jilani
C/o Master Jilani
83 E/1B/H/31, Belgachia Road
Kolkata - 700039 (WB)

پشکر ناتھ اور میں

نور شاہ

مرحوم عبدالقادر سروری نے کشمیر یونیورسٹی میں شعبہ اردو کی سربراہی کے دوران کشمیر میں اردو زبان کی ترقی و ترویج کے لیے قابل ستائش کام انجام دیے۔ 'کشمیر میں اردو' تین جلدوں پر مشتمل ان کی تصنیف ایک تاریخی دستاویز ہے۔ کشمیر یونیورسٹی کی ایک اور ممتاز شخصیت پروفیسر مجید مضمر اکثر کہا کرتے تھے کہ اگر سروری صاحب دکن سے کشمیر آکر 'کشمیر میں اردو' تصنیف نہ کرتے تو یہاں کے نہ جانے کتنے شاعر اور ادیب قعرِ گمنامی میں پڑے ہوتے اور ان کا کوئی نام لیوا نہ ہوتا۔

آنجہانی پشکر ناتھ کا ذکر کرتے ہوئے مرحوم سروری صاحب لکھتے ہیں:

''پشکر ناتھ کے افسانوں کا محرک کشمیری زندگی اور اس کی حسین فضائیں ہیں لیکن فطرت کے ان حسین مناظر کے درمیان عوام کی غربت اور ان کا افلاس ایک تضاد ہے جس کے نقوش وہ بڑی جانکاری کے ساتھ ابھارتے ہیں۔''

اپنے تاثرات کے پسِ منظر میں مرحوم سروری صاحب پشکر ناتھ کی کہانیوں موت کے سوداگر، رازِ دل، پردہ نشین، انتقام، جاہل، کمینے اور اندھیرے اجالے کا خاص طور سے ذکر کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ پشکر ناتھ کے سلیس انداز میں جو گھلاوٹ ہے اس کا شائبہ اس جملے سے ملتا ہے:

''میں سوچنے لگتی ہوں تو سوچتے ہی چلی جاتی ہوں ہوں اِدھر اُدھر کی باتیں''

پشکر ناتھ کے مشاہدے کی وسعت اور گہرائی زندگی کے اَن گنت تجربات نے ان کے افسانوں کے کرداروں کو زندہ جاوید بنانے میں ایک اہم کردار نبھایا ہے۔ وہ اپنی بات کو بڑی سادگی لیکن روانی کے ساتھ پیش کرنے کا فن بخوبی جانتے تھے۔ وہ اپنے بھرپور اور شگفتہ انداز میں اپنی بات کہنے پر قائم تھے۔ دیکھیے افسانہ 'پردہ نشین' سے یہ اقتباس:

''بخشی کو اپنی غلیظ زندگی سے اس دن نفرت ہوگئی جب بائیس برس پہلے اس کی شادی کی گئی تھی۔ عورت چاہے کیچڑ کے ڈھیر میں پیدا ہوئی ہو چاہے ڈن لپ کے بچھونے پر... شادی کے بارے میں ایک ہی قسم کے خواب دیکھتی ہے۔ بخشی نے بھی اپنی بھرپور جوانی کی آگ پر کچھ ایسے ہی خواب تیار رکھے تھے... پر پہلی ہی رات کو وہ خواب منتشر ہوگئے۔''

یہ اقتباس پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ قارئین کو اس بات کا احساس ہو کہ پشکر ناتھ کے افسانوں میں زندگی کا درد وکرب بھی ہے اور پیار ومحبت کی مختلف کیفیات کا اظہار بھی۔ زندگی سے ملنے والے تجربات کی جھلک ان کی تحریروں میں جابجا ملتی ہے۔ یہی نہیں ان کے افسانوں سے شبنم سے پھوٹی ہوئی نئی صبح کے اجالوں کا انتظار بھی نظر آتا ہے۔

شرافت، نفاست اور شائستگی کا پیکر، بیدار اور مہذب ذہن کے مالک پشکر ناتھ جب 19 ستمبر 2005 کو جموں میں وفات پاگئے تو میں نے کہا تھا کہ وہ ظاہری طور پر ہم سے دور تو ہوگئے لیکن وہ اب بھی زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے اپنی ان گنت کہانیوں میں اور خاص طور سے ان کہانیوں کی وساطت سے جو کشمیر سے تعلق رکھتی ہیں۔

کشمیر کی اقتصادی، سماجی اور ثقافتی زندگی کی نشاندہی کرتی ہیں اور کشمیر کی زندگی کا درد بیان کرتی ہیں۔

کاش وانی ایوارڈ (بوند بوند زہر نامی ڈرامے کے لیے)

آنجہانی پشکر ناتھ کی تحریر کردہ پہلی کہانی 'اور کہانی ادھوری رہ گئی' کی بھی ایک کہانی ہے۔ جموں وکشمیر کے معروف قلم کار ڈاکٹر برج پریمی کا کہنا ہے کہ کسی خاتون افسانہ نگار کی کہانی کے تعلق سے جو ماہنامہ 'بیسویں صدی' میں شائع ہوئی تھی ان کی خوب بحث مباحثہ ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے پشکر جی کو چیلنج کرتے ہوئے کہا۔ ''تم اس سے بہتر کہانی لکھ کر دکھاؤ تو جانیں'' پشکر ناتھ نے یہ چیلنج قبول کیا اور اس طرح ان کی پہلی کہانی 'بیسوی صدی' میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے مڑ کر نہ دیکھا اور زندگی کی آخری سانس تک افسانے اور ڈرامے لکھتے رہے لیکن زندگی کے آخری ایام میں ان کے قلم کی رفتار کچھ دھیمی پڑ گئی تھی۔ انھوں نے پچاس سے زائد اردو ڈرامے لکھے جو ریڈیو کشمیر اور ریڈیو جموں سے نشر ہوئے ان کے ڈرامے 'ساون جلے بھادوں جلے' اور 'بوند بوند زہر' کو قومی سطح پر سراہا گیا۔ انھوں نے ایک ناول 'دشتِ تمنا' بھی لکھا۔

کشمیر کی پنڈت برادری سے تعلق رکھنے والے دو معروف افسانہ نگار آنجہانی پریم ناتھ پردیسی اور آنجہانی پریم ناتھ دھر کے علاوہ جس اردو افسانہ نگار نے ریاست سے باہر کے جرائد اور رسائل میں تواتر کے ساتھ لکھا وہ آنجہانی پشکر ناتھ تھے۔ ہم دونوں کی کہانیاں اکثر ان جرائد اور رسائل میں ایک ساتھ شائع ہوتی تھیں۔ یہاں تک کہ ایک بار ماہنامہ 'کتاب' لکھنؤ میں ان کی کہانی میرے نام سے اور میری کہانی ان کے نام سے شائع ہوئی۔

پشکر ناتھ اور میری دوستی کا آغاز 1961 میں ہوا۔ ایک ادبی محفل میں مجھے افسانہ سنانے کے لیے کہا گیا تھا۔ اس محفل کی صدارت معروف شاعر اور براڈ کاسٹر جناب قیصر قلندر مرحوم کررہے تھے۔ میری کہانی حاضرین مجلس نے مجموعی طور پر پسند کی۔ کچھ نقطے بھی ابھارے گئے۔ محفل برخاست ہونے پر مجھے جانکاری ملی کہ پشکر ناتھ بھی حاضرین میں شامل ہیں۔ اس پہلی ملاقات میں ہی ہماری دوستی کی بنیاد پڑ گئی۔ میں اکثر اتوار کے دن ان کے گھر عالی کدل سری نگر چلا جاتا۔ ان کے ہاں زعفرانی قہوہ پینے کو ملتا تھا۔

آنجہانی پشکر ناتھ کی گھریلو زندگی کے تعلق سے ایک اور بات یاد آرہی ہے اس بات کا اظہار انھوں نے ماہنامہ 'بیسویں صدی' کے سالنامہ 1965 میں کیا تھا۔

میرا گھر میرا ماحول:

''میری گھریلو زندگی ویسی ہی ہے جیسے اکثر لوگوں کی ہوتی ہے۔ اس میں وہ سب اتار چڑھاؤ ہیں جو عام

طور پر گھریلو زندگی میں ہوتے ہیں۔ دن کا بیشتر حصہ سرکار کی نذر کر کے جب شام کو گھر لوٹتا ہوں تو اطمینان سے پاجامہ پہن کر بیٹھ جاتا ہوں۔ کرسی پر نہیں فرش پر جیسا کہ ہم کشمیریوں کا رواج ہے۔ چونکہ مکان مختصر ہے اس لیے بچے ادھم مچاتے ہیں۔ ریڈیو بجتا رہتا ہے اور اسی طرح رات کے ڈیڑھ دو بج جاتے ہیں۔ میری بیوی ایک کٹر قسم کی دھارمک خاتون ہے۔ اس عورت نے آج تک میر ا ایک بھی افسانہ نہیں پڑھا ہے۔''

پشکر ناتھ اکثر دفتری اوقات کے بعد اپنے قریبی یار دوستوں اور اپنے ہم عصر قلم کاروں سے ملنے کے لیے لالہ شیخ ریسٹورنٹ (بنڈ سری نگر) آیا کرتے تھے جہاں اس زمانے میں قریب قریب ہر شام دوستوں، شاعروں، مصوروں، صحافیوں اور افسانہ نگاروں کی محفلیں سجتی تھیں۔ ادب، آرٹ اور ثقافت پر گفتگو ہوتی۔ خیالات کا تبادلہ ہوتا۔ 'لالہ شیخ ریسٹورنٹ' کا مالک اکثر بیمار رہتا تھا۔ اس کا جوان بیٹا اسماعیل کونٹر سنبھالتا تھا وہ ہماری باتوں سے لطف اندوز ہوتا تھا اور کبھی کبھار ادھار کی چائے بھی پلاتا تھا۔ کبھی کبھی ہم دونوں پشکر ناتھ اور میں شام کے شو میں 'ریگل سنیما' انگریزی فلم دیکھنے کے لیے چلے جاتے، وقت کا لمحہ سرکتا رہا۔ اب ہم نے افسانوی میدان میں قدم جمانے شروع کر دیے تھے۔ پڑھنے والے ہمارے ناموں سے واقف ہوگئے تھے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ہم دونوں کی کہانیاں جموں وکشمیر کے سرکاری یا غیر سرکاری رسائل کے علاوہ جموں وکشمیر سے باہر شائع ہونے والے معیاری جرائد ورسائل میں بھی شائع ہوتی تھیں۔ ہمارے دوستوں کا حلقہ وسیع تر ہوتا جا رہا تھا۔ ہمارے افسانوی مجموعے بھی منظر عام پر آ چکے تھے اور سب سے بڑی بات میری اور پشکر کی دوستی قائم ودائم تھی۔

پشکر ناتھ اکونٹ جنرل کے دفتر میں کام کرتے تھے۔ پھر وہ تبدیل ہو کر سری نگر سے جموں چلے گئے۔ میں بھی سرکاری دربار موو کے ساتھ چھ ماہ کے لیے جموں جاتا تھا۔ اس سے ہماری ملاقاتوں میں کوئی زیادہ کمی نہ آئی۔ جموں میں ہم نے قلم کاروں کا ایک گروپ تشکیل دیا جس کی مجلس ہر اتوار کو ڈوگرہ آرٹ گیلری میں سجتی تھی۔

جانے کیسے ان سے میری آخری ملاقات کی کہانی میری سوچوں سے ابھر کر آئی ہے۔ یہ 31 مارچ 2005 کی بات ہے۔ میں ان سے ملنے کے لیے ان کے گھر گیا۔ پیارے ہتاش بھی میرے ساتھ تھے۔ وہ اپنے گھر کے برآمدے میں اخبار پڑھ رہے تھے۔ پیارے ہتاش کے خیر خبر جاننے کے بعد وہ میری جانب دیکھنے لگے۔ مجھے لگا کہ مجھے پہچاننے میں انھیں وقت ہو رہی ہے..... ''نہیں بتاؤں گا کہ میں کون ہوں۔'' پھر وہ کرسی سے اٹھے اور مجھے گلے لگایا۔ وہ اب مجھے پہچان چکے تھے۔ دراصل اب کی بار ہم دونوں چار سال کے بعد مل رہے تھے۔ اس دوران وہ کافی بیمار ہوئے۔ اوپن ہارٹ سرجری کے لیے وہ دہلی بھی گئے تھے۔ ان کی اہلیہ کمرے سے باہر آ گئیں۔ آنجہانی پشکر ناتھ نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''ان کو پہچانتی ہو......؟'' ہونٹوں کی ذرا سی جنبش ہوئی اور فوراً کہہ دیا ......''یہ تو نور شاہ ہے۔''

''کیا پیو گے''؟ اس نے کہا۔

''زعفرانی قہوہ......!'' اور ہم سب ماضی کی گلیوں میں گم ہوگئے۔

پروفیسر شکیل الرحمٰن مرحوم پشکر ناتھ کے افسانوں پر رائے زنی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''پشکر ناتھ کے افسانوں میں شعور واحساس کی پختگی ملتی ہے۔ انتہائی پیاری زبان نے ان کے افسانوں کو ایک نیا انداز بخشا ہے۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ پیاری زبان اور برتاؤ ایک ادیب کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ خوبصورت تخیل کے ساتھ ساتھ ان کے افسانوں میں حقیقت پسندانہ نظریہ ملتا ہے۔ وہ اپنی کہانیاں بڑی سلیقہ مندی سے قلم بند کرتے ہیں۔

ان کی کہانی 'ایک ادھار مسکراہٹ' سے ایک اقتباس:

''مسکراہٹ کی ایک ہلکی سی دھوپ، اجلی اجلی سی دھوپ مگر نہیں، مگر ایسا نہیں ہو سکتا...... یہ میری مسکراہٹ نہیں ہے۔''

اردو افسانے کے ناقدین سے آنجہانی پشکر ناتھ کو بڑی شکایت تھی ایک مضمون جو 'شاعر' ممبئی جنوری 1964 میں شائع ہوا تھا پشکر ناتھ لکھتے ہیں:-

''کشمیر کے افسانہ نگاروں نے اردو افسانے کی اوڑھنی میں کون کون سے ستارے ٹانکے یہ سب جاننا اور ان کی بچی قدروں کو متعین کرنا نقادوں کا کام تھا مگر بدقسمتی سے اردو زبان کے تمام ناقدین اس بات پر خاموش ہیں یا ہو سکتا ہے کہ مصلحتاً خاموش ہوں۔ یہ مصلحت اردو ادب میں ایک نمایاں حیثیت اختیار کرتی جا رہی ہے اور ظاہر ہے کہ اس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہو رہا ہے اور اسی طرح ایک ادبی بددیانتی عمل میں لائی جا رہی ہے مگر اس کے باوجود کشمیر میں تخلیقی عمل جاری ہے اور کارواں میں نئے ساتھی شامل ہو رہے ہیں۔''

جموں وکشمیر کے معروف قلم کار ڈاکٹر برج پریمی کہتے ہیں:

''پشکر ناتھ کے افسانوں میں کشمیر کے اندرونی علاقوں کی تصویر خوب ابھرتی ہے۔ اندرونی علاقوں کے نام، پلوں کی تصویر، یہاں کی گلیوں، کوچوں کے مشاغل کی جھلکیاں بھی جھلکتی نظر آتی ہیں۔ ان چیزوں کی جانب بہت کم افسانہ نگاروں نے توجہ دی ہے۔''

پشکر ناتھ کے افسانوں میں سادگی اور نثریات کا امتزاج ان کی غیر معمولی صلاحیت کا واضح ثبوت ہے۔ اس سے ان کے افسانے پڑھنے والوں کے ذہن ودل میں اتر جاتے ہیں۔

میں ہمیشہ پشکر کہہ کر ان سے بات کرتا تھا اور وہ ہمیشہ صرف نور کہہ کر مجھ سے مخاطب ہوتا تھا اور ہم کھل کر اپنی کہانیوں پر تبصرہ کرتے تھے لیکن ہماری باتوں، ہماری بحث مباحثہ میں ہمیشہ خلوص، شفقت، محبت اور احترام کی جھلکیاں نظر آتی تھیں۔......!

پشکر ناتھ کو کشمیر سے کس قدر محبت اور شفقت تھی اس کا اندازہ ان کے انٹرویو سے ہوگا جو انھوں نے سورگباش ہونے سے کچھ عرصہ پہلے کشمیر کے معروف اور معتبر صحافی جاوید آزر کو دیا تھا۔ ان کے ایک سوال کے جواب میں پشکر ناتھ نے کہا تھا:

''کشمیر کی تہذیب وشناخت، انسانیت فہمی، دریادلی اور مہمان نوازی کے جذبے پر جب زخم لگتے دیکھتا ہوں تو دل تڑپ اٹھتا ہے۔ لوگوں کے دکھ درد اور مصیبتوں کا حال سن کر دل رونے لگتا ہے۔ کشمیر چھوڑنے کا بہت غم ہے میں ستر کی دہائی میں نوکری کے سلسلے میں جموں چلا آیا اور یہاں مستقل سکونت اختیار کی لیکن میرا یقین ہے اگر 1990 میں سری نگر میں ہوتا تو ہرگز ہجرت نہ کرتا اب تو بس کشمیر میں رہتے ہوئے اپنی جان جان آفرین کے سپرد کرنے کی تمنا ہے۔''

اس بات سے انکار کی گنجائش نہیں کہ پشکر ناتھ کا مطالعہ کافی عمیق تھا وہ انسانی رشتوں کے درد وکرب کو اپنے افسانوں میں سمیٹ لیتے تھے۔ معاشرے کی بے حسی کا فنکارانہ انداز سے تجزیہ کرتے تھے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ پشکر ناتھ ایک پرخلوص شخصیت کے مالک تھے۔ جموں وکشمیر میں ہر دور میں اردو زبان وادب کے قلمکاروں نے اپنی کہانیوں کی وساطت سے اپنے قلم کی قوت کا مظاہرہ کیا اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ آج بھی یہاں اچھی اچھی دلچسپ اور نئے انداز و واسلوب کے ساتھ کہانیاں لکھی جا رہی ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں اس کے باوجود پشکر ناتھ کی کمی کا شدت سے احساس ہو رہا ہے۔

......پشکر ناتھ اگر آج حیات ہوتے تو......؟

■

Noor Shah
14-Lalded Colony Goripora Link Road
Rawalpora Srinagar 190005 Kashmir
Cell.:8899637012, 9906771363

متحدہ عرب امارات میں عربی فکشن کا ارتقا

صہیب عالم

متحدہ عرب امارات سات ریاستوں ابوظہبی، دبئی، شارقہ، ام القیوین، رأس الخیمہ، عجمان اور فجیرہ کا وفاق ہے، جس کا دار الحکومت ابوظہبی ہے۔ یہ جزیرہ عرب کے مشرقی ساحلی پٹی پر واقع ہے۔ امارات مدتوں یورپی جارحیت پسندوں اور برطانوی استعمار کے زیر نگیں تھا۔ البتہ بیسویں صدی کے اواخر میں اسے خودمختاری مل گئی۔ خلیج سے برطانوی دستبرداری کے اعلان کے ساتھ ہی ابوظہبی، دبئی، شارقہ، عجمان، ام القیوین اور فجیرہ کے حکمرانوں کے مابین ایک معاہدے کے تحت 2 دسمبر 1971 کو متحدہ عرب امارات کے نام سے مشہور اتحاد کا قیام عمل میں آیا۔ دستوری اعتبار سے یہ ایک وفاقی ریاست ہے، جس میں آئین امارات کے تمام شہریوں کو یکساں مواقع اور مساوی حقوق فراہم کرتا ہے۔

امارات مدتوں یورپی جارحیت پسندوں اوربرطانوی استعمار کے زیر نگیں تھا۔ البتہ بیسویں صدی کے اواخر میں اسے خودمختاری مل گئی۔ خلیج سے برطانوی دستبرداری کے اعلان کے ساتھ ہی ابوظہبی، دبئی، شارقہ، عجمان، ام القیوین اور فجیرہ کے حکمرانوں کے مابین ایک معاہدے کے تحت 2 دسمبر 1971 کو متحدہ عرب امارات کے نام سے مشہور اتحاد کا قیام عمل میں آیا۔ دستوری اعتبار سے یہ ایک وفاقی ریاست ہے، جس میں آئین امارات کے تمام شہریوں کو یکساں مواقع اور مساوی حقوق فراہم کرتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ مصر، شام، لبنان، فلسطین اور دیگر عرب ممالک کے مقابلے میں خلیج میں فکشن کے ساتھ ساتھ دوسری اصناف جیسے ڈرامہ، تھیٹر اور علمی مقالات کا سلسلہ قدرے تاخیر سے شروع ہوا۔ آزادی اور عرب قومی بیداری نے امارات کے نوجوانوں کو متاثر کیا اور انھیں اپنی ثقافت کو محفوظ کرنے پر مہمیز کیا۔ لائبریریاں قائم ہوئیں۔ فکشن، ڈرامہ، تھیٹر اور لوک گیتوں کو رواج ملا۔ متحدہ عرب امارات میں افسانہ لکھنے کا سلسلہ بیسویں صدی کی چھٹی دہائی سے شروع ہوا۔ اس کے اسباب کئی ہیں۔ سب سے اہم سبب خلیجی ممالک کے نوجوانوں کا مغربی ممالک میں تعلیم حاصل کرنا اور وہاں کی ثقافتی سرگرمیوں اور تحریکوں سے متاثر ہونا ہے، شاید یہی سبب تھا کہ وہاں سے آنے کے بعد ان نوجوانوں نے ادب اور تخلیق ادب کے ان تناظر کو برتنے کی کوشش کی، جس کا نتیجہ سامنے ہے۔

متحدہ عرب امارات کے ادیبوں کا اس بات پر تقریباً اتفاق ہے کہ سب سے پہلے جو افسانہ یہاں شائع ہوا وہ شیخہ الناخی کا افسانہ 'الرحیل' (سفر) ہے۔ اس کی اشاعت کا زمانہ 1970 مقرر کیا جاتا ہے، پھر 1971 میں حاج مظفر کا افسانہ 'ذکریات آمانی' (خواہشات کی یادیں)، 1972 میں علی عبد اللہ علی کا افسانہ 'ضحیۃ الطمع' (خواہش کا شکار)، عبد العزیز الخلیل کا افسانہ 'یومیات موظف صغیر' (چھوٹے افسر کا روزنامچہ) ہے، یہ تمام ہی افسانے متحدہ عرب امارات کے سماجی اور ثقافتی مسائل کو نمایاں کرتے ہیں۔ عبداللہ صقر احمد کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے امارات میں افسانہ لکھنے کا سلسلہ شروع کیا، ان کی بے شمار مختصر کہانیاں ہیں، جو بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں مختلف رسالوں کی زینت بنیں۔ ان میں 'بے رحم دل' جو 'النصر' اسپورٹس میگزین میں شائع ہوئی۔ اس میگزین کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے معاشرے کے جمود و تعطل کو ختم کیا۔ ان کہانیوں میں سماجی اور اخلاقی پہلوؤں کو اجاگر کیا، کہیں کہیں نقد بھی کیا۔ عبداللہ صقر آزاد شاعری کے حوالے سے بھی جانے جاتے ہیں بلکہ کچھ لوگوں کا تو یہ خیال ہے کہ اس میدان میں بھی انھیں خاصا بلند مقام حاصل ہے۔ وہ انھیں سنجیدہ اور باشعور تخلیق کاروں میں شمار کرتے ہیں۔ 1974 میں 'کھوئے ہوئے وقت میں جلاوطنی' کی اشاعت کے بعد

عرب امارات کی جدید افسانہ نگاری قدیم فنی اشکال سے نکل کر جدید تناظر میں مسائل کو پیش کرنے کی جرات کی۔اسے قدیم اسلوبیاتی، نظریاتی، لسانی ساخت کی رکاوٹوں سے خود کو آزاد کرنے کی کوشش کہا جاسکتا ہے۔ گویا عرب امارات کے افسانوں رومانیت پسندی سے نکل کر حقیقت پسندی کی راہ اختیار کی۔ اس تناظر میں بہت سی تخلیقات سامنے آئیں

ادبی حلقوں میں وہ گفتگو کا موضوع تھے۔ متحدہ عرب امارات میں افسانے کا ایک مختصر مجموعہ بعنوان 'الخشبہ' کے نام سے شائع ہوا جس میں انگریزوں کے جبر اور ان کے ظلم کو اجاگر کیا گیا تھا۔ البتہ افسانوی مجموعے کے اعتبار سے پہلی کاوش کی سعادت عبداللہ صقر کی کتاب 'الخشبہ' (لکڑی) کو حاصل ہے، جو دبئی سے 1974 میں شائع ہوئی۔ پھر تخلیقی ادب کا یہ سلسلہ چل نکلا۔ کہانیوں اور افسانے لکھنے کا رواج فروغ پاتا رہا۔ 1982 میں عبدالحمید احمد کا پہلا افسانوی مجموعہ 'السباحۃ فی عینی خلیج یتوحش' (وحشتناک خلیج کی آنکھوں میں تیرنا) ہے جس میں متحدہ عرب امارات کے تاریخی مرحلے کو موضوع بحث بنایا ہے۔ 1982 ہی میں محمد ماجد السویدی، رضا السجوانی اور محمد المر کے افسانے 'حب من نوع آخر' (محبت کی ایک اور قسم) شائع ہوا، یہ تمام ہی افسانے عرب امارات کے مختلف جرائد اور مجلّات جیسے 'الاہلی'، 'الزمالک'، 'الشباب' اور 'اخبار دبئی' میں شائع ہوئے

متحدہ عرب امارات میں ادبی اور تخلیقی روایت کو فروغ دینے میں جن شخصیات نے اہم کردار ادا کیا، ان میں سرفہرست ظبیہ خمیس، ناصر جبران، ناصر الظاہری، مظر السیف، امینہ ابوشہاب، سارہ النواف، باسمہ یونس ہیں۔ فکشن کو روایتی کہانی کے فن میں محمد المر نے متعارف کرایا، اس کے علاوہ مریم جمعہ، فرجع، سعاد العریمی اور جمعہ الفیر وغیرہ کے نام بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان افسانوں کے موضوعات میں متحدہ عرب امارات کے مقامی مسائل و معاملات شامل رہے ہیں مثلاً انسان کا سمندر سے تعلق، اس کی شخصیت، کھجور کی اہمیت، ماحولیات سے لگاؤ اور پٹرول کی دریافت کے بعد سماجی تبدیلیوں، مزدوروں کی پریشانی، مہاجرین کا مسئلہ، مہاجرین سے شادی، زبان کا مسئلہ اور اس کے علاوہ بعض دوسرے سماجی موضوعات ان میں زیادہ نمایاں ہیں۔

افسانے لکھنے کی یہ تحریک دن بہ دن یونہی بڑھتی گئی اور اس میں نئے نئے نام شامل ہوتے گئے، جنہوں نے افسانوی ادب کے اسالیب اور نئے مضامین کا اضافہ کیا، اور متحدہ عرب امارات میں افسانے کے نہج کو بدلنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ان میں نعیمہ المری، حسن الحسنی، نجیبہ الرفاعی، حسن عبد الرحیم، عائشہ الذعابی، فہد الفلاسی، عائشہ، عبد اللہ، محمد، فاطمہ عبد اللہ، دیا مہنا، محسن سلیمان، خالد الجابری، فرید الغیاث، مریم المروی، احمد امیری، فاطمہ الکعبی، صالح کرامہ، منی سالم السویدی، اسماء محمد الکتبی، اسراء المنہالی، غادہ کیلانی، علی احمد الحمیری ہیں۔ مردوں کے ساتھ ساتھ متحدہ عرب امارات کی عورتوں نے بھی اس ادبی صنف کو جلا بخشا اور اس کی آبیاری بھی کی ہے۔

بیشتر ابتدائی افسانہ نگار متحدہ عرب امارات کے روایتی اسلوب سے متاثر ہیں۔ ان میں رومانیت پسندی کا رجحان بھی واضح ہے کیونکہ ان میں آنسو، اداسی، ندامت، محبت، رفاقت، مفارقت اور وصال کا ذکر ہے اور وہ جذباتیت سے لبریز ہیں۔ لیکن بعد کے افسانے نئے مسائل، نئی روح، معاشرے میں رشتوں کی پیچیدگی اور تبدیلیوں کے خدوخال کو ظاہر کرنے لگے۔ بعض افسانوں میں متحدہ عرب امارات کے موجودہ حالات پر نقد ہے۔ پٹرول سے پیدا ہوئے مسائل، اس کے منفی اور مثبت اثرات اور معاشرے میں تنازعہ کی بھی تصویر کشی کرنے لگے اور انسان کے بنیادی مسائل اور ان کی مجبوریوں پر بھی زور دینے لگے۔

عرب امارات کی جدید افسانہ نگاری قدیم فنی اشکال سے نکل کر جدید تناظر میں مسائل کو پیش کرنے کی جرأت کی۔ اسے قدیم اسلوبیاتی، نظریاتی، لسانی ساخت کی رکاوٹوں سے خود کو آزاد کرنے کی کوشش کہا جاسکتا ہے۔

گویا عرب امارات کے افسانوں رومانیت پسندی سے نکل کر حقیقت پسندی کی راہ اختیار کی۔ اس تناظر میں بہت سی تخلیقات سامنے آئیں۔ جیسے محمد الحربی کا افسانوی مجموعہ 'الخروج علی وشم القبیلۃ' (قبیلہ کے اثر سے باہر نکلنا)، عبد الحمید احمد کا افسانوی مجموعہ 'السباحۃ فی عینی خلیج یتوحش'، عبد الرضا السجوانی کا مجموعہ 'ذلک الزمان' (وہ زمانہ) اور 'زلۃ العذری' (دوشیزہ کی لغزش) محمد المر کے متعدد مجموعے جن میں 'حب من نوع آخر'، 'الفرصۃ الاخیرۃ' (آخری موقعہ) اور الصداقۃ (دوستی)، لیلیٰ احمد کا مجموعہ 'الفرصۃ'، (موقعہ) المہرجان (میلہ)، الوطن (وطن) وغیرہ۔

متحدہ عرب امارات کا پہلا ناول راشد عبداللہ النعیمی کا 'شاہندہ' ہے جو 1971 میں شائع ہوا۔ اس ناول میں متحدہ عرب امارات کے قدیمی سماجی اور ثقافتی پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ علی ابو الریش کا ناول 'الاعتراف' (اعتراف) ہے جو 1982 میں شائع ہوا۔ یہ ناول رأس الخیمہ کے ایک نوجوان کے ارد گرد گھومتا ہے جو اپنے دوست کی بہن پر عاشق ہو گیا تھا۔ جو اس سے بدلہ لینے کے لیے اس کے باپ کے قاتل کی تلاش میں رہتا ہے۔ بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ یہی نوجوان اس کے باپ کا قاتل ہے۔ جس کا اعتراف اس نے بستر مرگ پر کیا۔ اسے متحدہ عرب امارات کے بہترین ناولوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ میسون صقر القاسمی کا ناول 'ریحانۃ' ہے جو 2003 میں شائع ہوا۔ یہ ناول خلیجی ممالک میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا مظہر ہے۔ خلیجی ممالک میں تیل کی دریافت کے بعد کی زندگی، اس کے اثرات نیز سماجی مسائل کو واضح کرتا ہے۔ ناول کم عمر لڑکیوں سے بڑوں کی شادی کے رواج اور دیگر نسوانی مسائل اور استحصال کا احاطہ کرتا ہے۔ فاطمہ الحمادی کا ناول 'روایۃ بین طرقات باریس' (پیرس کی گلیوں میں) ہے جو 2009 میں شائع ہوا۔ اس ناول میں روزمرہ کے مسائل اور مشرق اور مغرب کے تصادم کو پیش کیا گیا ہے۔ اماراتی مصنف ثانوی

السویدی کا پہلا ناول ڈیزل ایک عیسی جیسی جینی اور تفریحی شخص کے بارے میں ایک غیر حقیقی کہانی ہے۔ متحدہ عرب امارات میں کتاب کی اشاعت میں دشواری کی وجہ سے یہ ناول بیروت سے شائع ہوا۔ ڈیزل کو اماراتی ناقدین کے ذریعے وسیع پیمانے پر نقد کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن 2012 میں انگریزی میں ترجمہ ہونے کے بعد اس نے ادبی دنیا میں ایک گونج پیدا کردی۔ یہ ایک دل چسپ ناول ہے جس میں راوی عربی لوک داستانوں پر گفتگو کرتا ہے اور ایک تکلیف دہ بچپن، اماراتی معاشرے کا متغیر چہرہ، تفریح کا جادو اور روایت کا مقابلہ جدیدیت کے موضوع پر ہے۔ ہدی سرور کا ناول روایۃ الیاہ ہے جو 2013 میں شائع ہوا۔ یہ ناول قاری کے اندر ایک نئی سوچ اور جدت کی تخلیق کو مہمیز کرتا ہے۔ یہ متحدہ عرب امارات کی قدیم اور جدید سماجی کشمکش اور رسم ورواج پر روشنی ڈالتا ہے۔ اور تیل کی دریافت کے بعد زندگیوں پہ جو اثر پڑا اس کو اجاگر کرتا ہے۔ علی ابوالریش کا ناول ''امرأۃ استثنائیۃ'' (غیر معمولی خاتون) ہے جو 2013 میں شائع ہوا۔ یہ ناول مرد اور عورت کے درمیان عدم مساوات کے مسائل اور معاشرے میں عورتوں کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔ اسی طرح مانع سعید العتیبہ کا ناول 'کریمۃ'، باسمہ یونس کا ناول 'لعلہ انت' (شاید آپ)، نورہ النومان کا ناول 'اجوان' اور سلطان العمیمی کا ناول 'غرفۃ واحدۃ لا تکفی' (ایک کمرہ کافی نہیں ہے) وغیرہ ہے۔

ان ناولوں اور افسانوں میں متحدہ عرب امارات کے مقامی ماحول، اس کے تباہ ہونے کے خدشات، روز مرہ کے مسائل اور ان میں تبدیلیاں ہونے کا بیانیہ ہے۔ سماجی اور معاشرتی تبدیلیوں اور ان کے متعلق اماراتی شخص کا نظریہ اور افراد پر ان کے مختلف اثرات، آبادیاتی ڈھانچہ اور اس کے درد اور عدم توازن اور کچھ لوگوں کے لیے بیگانگی کے احساسات، غیر ملکی مزدور اور اس کے مسائل، منفی سماجی مظاہر جیسے غیر ملکی عورتوں سے شادی، غیر ملکی خادمات، نوکر، ہائبرڈ زبان جو ملک میں وجود پذیر ہوئی اس کا اظہار، طلاق، ازدواجی زندگی سے بیزاری، اخلاقی بحران جو وہاں کے لوگوں کو متاثر کر رہا ہے اس کا اظہار، پرانی قدروں کے ٹوٹنے کا نوحہ، نئی دنیا سے پیدا ہونے والا خوف اور اضطراب بھی ملتا ہے۔ کچھ کہانیاں ایسی بھی ہیں جسے ایشیائی مزدوروں اور عرب تارکین وطن کے ساتھ ہمدردی اور ان کی روحانی تکلیف، آرزو اور پرانی یادوں کی عکاسی بھی کرتی ہے۔

شاید تیل کی دریافت اور زندگی کے مختلف شعبوں میں معاشی عروج کے مسائل کو حل کرنے پر ان چیزوں نے ناقدین کو امارات میں مختصر کہانی میں اس رجحان کی موجودگی اور اس میں ایک سماجی رجحان کے طور پر مطالعہ کرنے کے لیے کتابیں تالیف کرنے پر مجبور کیا۔

خواتین کی کہانیوں میں عمومی سماجی اور انسانی فکر کے علاوہ، خواتین کے تحفظات، مایوسی، پرانی سماجی مجبوریوں کے ساتھ جدوجہد اور کشمکش، رسوم، روایت، خواتین پر ظلم، کم عمری کی شادی، ان سے بڑی عمر کی لڑکیوں کی شادی، شوہر یا بھائی کا تسلط وغیرہ کی عکاسی ملتی ہے۔ خواتین کے بیانیے کا متن زیادہ تر سماجی مسائل اور خواتین سے متعلق دوسرے مسائل کو اجاگر کرتا ہے۔ جدید زندگی نے اپنے مسائل کو اسی حد تک پیدا کیا جس حد تک اس نے جدیدیت اور شہری کاری کو پیدا کیا ہے۔ ان کی تخلیقات پر جدیدیت کا بھی کافی اثر ملتا ہے خاص طور سے فاطمہ المز روعی، ابتسام المعلا، مریم السعدی، راودا البلوشی، لیلی سالم، اسماء الکتبی، فاطمہ عبداللہ اور ان جیسے دوسرے تخلیق کاروں کی کہانیوں میں بھی نظر آتا ہے۔ یہ کہانیاں خواتین کی زندگیوں اور ان کی اذیت زدہ روحوں کو دلیری سے بیان کرتی ہیں۔ ان کی کہانیوں میں نئے تجربات بھی کیے جا رہے ہیں۔ اس زمانے کی کہانیاں پچھلی دہائیوں کی کہانیوں سے کافی حد تک مختلف ہیں، جن میں نئے تجربات، اکثریت کے خیالات کو اقلیت پر مسلط کرنا اور غیر ملکی زبانوں کا عربی زبان میں درآنا وغیرہ ہیں۔

اس عمل میں مشرقی اور مغربی ثقافتی روابط، یہاں کے باشندوں کا مغربی ممالک میں تعلیم کا حصول اور ان کے اندر نئے تخلیقی شعور کی تحریک شامل ہے۔ ان فکشن نگاروں نے اپنے تجربات کو امارات کے تہذیبی بیانیے کے طور پر پیش کیا ہے اور ان افسانوں اور ناولوں میں دوسری خلیجی جنگ کے نتیجے میں فکشن میں اقدار کی کمزوری، شناخت اور کچھ ان تلخ حقیقتوں کی عکاسی ملتی ہے جس نے اماراتی معاشرے کو نہ صرف متاثر کیا بلکہ اس کے تلخ تجربے سے امارات کا معاشرہ گزر رہا تھا۔ اس پس منظر میں بے شمار سوالات کا جمع ہونا یقینی تھا، جس نے بے شمار نوجوانوں کو متاثر کیا اور یہ نوجوان انھیں جوابات کے متلاشی تھے۔ مختصر طور سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ متحدہ عرب امارات میں فکشن کی نشو ونما کئی مراحل سے گذر کر یہاں تک پہنچی۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ سماجی ومعاشرتی ڈھانچہ نہ صرف مربوط ہے بلکہ ان ناولوں میں سماجی تغیرات اور ترقیات کی نمایاں جھلک ہے۔ متحدہ عرب امارات کے افسانوی ادب کو بنیادی طور سے چار مرحلوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

پہلا مرحلہ: بیسویں صدی کی چھٹی دہائی کے آخر اور ساتویں دہائی کی ابتدا میں جو افسانے سامنے آئے اور ان میں سرفہرست عبداللہ صقر کے افسانے ہیں۔

دوسرا مرحلہ 1972-75 کے درمیان کا ہے۔ اس مرحلے میں بعض اہم نمایاں تخلیقات سامنے آئیں جن میں مظفر الحاج علی عبید محمد المری، عبدالعزیز الخلیل، عبدالحمید احمد کی تخلیقات ہیں۔

تیسرا مرحلہ جو 1975-79 کے مابین کا ہے۔ اس مرحلے میں کافی ثقافتی تبدیلیوں کا ظہور ہوا۔ اس عہد میں بہت ہی کم تخلیقات سامنے آئیں، ان میں سب سے اہم تخلیق علی الشرہان اور ثانی السویدی کی ہیں۔

چوتھا مرحلہ جو 1979 سے عصر حاضر تک ہے۔ اس مرحلے میں افسانوی تخلیق نے سابقہ روایتوں کے علی الرغم نئی اسلوبیاتی روایت میں موضوع کو پیش کیا، جس میں دنیا کی نئی تبدیلیوں، معاشرتی تصادم، پٹرول سے ہونے والے سماجی بدلاؤ، عرب میں مہاجرین اور عرب کے ثقافتی ٹکراؤ، زبان کا مسئلہ وغیرہ شامل ہے۔ اس مرحلے میں تمام طرح کی ادبی، ثقافتی اور سماجی تبدیلیوں کا تذکرہ ملتا ہے۔

عرب دنیا کا سب سے پروقار ادبی ایوارڈ جسے بوکر انعام کے طرز پر قائم کیا گیا وہ ''الجائزۃ العالمیۃ للروایۃ العربیۃ'' (عربی ناول کا عالمی ایوارڈ) ہے۔ جو متحدہ عرب امارات کے دارالسلطنت ابوظہبی میں قائم کیا گیا۔ اس کے اہداف اور مقاصد میں عربی کے تخلیقی ادب کی پذیرائی، اعلی ادبی ذوق کا فروغ، دیگر زبانوں کے افسانوی ادب کا ترجمہ اور باہمی ثقافت کا تبادلہ شامل ہے۔ 2009 میں قائم اس ایوارڈ سے اب تک کئی ممالک کے افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں کو نوازا جا چکا ہے۔

مراجع ومصادر

1 عبدالحمید احمد، توصیات عامۃ حول القصۃ والروایۃ فی دولۃ الامارات العربیۃ المتحدۃ۔
2 ضیاء الصدیقی، القصۃ الاماراتیۃ القصیرۃ: الواقعیۃ الحریۃ انموذجا۔
3 عثمان حسن، الروایۃ الاماراتیۃ — حضور دائم لقضایا المجتمع، الخلیج۔
4 حسن محمد، الروایۃ الاماراتیۃ — قفزات نوعیۃ وغزارۃ فی الانتاج، العین۔
5 طرفۃ ہانی، روایا اماراتیۃ۔

Dr. Suhaib Alam
Asst Prof. Dept of Arabic
Jamia Millia Islamia
New Delhi - 110025
Mob.: 9811159071

عبدالرحمن شافی

ثنا احمد صبر

ابوالبقا صبر صاحب کے حوالے سے پہلے کچھ زیادہ معلوم نہیں تھا، صرف نام سنا تھا مگر ایک دن ایک صاحب (ماسٹر موسی) نے ان کے دیوان کے آخری 25 صفحات دکھائے تو پڑھ کر یہ اندازہ ہوا کہ صبر صاحب تو بہت پایہ کے شاعر تھے۔ پھر ان کو جاننے کا مزید اشتیاق ہوا، اور ساتھ ہی یہ مایوسی ہوئی کہ سہارنپو رمیں ان کو جاننے والے اکثر دنیا سے جا چکے تھے اور جو موجود تھے وہ بہت کم ان کے متعلق معلومات رکھتے تھے۔ جب ان کے حوالے سے مختلف حضرات سے بات کی تو اکثر نفی میں جواب آیا، کیونکہ "جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں۔" بہر حال تلاش و جستجو کے بعد کچھ مواد ہاتھ آیا تو مگر وہ بھی تشنہ تھا کیونکہ اب ان کی یاد گار کے طور پر جو بھی ہمارے پاس ہے وہ صرف ان کا دیوان ہے،جو کتابی شکل میں اب شاید کسی کے پاس موجو د نہیں اور اگر ہے بھی تو وہاں تک ہماری رسائی نہیں، لہٰذا جو کچھ مواد مل سکا پیش نظر مضمون اسی کی روشنی میں تیار کیا گیا ہے۔

اصل نام منشی ثنا احمد صبر عصر (دو تخلص کرتے تھے) تھا۔ آپ کی پیدائش 10 مئی 1886 کو اتر پردیش کے ضلع سہارنپور میں ہوئی تھی۔ ابتدائی تعلیم محلے کے مکتب میں ہوئی۔ 1904 کو انبیٹھہ ضلع سہارنپور کے انجینئرنگ کالج میں داخلہ لیا۔ دو سالہ کورس مکمل کرنے کے بعد تلاش ملازمت میں مصروف ہوگئے۔ تلاش وجستجو کے بعد کنیال آفس سہارنپور میں 15 روپے ماہ وار پر ملازم ہوئے۔ مگر طبیعت میں کچھ لاابالی پن اور تنخواہ کم ہونے کی وجہ سے یہ سلسلہ زیادہ دن نہیں چل سکا،اور ملازمت سے سبکدوشی اختیار کی۔ صبر صاحب کوشاعری سے شغف تو بچپن ہی سے تھا،تعلیم کے دوران جب عمر 13 یا 14 سال تھی شعر موزوں کرنے لگے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ شوق ممتاز شاعر کلام صاحب بی اے علیگ (جو کہ سہارنپور کے مشہور اساتذہ میں گنے جاتے تھے) سے تعلق کا سبب بنا۔

متقدمین شعرا کی روایت رہی ہے کہ وہ اپنے کلام کا آغاز اللہ اور اس کے رسولؐ کی حمد وثنا سے کرتے تھے۔ صبر صاحب نے بھی اس روایت سے انحراف نہیں کیا اور دیوان صبر کی ابتدا حمد ونعت سے اس طور پر کی کہ۔

ہر دم ہے تیرا آسرا اے ربِّ دوعالم
ہر وقت بھروسہ ہے مجھے تیری مدد کا
اے قادر و قیوم فقط تو ہی رہے گا
میں کیا،نہ پتا ہوگا کہیں مری لحد کا

جس بشر کو مشغلہ صل علی کا ہوگیا
دل سے وہ شیدا محمد مصطفیٰؐ کا ہوگیا
مل گئی جس بے نوا کو آپ کے کوچے میں جا
مرتبہ شاہوں سے زیادہ اس گدا کا ہوگیا

ان کی شاعری تغزل میں ڈوبی ہوئی ہے۔ وہ زمانے کی پرواہ کیے بغیر عروس غزل کی زلفیں سنوارنے میں سرتاپا محو نظر آتے ہیں۔ ان کی زندگی پر غم ہستی اور غم جاناں ہی عکس ریز نظر آتا ہے۔ تمام اشعار مستی ومحبت کے جذبات اور حسن کی رعنائیوں سے مزین ہیں۔ وہ غزل کی تمام تر کیفیات اپنے دامن شاعری میں سمیٹے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ سہارنپور کی ایسی مایہ ناز شخصیتوں میں شامل ہیں جن کو کبھی بھلایا نہیں جاسکتا۔ جب بھی مغربی اترپردیش میں شعرگوئی کی تاریخ کو رقم کیا جائے گا تو صبر صاحب کے بغیر یہ باب کبھی مکمل نہیں ہوسکتا۔ میر وغالب کے آتشیں سیال کو انھوں نے ایسا لفظوں میں سمویا ہے کہ باوجود ان کے انتقال کو اتنا وقت گذرنے کے اس کی لذت میں کمی نہیں آتی اور اس کی وجہ ہے وہ وصف جوان کو منجانب اللہ عطا کیا گیا تھا۔ مگر ایک باکمال شاعر کے لیے وہ لمحہ سب سے زیادہ کرب کا ہوتا ہے جب اس کو نظر انداز کیا جائے، جب کہ اس کا کلام فن کے تمام محاسن پر محیط ہو اور وہ اپنے کلام میں تمام شعری لوازمات کا التزام بھی کرے، پھر بھی اس کے حصے میں صرف گمنامی اور افلاس ہی آئے اور اس کو جیتے جی اس رنج وغم سے رہائی بھی نہ مل سکے۔ الا یہ کہ اس کے لیے یہ دنیا صرف ایک قید خانہ بن کر رہ جائے۔

صبر جیتے جی رہائی رنج وغم سے کب ہوئی
میں نے دنیائے دنی کا نام زنداں رکھ دیا

مرحوم نصرت ظہیر نے صبر صاحب پر ایک مضمون لکھا جو کہ ''منشی ثنا احمد صبرؔ کے نام سے تھا، چونکہ انہوں نے منشی جی کا زمانہ پایا تھا۔ اپنی آنکھوں دیکھا حال کچھ اس طرح بیان کیا ہے ''منشی ثنا احمد صاحب کو چوتھائی صدی پہلے ایک ٹوٹے پھوٹے مکان میں دیکھا تھا، عمر چھتر کو پار کر چکی تھی، بصارت اور سماعت نے جواب دے دیا تھا،کوئی پرسان حال نہ تھا، نہ کوئی آمدنی تھی نہ ذریعہ معاش، جسمانی اور روحانی تکلیفوں میں مبتلا تھے، مگر مفلسی اور حالات کی چکی میں پستے ہوئے بھی مشق سخن جاری تھی، کوئی بھولا بھٹکا ملنے آجاتا تو اسے اپنا حال بعد میں سناتے تازہ شعر پہلے سناتے تھے۔ آگے چل کر لکھتے ہیں: ''منشی ثنا احمد، جن کے لیے شاعری ہی اوڑھنا بچھونا تھی، شاعری وہ اس طرح کرتے تھے جس طرح کوئی صوفی عبادت کرتا ہے، ان کا دین وایمان فقط شاعری تھی، دنیا کی تمام باتوں سے بے پرواہ، نہ انھیں کھانے پینے کی فکر رہتی نہ پہننے کی، جو مل گیا کھا لیا، جو میسر آیا پہن لیا نہیں تو صبر کرکے گذار دی، کبھی حرف شکایت زبان پر نہیں لائے، یوں ہی دنیا سے چلے گئے۔'' (تحت اللفظ)

ایک مرتبہ دہرادون مشاعرے میں صبر صاحب غزل سنا رہے تھے ہندوستان کے مشہور شعرا کے علاوہ جگر مرادآبادی بھی تشریف فرما تھے،صبر صاحب غزل رقتاً میں پڑھ رہے تھے، جگر صاحب بڑی حیرانی سے صبر صاحب کی غزل سماعت فرمارہے تھے، آخرکار غزل تمام ہوئی صبر صاحب ڈائس سے نیچے تشریف لائے، جگر صاحب نے فرمایا حضرت آپ کے دل ودماغ کا تو خدا ہی حافظ ہے۔ (دیوان صبر)

منشی ثنا احمد کا مجموعہ کلام جو کہ 'دیوان صبر' کے نام سے شائع ہوا، اور جس کا تاریخی نام 'بہار بے نظیر 1380 ھ' ہے۔ برقی پریس دلی سے 1961 میں شائع ہوا۔ منشی جی نے یہ مجموعہ بڑی کاوشوں سے اور بعض لوگوں کے مطابق اپنی تمام جمع پونجی بیچ کر طبع کرایا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ دیوان کے طبع ہوتے ہی ادبی دنیا میں ان کی دھوم مچ جائے گی اور دیوان کو ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا، مگر افسوس ایسا نہیں ہوا۔ دیوان صبر کی ہزاروں جلدیں بوریوں میں بند پڑی رہیں اور اس کے وہ صفحات جن پر منشی جی کا تمام فن تقریباً چھ سو غزلوں کی صورت میں بکھرا ہوا تھا چوہوں کی خوراک بن گیا۔ ان کو دنیا کے اس رویے پر کیسے قرار آسکتا تھا جب کہ زندگی قدم قدم پر اس طرح امتحان لے رہی تھی۔ صبر ہی کیا غالب

جیسا بڑا شاعر بھی اپنی محرومیِ قسمت پر نالاں ہے۔

کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجیے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں، سو وہ بھی نہ ہوا

صبر صاحب نے محرومیِ قسمت کی شکایت تو نہیں کی مگر تواتر کے ساتھ آنے والے آلام کو کیسے ضبط کیا جائے؟ اس کا شکوہ ضرور کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

کیا ہو سکوں کہاں ہو، دل شادماں ہمارا
ہر دم ہو امتحاں پر جب امتحاں ہمارا

غالب نے کہا تھا۔

جانفزا ہے بادہ، جس کے ہاتھ میں جام آ گیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئی

صبر صاحب نے اپنے انداز میں اسی خیال کو نظم کیا ہے اور بڑی لطافت سموئی ہے، شعر روانی و سلاست اور شستگی سے مزین نظر آتا ہے، ملاحظہ فرمائیں۔

رگِ جاں سے میری یہ تار ملا دے ساقی
ٹوٹنے پائے نہ تارِ نفسِ جامِ شراب

صبر صاحب علمِ نجوم کے بھی ماہر نظر آتے ہیں، اس کا پتہ ان کے اشعار سے لگتا ہے۔ بے نقاب چہرے پر گھونگھٹ کی اوٹ ڈھلکنے لگی ہے، صبر صاحب اسے ہلال کہتے کہتے ماہِ کامل سے تشبیہ دینے لگتے ہیں۔

رتبہ بُرجِ ثور کا گھونگھٹ کو حاصل ہو گیا
بڑھتے بڑھتے یہ ہلال اب ماہِ کامل ہو گیا

گھونگھٹ کو برجِ ثور کہہ کر وہ حسن و لطافت پیدا کی ہے کہ لاجواب ہے، کیونکہ جب قمر برجِ ثور میں آجاتا ہے تو اسے شرف ہوتا ہے۔ ایک اور شعر ملاحظہ فرمائیں۔

نقطے لیلیٰ بن گئے مضمونِ مجنوں جب لکھا
دائرہ جس حرف کا کھینچا وہ محمل ہو گیا

مشکل اور سنگلاخ بحروں میں رواں دواں شعر کہتے چلے جاتے ہیں۔

خانۂ دل میں تو جس کے جلوہ فرما ہو گیا
اس کی چشمِ دل ہوئی روشن وہ بینا ہو گیا
ہوش اڑائے طور پر برقِ تجلی نے تیری
ذرہ ذرہ وادیِ ایمن کا موسیٰ ہو گیا

صبر صاحب نے شعرائے ماضی کی تقلید کی، وہی طرزِ ادا وہی اختراع و ایجاد اور ویسی ہی سنگلاخ زمینیں و بحریں آپ کے یہاں نظر آتی ہیں۔ شوخی اور اشارے کنائے، تشبیہات و استعارات اور صنائع بدائع کے علاوہ کلام میں عارفانہ رنگ کی جھلکیاں بھی موجود ہیں۔ شعور و احساسات پر غالب کی جدت پسند طبیعت اثر انداز نظر آتی ہے۔ آپ کا رنگ کسی ایک شاعر کا رنگ نہیں ہے، کہیں کہیں میر کے سوز و گداز کی چاشنی بھی شعر کو پر لطف اور درد انگیز بنائے ہوئے ہے۔

صبر صاحب کو بہت سی صنعتوں میں ید طولیٰ حاصل ہے، خاص طور پر غیر منقوط، فوق النقاط، تحت النقاط، واسع الشفتین و واصل الشفتین، مُفرد الحرفین اور رقطا و خیفا میں بھی مہارت تامہ حاصل ہے۔ استخراج قافیہ جدید اور ذولسانین میں توفی البدیہہ شعر کہتے چلے جاتے ہیں۔ مختصر جائزہ پیش نظر ہیں۔

صنعت غیر منقوط یا عاطلہ۔ وہ صنعت ہے جس کے کسی حرف پر نقطہ نہ ہو مثال ملاحظہ فرمائیں۔

مورد آلام کل عالم ہمارا دل ہوا
ہر الم ہر درد لا محدود کا حامل ہوا
ڈر رہا اللہ کا اعمال کا کردار کا
وسوسہ ہر دم رہا دل میں مآلِ کار کا

واسع الشفتین۔ اس صنعت کو کہتے ہیں جس میں شعر کو پڑھتے وقت ہونٹ سے ہونٹ نہ ملیں۔

عشق سی شے اور کرے حاصل یہ انساں خاک کا
دیکھیے کیا تھا جگر اس کے دلِ صد چاک کا

واصل الشفتین۔ اس صنعت کو کہتے ہیں جس کے پڑھنے میں ہونٹ سے ہونٹ ملتے ہیں۔

ہم نے پردوں میں چھپا مسکن دلبر پایا
چشمِ پرآب میں بھی، مردمِ بیتاب میں بھی

فوق النقاط۔ جس کے کسی لفظ میں نقطہ زیریں نہ آئے۔

دل ہمارا ہر طرح عاشق ہوا دلدار کا
ناز کا انداز کا رفتار کا گفتار کا

تحت النقاط۔ جس کے کسی لفظ میں اوپر نقطہ نہ آئے۔

جلوہ کب ہوگا میسر یار کے دیدار کا
عمر بھر سویا ہے طالع دیدۂ بیدار کا

مُفرد الحرفین۔ وہ صنعت جس کا ہر حرف الگ الگ لکھا جاتا ہے۔

آرزوئے روح اے دلدار آ
روک درد و آہ و زاری اب ذرا

صنعت موصل۔ اس صنعت کا نام ہے جس میں ہر لفظ ملے ہوئے حرفوں میں لکھا جائے کوئی حرف اکیلا نہ ہو۔

تختۂ مشقِ جفا کب نہ بنایا ہم کو
فلکِ پیر نے ہر لحظہ مٹایا ہم کو

ذولسان۔ اس صنعت کا نام ہے جس کو اردو کے علاوہ دوسری زبانوں میں بھی سمجھا جائے۔

قیامت اے نگاہ یار کردی
کہ ہر ہستی جگر افگار کر دی
(اگرچہ یہ شعر اردو کا ہے مگر فارسی کا شبہ ہوتا ہے)

رقطا۔ اس صنعت کا نام ہے جس کا ایک حرف بے نقطہ اور دوسرا حرف نقطہ دار ہو۔

مجھ پر بہت گذر چکے ان کے ستم ندیم
اب میری ایک جان مجھے ہی عذاب ہے

استخراج قافیہ، جدید از اندرون قافیہ۔ اس صنعت کا نام ہے، جس میں قافیہ میں سے قافیہ نو پیدا ہوتا ہے اور اس کے معنی بدل جاتے ہیں۔

مجھ سخت جاں کو دیکھ کے حیران رہ گیا
قاتل کو میرے ہو گیا دشوار، وار وار
محشر میں پھر ملے گی یہی زندگی مجھے
کیوں کر اٹھاؤں گا یہ گراں بار، بار بار

صنعت ذوقافیہ۔ جس میں پے در پے دو قافیے آئیں۔

موسیٰ کی طرح کاش پہنچ جاؤں طور پر
آؤں گا میں نہ اس کا نظارہ کیے بغیر

ان صنعتوں کے علاوہ اور بھی بہت سی صنعتیں صبر صاحب کے دیوان میں موجود ہیں، مزید جاننے کے لیے ''دیوان صبر' کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے اختصار کی وجہ سے یہاں سبھی کو درج نہیں کیا گیا ہے۔

صبر صاحب نے دیکھیے کس خوبی سے اپنی کسم پرسی کو بیان کیا ہے۔

تعمیر جسم اپنی پرانی جو ہو گئی
بیٹھے سے جاتے ہیں در و دیوار آپ آپ

اس شعر میں زندگی کے آخری ایام یعنی عہد پیری کا خاکہ کس امداد طلب انداز میں پیش کر رہے ہیں، لیکن ''کوئی کسی کا درد نہ جانے جب تک دل پہ چوٹ نہ کھائے ''زندگی کسی بھی فنکار کو اس کے فن کی قیمت نہیں دیتی قدر نہیں کرتی اور مشکل سے بھی یہ مشکل حل نہیں ہوتی۔ ہاں مگر جب فنکار ہم سے چھوٹ کر ہمیشہ کے لیے داغِ مفارقت دے جائے تب اس کا ایک دھندلا سا خاکہ ہماری یادوں میں رہ جاتا ہے اور وہ کوئی نقش کالحجر نہیں بلکہ ریت پر بنی ایک لکیر کی مانند ہوتا ہے جسے ہر موج آ آ کر مٹاتی رہتی ہے۔ خدا جنت نصیب کرے مرحوم ابن انشا کو کہ انھوں نے اپنے مضامین میں سرسری طور پر ہی سہی صبر صاحب کا حوالہ اس طور پر دیا ہے کہ ''سہارنپور کی دو چیزیں بڑی مشہور ہیں ایک یہاں کے آم، دوسرے صبر صاحب کا دیوان۔'' اس طرح شعر و ادب کے افق پر طلوع ہونے والا یہ ستارہ ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا اور یادگار کے طور پر ہمارے پاس اپنا مجموعہ کلام چھوڑ گیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے حیرانی ہے کہ دنیائے شعر و ادب نے ایسے شاعر کو اب تک نظر انداز کر کے کیا حاصل کیا؟۔ منشی جی، شاہ نصیر، ذوق، اور داغ دہلوی کے سلسلے کے شاعر تھے۔

■

Abdur Rehman Shafi
D-320, Dawat Nagar, Abul Fazal Enclave
Jamia Nagar, Okhla
New Delhi - 110025
Mob.:7017903577

تبصرہ و تعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ہی کی ایک شکل ہے جس میں کتاب کے مواد، اسلوب اور معیار کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ کتاب کے مالہ وما علیہ اور دیگر جزئیات کے حوالے سے قارئین کو بہت قیمتی معلومات عطا کی جاتی ہیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت رہی ہے، خاص طور پر قدیم مجلّات نے مطبوعات جدیدہ کے تعارف کا جو سلسلہ قائم کیا تھا وہ بہت ہی مفید تھا۔ تبصرہ بہت ذمے داری کا کام ہے اس لیے مبصرین کو چاہیے کہ وہ کتابوں کے انتخاب میں بھی اپنے اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیں اور تبصرہ کرتے وقت غیر ضروری تمہید، افراط وتفریط، بے معنی تحسین اور بے جا تنقید سے گریز کر کے کتاب کے اہم اور افادی نکات کی نشاندہی کریں۔ اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی یا دیگر زبانوں میں اردو زبان وادب سے متعلق جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر بھی آپ تبصرے بھیجیں تو بہتر ہوگا۔

دیوان داراشکوہ

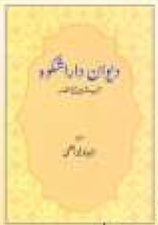

مترجم: شاہد نوخیز اعظمی

صفحات: 208، قیمت: 125 روپے، سنہ اشاعت: 2021

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: ساجدہ خاتون، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

'دیوان داراشکوہ' فارسی شاعری پر مشتمل ہے، جس میں رباعی اور غزلیں ہیں۔ اس دیوان کو شاہد نوخیز اعظمی نے فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔

داراشکوہ ایک ہمہ گیر شخصیت کا مالک اور مغل شہنشاہ شاہ جہاں کا بڑا بیٹا تھا۔ داراشکوہ نے ادبیات، عربی وفارسی، تفسیر، فلسفہ اور علوم وفنون کی تعلیم حاصل کی۔ شاعر، خطاطی، نقاش اور صوفی کی حیثیت سے بلند مقام حاصل کیا۔ داراشکوہ فطرتاً صوفی منش تھا اور شاعری کا ذوق رکھتا تھا۔ ملا شاہ قادری کی صحبت نے اس کے دل ودماغ کو متاثر کیا، جس کے نتیجے میں تصوف وفلسفہ سے ایک خاص رغبت ہوگئی اور اس کے بعد اکثر اوقات فلسفیانہ کتابوں کے مطالعہ میں گزرنے لگا جن میں اسلامی تصوف اور ویدانت کے مختلف مسائل پر بحث ہوتی۔

داراشکوہ کو فنون لطیفہ سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ مصوری کے ساتھ اس کی تکنیک پر بھی اس کی گہری نظر تھی۔ اس نے خوش نویسی کے بہترین نمونے اور مغل شہزادوں اور شہزادیوں کی تصاویر کا ایک نادر مرقع تیار کیا تھا۔

داراشکوہ مشترکہ تہذیب کا علمبردار تھا۔ اس نے ہندو علما کی سرپرستی بھی کی اور تمام دینی کتابوں کا صدق دل سے مطالعہ کیا۔ اگر ہم دیکھیں تو داراشکوہ ایک ممتاز اور منفرد شخصیت کا مالک تھا۔ وہ شاعر اور کئی کتابوں کا مصنف تھا جن میں مجمع البحرین، حسنات العارفین، رسالہ حق نما، سفینۃ الاولیا، سکینۃ الاولیا وغیرہ شامل ہیں۔

رسالہ حق نما میں تصوف کے دقیق مسائل سے بحث کی ہے۔ یہ رسالہ چھ فصلوں پر منقسم ہے یہ رسالہ دیگر کتابوں سے موضوع کے اعتبار سے مختلف ہے۔ سفینۃ الاولیا میں علما اور مشائخ کے احوال وفضائل درج ہیں یہ کتاب بہت مشہور ہے۔

مذکورہ کتاب 'دیوان داراشکوہ' اس کی اہم ترین تصنیف ہے۔ یہ دیوان غزلیات اور رباعیات پر مشتمل ہے فارسی میں 'اکسیر اعظم' یا دیوان قادری کے نام سے موسوم ہے۔ کتاب کی ابتدا میں قومی کونسل کے ڈائریکٹر شیخ عقیل احمد کا پیش لفظ شامل ہے۔ اس کے بعد شاہد نوخیز اعظمی کا مقدمہ ہے جس میں داراشکوہ کی شخصیت اور شاعری پر تفصیلی گفتگو ہے۔ یہ دیوان دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ غزلیات مع اردو ترجمہ اور دوسرا رباعیات مع اردو ترجمہ ہے۔

داراشکوہ کا تمام کلام صوفیانہ رنگ میں ہے۔ دیوان کی زیادہ تر غزلیں عمر کے ابتدائی حصے کی تخلیق کردہ ہیں، جو وحدت الوجود نظریہ کی عکاسی کرتی ہیں۔ دیوان کی پہلی غزل سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے نزدیک ایک ہی وحدت ہے جو کائنات میں جاری و ساری ہے۔ شعر ملاحظہ ہوں۔

ہمہ موجود در وجود ما   گنج مخفی است این نمود ما
گرچہ در پردہ داشتیم آواز   شد زنی ظاہر این سرود ما
ما ندیدیم ہیچ غیر خود   غیر نمود در شہود ما
وہم فانی شود نہ ما فانی   ہست باقی ہمیشہ بود ما

''ہمارے وجود میں تمام موجودات ہمارے نمود کا مخفی خزانہ موجود ہے۔

پردے کے پیچھے ہم آواز رکھتے ہیں، اس نے سے ہماری سرود ظاہر ہے۔

اپنے وجود میں ہم نے اپنے سوا کچھ نہیں دیکھا، اور ہمارے ظہور میں غیر نے بھی ہمارے علاوہ کچھ نہیں دیکھا۔

وہم، فانی ہوگا نہ ہم فانی ہوں گے، ہمارا وجود ہمیشہ باقی رہے گا۔''

شاہد اعظمی صاحب نے ہو بہو ترجمہ کیا تا کہ قاری شاعری کے مفہوم سے واقف ہوسکیں۔ اس کے علاوہ تصوف اور اخلاقیات کا عنصر بھی شاعری میں نمایاں ہے۔ وہ اخلاقی درس دیتے ہیں اور زندگی کے مسائل کو معنی خیز انداز میں بیان کرتے ہیں۔ پوری شاعری فلسفہ اور تصوف کے اردگرد گھومتی نظر آتی ہے۔ شعر دیکھیے۔

کس ندید عاشق خود من ازان   عاشق خود خود شدم ای دوستان
خوبی و حسن و کمال ذات من   خود شناسم کس نداند در جہان

''اس جیسا میں نے اپنا عاشق کسی کو نہیں دیکھا، اے دوستو! میں اپنا عاشق خود ہوگیا۔

میں اپنی ذات کے حسن وخوبی اور کمالات کو خود جانتا ہوں، دوسرا کوئی دنیا میں نہیں جانتا۔''

دیوان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ پوری شاعری صوفیانہ خیالات کی ترجمان ہے اور اخلاق وآداب کے اصول بھی پیش کرتی ہے۔ داراشکوہ مشترکہ تہذیب اور آپسی میل جول پر زور دیتا تھا۔ وہ مذہبی ہم آہنگی کا علمبردار تھا۔

داراشکوہ کے کلام میں تغزل کی شان بھی پائی جاتی ہے۔ چند شعر پیش کیے جاتے ہیں:

شکر للہ کہ من آن یار بدیدم امروز — از در و بام پدیدار بدیدم امروز
دیدن روی میسر نشود یک ساعت — من خوشش دیدم و بسیار بدیدم امروز
غیر آن یار ہمہ رفت ز عالم بودم — جلوہ گر در گل و در خار بدیدم امروز

''اللہ کا شکر ہے کہ آج میں نے اپنے محبوب کا دیدار کیا، در و بام کے توسط سے اس کو ظاہر ہوتے میں نے دیکھا ہے۔ ایک لمحے کے لیے بھی اس کے چہرے کی زیارت میسر نہیں ہوتی، میں خوش ہوں، آج میں نے اس کا دیدار کیا، اور خوب کیا۔ اس محبوب کے علاوہ میں ساری دنیا سے بے پرواہ ہو گیا تھا، گل و خار کے درمیان میں نے اس کا آج دیدار کیا۔''

داراشکوہ کے دیوان کو مقبولیت حاصل نہ ہو سکی، تذکرہ نویسوں نے شاعروں کے ذکر میں جگہ نہیں دی، اس وجہ سے داراشکوہ کے دیوان سے لوگ کم ہی واقف ہیں۔ طویل عرصے بعد خان بہادر مولوی ظفر حسن نے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے جرنل کے ذریعہ ادبی دنیا کو متعارف کرایا اور محمد نبی خان نے ریسرچ سوسائٹی پاکستان سے 1969 میں شائع کیا۔ اس کے بعد شاہد اعظمی نے مختلف کتب خانوں اور دیگر ذرائع سے استفادہ کرتے ہوئے 216 غزلیں اور 148 رباعیات کا اردو میں ترجمہ کیا اور خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔

بہرحال ہم کہہ سکتے ہیں کہ دیوانِ داراشکوہ بہترین شاعری کا دیوان ہے۔ اس دیوان کے اردو ترجمے کی ضرورت تھی۔ اس ضرورت کو شاہد اعظمی صاحب نے بحسن و خوبی پوری کی ہے۔ انھوں نے شاعری کے مفہوم کو اچھی طرح سمجھا اور عام فہم اور خوبصورت انداز میں اس کا ترجمہ کیا ہے۔

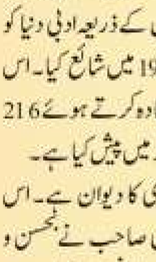

علم البیان

مصنف: ثروت حسین میرٹھی، مرتب: نگار عظیم
صفحات: 258، قیمت: 140 روپے، سنہ اشاعت: 2021
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: فردوس بانو فلاحی، گلمرگ اپارٹمنٹ، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی۔ 25

قومی اردو کونسل کی فہرست کتب 2020 پر نظر ڈالتے ہیں تو اولاً ادبیات سے متعلق ایک طویل فہرست ملتی ہے۔ اس سے آگے بڑھتے ہیں تو یکے بعد دیگرے ان تمام عناوین پر نظر پڑتی ہے جن کا تعلق تمام شعبہ ہائے حیات سے ہے۔ گویا زبان، ادب، تنقید، تحقیق، تخلیق، سوشل سائنسز، تاریخ، سیاسیات، اقتصادیات، طب و صحت نیز مذہب سے متعلق کتاب پر بھی آپ کی نظر پڑ جائے گی خواہ وہ طبع زاد ہوں یا مترجم۔ حتیٰ کہ سائنس و ٹکنالوجی اور تجارت سے متعلق بھی آپ کو کتاب مل جائے گی، جب کہ قومی اردو کونسل صرف اردو زبان کی ترویج و اشاعت کا ادارہ ہے۔

درج بالا نکتے کے پیچھے منطق یہ ہے کہ اردو کی توسیع و اشاعت میں اردو زبان میں دستیاب تمام تحریریں ممد و معاون ہیں جو کسی بھی مضمون پر مشتمل ہوں۔ اس کام کے لیے کونسل نے باقاعدہ طور پر پینلس بنائے ہیں جو ان فنون پر کام کرتے ہیں اور اردو زبان میں مواد فراہم کرتے ہیں تاکہ کسی نہ کسی صورت میں اردو لوگوں تک پہنچے۔ مزید معلومات میں اضافہ بھی ہو جو زندگی کے کسی شعبے میں آسانی مہیا کرے۔

زیر تبصرہ کتاب 'علم البیان: اقسام نثر و نظم' کا تعلق علم بلاغت سے ہے۔ علم البیان بظاہر نام سے محدود نظر آتا ہے لیکن اس کے تحت فصاحت و بلاغت کے جملہ علوم، اور اجزا پر محیط ہے۔ اس میں قواعد کے چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے، اہم سے اہم اور غیر اہم موضوعات بھی زیر گفتگو لائے گئے ہیں جن کا تعلق اردو زبان کی تحصیل نیز زبان کی سلاست و روانی، شیرینی و لطافت میں چار چاند لگاتے ہیں۔ جیسے علم بیان، تشبیہ کا بیان، استعارہ کا بیان، استعارے کے اقسام، مجاز مرسل، کنایہ، علم بدیع، صنائع لفظی، اقسام نثر و نظم، عیوب کلام کا بیان، قوافی ہائے ہوز و الف، شتر گربہ، سرقہ و توارد کا بیان وغیرہ سبھی اقسام و اجزا پر روشنی ڈالی ہے۔

کتاب کے مصنف ثروت حسین میرٹھی نے علم بلاغت کے ان تمام اجزا کی مع مثال تعریف بیان کرتے وقت ان اسباب پر روشنی ڈالی ہے جن سے فن پارہ کمزور ہو جاتا ہے یا فن پارے کو تابانی مل جاتی ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے نثر و نظم سے کثیر تعداد میں مثالیں دی ہیں۔ یہ مثالیں اردو نیز فارسی اشعار پر مشتمل ہیں۔ کہیں کہیں عربی زبان کے مصرعے و ابیات بھی درج ہیں۔

نگار عظیم نے 'علم البیان' سے قبل اس فن پر دستیاب کتابوں کی ایک فہرست بھی درج کی ہے۔ مختصراً ان کی قدر و اہمیت پر بھی روشنی ڈالی ہے البتہ ان میں سے بیشتر کتب عربی میں ہیں۔ 'علم البیان' سے ثروت حسین میرٹھی کی علمی و لسانی استعداد و لیاقت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ بعض جگہوں پر ثروت میرٹھی نے علم بلاغت و متعلقہ علوم پر متداول و قبل کی تعریفوں میں اضافہ کیا ہے۔ جس میں صراحت و فصاحت کا خیال کیا گیا ہے۔ نگار عظیم نے کتاب کو مستند بنانے کے لیے جا بہ جا ماہرین قواعد کی تحریریں بھی درج کی ہیں۔ ایک مقام پر علامہ شبلی نعمانی کی تصنیف 'شعر العجم' جلد چہارم نیز زیر تبصرہ کتاب 'علم البیان' سے اقتباس نقل کرکے دونوں کے نظریات سے بحث کی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''فصاحت کی تعریف اگرچہ اہل فن نے منطقی طور پر جنس و فصل کے ذریعے سے کی ہے یعنی حرفوں میں تنافر نہ ہو، لفظ نادر الاستعمال نہ ہو، قیاس لغوی کے مخالف نہ ہو، لیکن حقیقت یہ ہے کہ فصاحت کا معیار صرف وجدانی ہے۔'' (شبلی نعمانی: شعر العجم، جلد چہارم، ص 65)

ثروت میرٹھی فصاحت کی تعریف کرتے ہیں ''اس کا صحیح فیصلہ مذاق سلیم اور درستی وجدان پر منحصر ہے، جو علم بلاغت کا حقیقی معیار ہے۔''

بحیثیت مجموعی کتاب اردو زبان و ادب کے طالب علم کے لیے نہایت مفید و کارآمد ہے۔ دو صفحے کا پیش لفظ کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے لکھا ہے جب کہ عرض مرتب کے عنوان سے نگار عظیم نے سولہ صفحات رقم کیے ہیں جو کافی وقیع ہیں۔

ثروت حسین میرٹھی نے مذکورہ علوم کے ساتھ جملہ اصناف سخن پر بھی جستہ جستہ روشنی ڈالی ہے۔ ان کے موضوعات پر گفتگو کے ساتھ ساتھ مثالیں بھی دی ہیں، گویا اپنی گفتگو کے درمیان انھوں نے کچھ نئی معلومات میں اضافہ بھی کیا ہے۔

اس کتاب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اردو رسم الخط، ہجا اور املا پر بھی اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اردو میں مستعمل الفاظ و ان کی اصل پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔ گویا ایک فرہنگ دی گئی ہے جو ذخیرۂ الفاظ میں اضافے کا ذریعہ ہے۔ ایک عنوان 'بعض الفاظ کی عالمانہ تحقیق' کے تحت ایک لمبی بحث کی ہے جس میں بہت سے ان لفظوں کی تحقیق ہے جو اردو میں عربی و فارسی زبان سے مستعار ہیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست، صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنون لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں۔ کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی - 110066
NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

تحقیق و تنقید

تصانیف شبلی کے تراجم

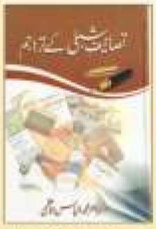

مصنف و ناشر: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
صفحات: 224، قیمت: 400 روپے، سنہ اشاعت: 2021
رابطہ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر: ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی، محلہ گھیر مناف، امروہہ (یوپی)

شمس العلما، علامہ شبلی نعمانی اردو فارسی ادبیات کا ایک بہت ہی اہم اور مثالی نام ہے، انھوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں سے اردو فارسی زبان و ادب کو جس طرح مالا مال کیا، یہ انھیں کا حصہ ہے، ان کی تصانیف بلاشبہ اپنے موضوع اور مواد کے حساب سے متنوع اور ہمہ جہت ہیں۔ آپ کے بارے میں ایک بالغ نظر نقاد و محقق محترم شمس الرحمٰن فاروقی مرحوم (1935-2020) کی رائے کا ایک اقتباس یہاں پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں جو علامہ شبلی کی ہمہ جہت علمی و ادبی خدمات کو سمجھنے کے لیے بہت ہی کارآمد ہے۔ وہ لکھتے ہیں ''حجت الاسلام علامہ شبلی نعمانی نے بہت کم عمر پائی، ان کا زمانہ تصنیف و تالیف و تدریس بھی نسبتاً بہت مختصر رہا؛ لیکن بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ صرف تصنیفات ہی کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ موضوعات کے تنوع، مطالعہ کی وسعت تفکر کی گہرائی اور گیرائی اور استحضار علم کے اعتبار سے ان کا ثانی مسلمانوں میں علم کی بہار کے زمانے میں البیرونی، بوعلی، غزالی جیسوں میں تو مل سکتا ہے؛ لیکن شبلی کے اپنے زمانے سے لے کر آج تک شبلی کا ثانی تو کیا، ایسا بھی کوئی نہ ہوا جسے ہم شبلی کا ظل کہہ سکیں۔''

تو ظاہر ہے علامہ شبلی نعمانی جیسے بیدار مغز محقق اور ہمہ صفت موصوف دانشور پر کام کرنے والا انسان بھی اسی طرح کی تڑپ اور لگن والا ہونا چاہیے اس طرح کے کام بڑی پتہ ماری اور یکسوئی کے ساتھ رات دن کا ریاض چاہتے ہیں جس کو محترم ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی صاحب نے بڑی لگن اور باریک بینی سے سرانجام دیا ہے۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ علامہ شبلی کے آثار کے مطالعہ اور ان کے تعارف میں صرف کیا ہے یہ ان کی بڑی خصوصیت ہے، کتاب 'تصانیف شبلی کے تراجم' کے مطالعہ سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے شبلی کی حیات و شخصیت اور ان کی علمی و ادبی خدمات کا کیسی گہرائی و باریک بینی کے ساتھ بھرپور مطالعہ کیا ہے۔

اس مسلسل مطالعہ کی وجہ سے انھوں نے انوکھا کارنامہ یہ انجام دیا ہے کہ شمس العلما علامہ شبلی نعمانی کی تصانیف کا جو دوسری زبانوں میں تعارف و ترجمہ ہوا ہے اس کا بھی ایک عمدہ تعارف کتابی صورت میں قلم بند کر دیا ہے۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کی یہ کتاب و تصانیف شبلی کے تراجم، دنیا بھر میں ان کی تصانیف و تالیفات کے تراجم کے تعارف پر مشتمل ہے۔ اس ذیل میں انھوں نے خود لکھا ہے کہ ''پیش نظر کتاب دنیا بھر میں ہونے والے تصانیف شبلی کے تراجم کے تعارف و تذکرہ کا مجموعہ ہے اور وضاحتی کتابیات کی طرح ایک ایک کتاب کے تمام تراجم نہایت تلاش و تفحص سے یکجا کیے گئے ہیں۔ تراجم کے ناشرین، ان کے مطابع، صفحات، سن اشاعت اور دیگر قابل ذکر تفاصیل درج کرنے کے علاوہ مترجمین کا تذکرہ بھی قلم بند کیا گیا ہے۔''

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی صاحب نے یہ تفصیل بھی بیان کی ہے کہ کن کن زبانوں میں تصانیف شبلی کے کتنے تراجم ہوئے ہیں، اس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے اردو تراجم 5، انگریزی 22، بنگالی تراجم 21، پشتو تراجم 16، تاجک ترجمہ 1، ترکی تراجم 6، تمل تراجم 2، سندھی تراجم 3، عربی تراجم 21، فارسی تراجم 29، فرنچ ترجمہ، 1، کشمیری ترجمہ 1، گجراتی تراجم 3، گوجری ترجمہ 2، کنڑ ترجمہ 1، مراٹھی 3، ملیالم ترجمہ 2، ہندی تراجم 3، کل میزان 140

اسی طرح ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے یہ بھی وضاحت کی ہے کہ کون کون سی تصنیف کے کتنے ترجمے شائع ہوئے، یہ بات بھی حیرت انگیز ہے، اس لیے اس کی بھی تفصیل یہاں پیش ہے۔ اردو ترجمہ مکاتبت شبلی 1، الجزیہ 8، الغزالی 5، الفاروق 30، الکلام 1، المامون 3، اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر 6، تاریخ بدء الاسلام 3، رسائل شبلی 1، سفر نامہ روم و مصر و شام 6، سوانح مولانا روم 4، سیرۃ النبیؐ 35، سیرۃ النعمان 9، شعر العجم (اول تا پنجم) 18، علم الکلام 2، غزلیات 1، کتب خانہ اسکندریہ 2، مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم 2، مقالات شبلی (مجموعہ) 2، مضامین شبلی 7، ان تراجم کی بھی کل تعداد 146 ہوتی ہے۔

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے اس کتاب میں یہ بھی نشاندہی کی ہے کہ تراجم کن کن ممالک میں ہوئے ان کے نام اس طرح ہیں: افغانستان، امریکہ، ایران، برطانیہ، بنگلہ دیش، پاکستان، تاجکستان، ترکی، دبئی، سعودی عربیہ، شام، لبنان، مصر، ہندوستان۔

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے ان تمام مترجمین کا بھی تفصیلی تعارف کرایا ہے۔ بالخصوص محترم ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے تصانیف شبلی کا جن زبانوں میں تراجم ہوئے ہیں ایک ایک پیراگراف میں ان زبانوں کا بھی اچھا تعارف پیش کیا ہے۔ زبانوں کے تعارف کی صرف تین چار مثالیں ان کے یہاں سے پیش کرتا ہوں۔

تاجک تراجم: تاجب زبان تاجکستان اور افغانستان کی دفتری زبان ہے یہ فارسی اور دری کے مماثل زبان ہے، تاجکستان، ایران اور افغانستان میں کثرت سے بولی جاتی ہے، اس کے کئی رسم الخط مثلاً سیریلیک رسم الخط، فارسی و عربی رسم الخط اور لاطینی رسم الخط۔

تمل تراجم: تمل زبان ہندوستان، سری لنکا، ملیشیا، سنگاپور، برما اور ماریشس مختلف علاقوں اور خطوں میں بولی جاتی ہے، ریاست تمل ناڈو اور سری لنکا کی یہ سرکاری زبان ہے۔''

سندھی تراجم: سندھی زبان دنیا کی قدیم ترین زبانون میں سے ایک ہے، یہ محض ایک زبان نہیں بلکہ تہذیب کا نام ہے۔

بنگالی تراجم: بنگالی زبان بنگلہ دیش اور ہمارے ملک کی ریاست مغربی بنگال کی سرکاری زبان ہے، تری پورہ، آسام، جزائر انڈمان ونکوبار میں بھی اس کے بولنے والے آباد ہیں۔ اس کا شمار ہند آریائی زبانوں میں ہوتا ہے۔

ترکی تراجم: ترکی زبان دنیا کی اہم علمی زبانوں میں سے ایک ہے، اس کے بولنے والے تقریباً 15 ملین ہیں، بطور مادری زبان ترکی کے علاوہ جرمنی، بلغاریہ، شمالی مقدونیہ، شمالی قبرص، یونان، قفقاز اور یورپ میں مقیم ترک تارکین وطن اسی زبان میں گفتگو کرتے ہیں، اس کا رسم الخط عربی تھا۔

بہرحال تصانیف شبلی کے تراجم، مطالعات شبلی کے سلسلے میں ایک اہم ترین تالیف ہے جس کو ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی صاحب کی تلاش و تحقیق اور سادہ و آسان زبان و بیان نے اور بھی اہم بنا دیا ہے۔ میں اتنی خوبیوں کی حامل تالیف پر ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

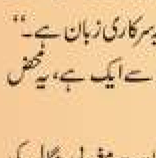

نقوش معنی

مصنف/ ناشر: پروفیسر خالد محمود
صفحات: 242، قیمت: 300 روپے
مبصر: ڈاکٹر آفتاب احمد منیری، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

جو موضوعات ومباحث شعر وادب کو آفاقیت عطا کرتے ہیں ان میں تنقید حیات کا پہلو سب پر غالب ہے۔ تخلیق ادب کا یہ وہ زاویہ ہے جو ہمیں زیست کے جلوۂ صد رنگ کی

ترجمانی کے ساتھ ساتھ وہ تنقیدی شعور بھی عطا کرتا ہے، جس کے وسیلے سے ہم فکر کے نئے جزیرے دریافت کرتے ہیں۔ تلاش اور تحقیق کے اس نہایت سنجیدہ عمل کے نتیجے میں شعروادب کی نت نئی تعبیریں سامنے آتی ہیں اور علم وادب کا کارواں نئے آفاق سے ہمکنار ہوتا ہے۔

معاصر ادبی منظر نامہ میں جن ممتاز تخلیق کاروں نے اپنی موجودگی کا شدت سے احساس کرایا ہے ان میں اردو کی بلند قامت شخصیت خالد محمود کا نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔

زیرنظر کتاب 'نقوشِ معنی' کی اشاعت سے قبل ان کی متعدد تصانیف اہل ادب سے خراج تحسین وصول کر چکی ہے۔ قارئین ادب کو شاعری اور تنقید کی معنیاتی جہتوں سے روشناس کرانے والے خالد محمود کو غیر افسانوی ادب کی دنیا میں بھی احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب مصنف کے متفرق علمی و ادبی مقالات پر مشتمل ہے۔ ان کے عناوین حسب ذیل ہیں: رشید احمد صدیقی: حیات اور ادبی کمالات، حکیم سید ظل الرحمن اور بھوپال کا علمی وادبی کارواں، اردو میں طنز ومزاح کی روایت اور مرزا عظیم بیگ چغتائی، ولی کے کلام میں صنائع بدائع کا عمل، شاہ مبارک آبرو اور ان کا رنگِ سخن، عبدالغفور نساخ اور خود نوشت سوانح حیاتِ نساخ، اقبال کی نظم 'مکالمۂ جبریل وابلیس' کا تجزیاتی مطالعہ، فراق کی رباعیاں 'روپ' کے حوالے سے، فیض کی غزلوں میں طنزیہ عناصر، میری حیات مستعار میں درس وتدریس کے رنگ۔

اس مجموعہ مقالات میں شامل پہلا مضمون اردو طنز ومزاح کی منفرد آواز رشید احمد صدیقی سے متعلق ہے۔ یوں تو اردو کے اس ادبی لیجنڈ کی معجز بیانی اور ان کی گل افشانی گفتار کی ایک دنیا معترف ہے لیکن فاضل مصنف نے جس انداز دلبری کے ساتھ ان کے رومانوی اسلوب میں پنہاں غیر معمولی حسِ مزاح اور نکتہ سنجی کو بیان کیا ہے وہ حد درجہ لائق ستائش ہے۔ مثلاً ایک مقام پر وہ لکھتے ہیں:

''دراصل مجھے اس بات کا اندازہ بہت بعد میں ہوا کہ رشید صاحب کا طنز ومزاح بالغوں سے زیادہ بالغ نظروں کے لیے ہے اور ان کے مخاطب ادب کا بالیدہ مذاق رکھنے والے اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد ہیں جس کا جتنا وسیع مطالعہ ہوگا وہ اسی مناسبت سے فیض یاب ہوسکتا ہے۔ ان کے اسلوب کا اشاراتی نظام ہر ذہن کی گرفت میں نہیں آتا۔'' (ص 11)

علاوہ ازیں اپنے اس مضمون میں خالد محمود یہ انکشاف بھی کرتے ہیں......

''ان (رشید صاحب) کی شخصیت کا سب سے بھرپور اظہار نہ ان کے مزاحیہ مضامین میں ہے۔ نہ قلمی مرقعوں میں، نہ ہی تنقیدوں میں نہ دوسرے مضامین میں بلکہ ان کے خطوط میں ہے'' (ص 22)

اس مجموعہ مقالات کی ایک انفرادیت یہ بھی ہے کہ مصنف نے اس میں اپنے ایک معاصر حکیم سید ظل الرحمن کی گراں قدر علمی وادبی خدمات کا جائزہ لیا ہے۔ ان کا یہ انداز جنوں قابل قدر اس لیے ہے کہ حکیم سید ظل الرحمن کی علمی وتحقیقی کاوشیں نسل نو کے لیے چراغ راہ کی مانند ہیں جہاں ایک طرف انھوں نے علی گڑھ میں ابن سینا اکیڈمی قائم کرکے طب یونانی کے شعبے میں جدید تحقیق کی شمع روشن کی ہے وہیں دوسری جانب علم طب کے موضوع پر ان کی پچاس سے زیادہ کتابیں اور علمی مقالات منظر عام پر آچکی ہیں اپنے اس مضمون میں پروفیسر خالد محمود نے حکیم صاحب کی غیر معمولی کاوشوں پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے ان کی ہمہ جہت شخصیت کے مختلف گوشوں کو بیان کیا ہے۔ حکیم صاحب کی ادبی تصنیف 'بھوپال کا علمی وادبی کارواں' سے شروع ہوتی ان کی گفتگو قاری کو صاحب تصنیف کی شخصیت کے کئی مخفی پہلوؤں سے متعارف کرا دیتی ہے۔ مذکورہ کتاب کا علمی رتبہ کیا ہے اس جانب واضح اشارہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''بیس صفحات پر مشتمل تعارفی مضمون علم وفن کے دریائے بسیط کو ایک کوزہ میں بند کرنے کی خوبصورت مثال ہے۔ بھوپال کی قابل فخر علمی وراثت کا کوئی گوشہ اور...... ''اسلامی ادب کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس کا اس مختصر تحریر میں احاطہ نہ کیا گیا ہو۔'' (ص 63)

اس کتاب میں شامل مضامین میں ایک تحریر ایسی بھی ہے جو حصول علم کی خاطر پیش کی جانے والی قربانیوں کی داستان جنوں بیان کرتی ہے، علاوہ ازیں منصب تدریس کی عظمتوں سے بھی روشناس کراتی ہے۔ مصنف نے جس وارفتگی کے ساتھ یہ مضمون سپرد قلم کیا ہے اس سے اس باوقار پیشے کی تئیں ان کی جذباتی وابستگی کا اندازہ ہوتا ہے فکر ونظر کے صدہا چراغ روشن کرتی اس تحریر کو پڑھتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ مصنف نے تدریس کے پیشے کو اختیار نہیں کیا بلکہ اس پیشے کو جیا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ مثالی تدریس کے لیے لائق استاذ کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ اس ضمن میں مصنف کے یہ الفاظ دلیل راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

''اچھے طالب علم اپنے اساتذہ کو بھی مطالعہ پر مجبور کر دیتے ہیں، ایک اچھا استاذ پہلے اپنے اساتذہ سے سیکھتا ہے بعد میں طلبا سے سیکھتا ہے۔ اس طرح معلمی کے پیشے میں سیکھنے سکھانے کا عمل زندگی بھر جاری رہتا ہے۔ اگر معلمی کا آغاز دلچسپی کے مضمون سے ہو تو وہ نعمت بھی حاصل ہو جاتی ہے جسے ملازمت کی اصطلاح میں Job satisfaction کہا جاتا ہے۔'' (ص: 222)

مصنف نے اس کتاب کی تصنیف میں اپنی غیر معمولی تخلیقی صلاحیتوں اور اپنے تنقیدی شعور کو بروئے کار لایا ہے۔ جس کے نتیجے میں قاری کی فکر کو مہمیز کرتے یہ علمی جواہر پارے اس کتاب کی زینت بنے ہیں۔

امید ہے کہ یہ علمی کاوش حلقہ ادب میں قدر کی نگاہوں سے دیکھی جائے گی۔

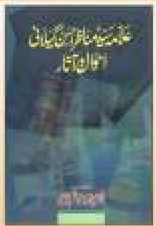

علامہ سید مناظر احسن گیلانی: احوال و آثار

تحقیق وترتیب: ڈاکٹر فاروق اعظم قاسمی

صفحات: 562، قیمت: 500 روپے، سنہ اشاعت: 2022

ناشر: ڈاکٹر فاروق اعظم قاسمی

مبصر: امانت اللہ، A-22، یسمارا اپارٹمنٹ، گلی نمبر 7، بٹلہ ہاؤس، دہلی

زیر تبصرہ کتاب 'علامہ سید مناظر احسن گیلانی: احوال و آثار' ڈاکٹر فاروق اعظم قاسمی کی ترتیب وتحقیق کردہ کتاب ہے جس میں انھوں نے بیسویں صدی کے ایک جید عالم، باکمال ادیب، فکر وفن کے علم بردار، علم وعمل کے پیکر عظیم محقق ومصنف علامہ سید مناظر احسن گیلانی کی منفرد اور مختلف الجہات شخصیت، کو نئی نسل کے علمی وادبی حلقوں میں متعارف کروانے کی ایک وقیع اور قابل قدر کوشش کی ہے۔

یہ کتاب علامہ گیلانی کی ذات وصفات اور علمی کمالات پر ان کی حیات میں اور ان کی وفات کے بعد لکھے گئے ان نادر مقالات ومضامین کا مجموعہ ہے جو مولانا گیلانی کے حیات و خدمات پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ گیلانی شناسی کے بے شمار پہلوؤں کو بھی اجاگر کرتے ہیں، علامہ گیلانی میں ڈاکٹر فاروق اعظم کی دلچسپی دیوبند کے زمانہ طالب علمی سے ہی ہے اور یہ ان کی بے پناہ عقیدتوں کا ہی ثمرہ ہے کہ وہ اس سے پہلے غالباً 2007 میں ہی علامہ کے بکھرے ہوئے شعری سرمایے کو مرتب ومدون کرکے 'مناظر گیلانی' کے نام سے شائع کروا چکے ہیں۔

بعد ازاں اس تعلق سے ان کا دوسرا بڑا اہم، غیر معمولی اور لائق ستائش تحقیق 'علامہ سید مناظر احسن گیلانی: احوال و آثار' ہے جس میں مرتب نے بڑی عرق ریزی اور جانفشانی سے کام لیتے ہوئے مولانا گیلانی پر لکھے گئے ان تمام سوانحی، تحقیقی، تنقیدی و تاثراتی نگارشات کو یکجا کرنے کوشش کی ہے جو گیلانی کی تفہیم میں گراں قدر سرمایے کی حیثیت رکھتے ہیں، کتاب کے مشتملات میں زیادہ تر ایسے مقالات ومضامین ہیں جو یا تو

علامہ گیلانی کے معاصرین کے تحریر کردہ ہیں یا ان کے ممتاز اور نمایاں شاگردوں کے ہیں، اسی طرح کچھ دیگر اہل علم وقلم کی نگارشات کو بھی شامل کتاب کیا گیا ہے۔

کتاب کا پیش لفظ مولانا بدرالحسن قاسمی کا لکھا ہوا ہے، جس میں مولانا نے علامہ گیلانی کی شخصیت کے امتیازات وخصوصیات پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے، اور اس کے بعد خود مرتب کتاب کا بے حد جامع، طویل تحقیقی مقدمہ ہے، جس میں انھوں نے مولانا گیلانی پر اب تک ہونے والی تصنیف وتحقیق وتنقید کے حوالے سے بڑی معلومات افزا گفتگو کی ہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے اپنے اس مقدمے میں قارئین کی تقریب تفہیم کے لیے مولانا گیلانی کے محققین، ناقدین، مبصرین، مدونین اور شارحین کی درجہ بندی کر کے ایک نئی جہت دی ہے، اسی طرح مقدمے میں ہی گیلانیات کے حوالے سے تحقیق کو بھی تین زمروں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک مقالاتی تحقیق، دوسرے کتابی تحقیق اور تیسرے جامعاتی تحقیق۔

کتاب کے مقالات تین حصوں میں منقسم ہیں، پہلا حصہ 'احوال' کا ہے، جس میں پیش لفظ اور مقدمے کے علاوہ ستر ہ مضامین شامل ہیں، پہلا مضمون فاروق اعظم صاحب کا 'مطالعۂ گیلانی: چند ضروری باتیں' کے عنوان سے ہے، اس میں انھوں نے مولانا گیلانی کی شخصیت، ان کی حیات وکارنامے کے تعلق سے بہت سے ایسے تضادات اور تسامحات کی وضاحت کرنے کے ساتھ ساتھ ان کا ازالہ بھی کیا ہے جو بے حد ناگزیر تھے، اس کے بعد ڈاکٹر حمید اللہ (مولانا سید مناظر احسن گیلانی)، ڈاکٹر غلام محمد حیدرآبادی (تذکرۂ احسن)، پروفیسر مظفر گیلانی (مولانا مناظر احسن گیلانی: حیات اور شخصیت)، سید صباح الدین عبدالرحمٰن (مولانا مناظر احسن گیلانی)، حکیم سید محمود احمد برکاتی (مولانا مناظر احسن گیلانی اور ٹونک)، مولانا ابوالحسن علی ندوی (مولانا سید مناظر احسن گیلانی)، مفتی ظفیر الدین مفتاحی (علامہ گیلانی رحمۃ اللہ علیہ)، ماہر القادری (مولانا مناظر احسن گیلانی)، ڈاکٹر امان اللہ راٹھور (مولانا مناظر احسن گیلانی: ایک تاریخ ساز شخصیت)، مولانا سید ازہر شاہ قیصر (مولانا سید مناظر احسن گیلانی، دارالعلوم کا ایک فرزند)، مولانا سید انظر شاہ کشمیری (حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی اپنے خطوط کے آئینے میں)، مولانا عبدالماجد دریابادی (محقق گیلانی)، مولانا سعید احمد اکبرآبادی (حبر امت)، مولانا شاہ معین الدین ندوی (مولانا مناظر احسن گیلانی)، مولانا حکیم سید ظہیر احمد برکاتی (مولانا مناظر احسن گیلانی) کے مضامین ہیں۔

دوسرا حصہ 'افکار' کے عنوان سے ہے اور اس میں مولانا عبدالباری ندوی (بڑا نادر سنگم: دل ودماغ دونوں کا)، سعاد محمد عباس، سید عبدالغفار بخاری (مولانا گیلانی اور ان کا مطالعۂ ادیان)، ڈاکٹر سعود عالم قاسمی (مولانا گیلانی اور علم حدیث)، مولانا بدرالحسن قاسمی (علامہ مناظر احسن گیلانی کے تین نامور اساتذہ)، پروفیسر محسن عثمانی ندوی (اسلامک ہوٹلس)، مولانا منظور نعمانی (مولانا گیلانی اور الفرقان)، مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی (مولانا گیلانی اور الفرقان)، ڈاکٹر امان اللہ راٹھور (مولانا گیلانی اور مولانا عبدالماجد دریابادی) کے مضامین شامل ہیں۔

کتاب کا تیسرا حصہ 'ادبیات' کا ہے اور اس میں مولانا کے نثری اسلوب، انشاپردازی، شعری خصوصیات اور ان کی کتابوں کے تجزیے پر مشتمل مطبوعہ تحریریں شامل کی گئی ہیں، جن میں ڈاکٹر امان اللہ راٹھور (مولانا مناظر احسن گیلانی: مکتوب نگاری اور دوسری صلاحیت)، مولانا محمد فیصل ندوی (مولانا گیلانی ادب اسلامی کا ایک نمائندہ ورتابندہ)، ڈاکٹر ابرار احمد اجراوی (مولانا مناظر احسن گیلانی کا نثری اسلوب)، مولانا تنویر خالد قاسمی (مخصوص طرز انشا کا موجود مولانا مناظر احسن گیلانی)، پروفیسر محسن عثمانی ندوی (علامہ سید مناظر احسن گیلانی ایک چہار لسانی نعت گو شاعر)، پروفیسر ابو منور گیلانی (مولانا مناظر احسن گیلانی اور مثنوی خواب وطن) اور ڈاکٹر فاروق اعظم قاسمی (علامہ سید مناظر احسن گیلانی کا شعری جہان) قابل ذکر ہیں۔

چوتھے حصے کا عنوان ہے 'علامہ سید مناظر احسن گیلانی مشاہیر کی انجمن میں'، جس میں ان کے تعلق سے مولانا سید حسین احمد مدنی، قاری محمد طیب قاسمی، علامہ سید سلیمان ندوی، مفتی محمد شفیع دیوبندی کی مختصر تاثراتی تحریریں شامل اشاعت ہیں۔ آخر میں مولانا کی تصانیف کی فہرست دی گئی ہے، جن کی تعداد دو درجن سے کچھ زائد ہے اور ان میں سے بیشتر علمی وادبی حلقوں میں بے حد مقبول ومعروف ہیں۔

زیر نظر کتاب کے مشمولات (مضامین ومقالات) جس نوعیت کے ہیں اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مرتب کتاب نے بڑی محنت اور جانفشانی کے ساتھ مولانا گیلانی کے حوالے سے ایسے بیش قیمت مواد کو اکٹھا کیا ہے جو نہ صرف مولانا گیلانی کی ہمہ جہت شخصیت، ان کی ذات وصفات اور ان کے علمی وادبی کارناموں کو اجاگر کرتے ہیں بلکہ مولانا کی علمی، دینی اور ادبی خدمات سے نئی نسل کو روشناس کرانے کے ساتھ ساتھ مستقبل میں مولانا کے کارناموں کے کسی پہلو پر تحقیق کا ارادہ رکھنے والوں کے لیے یہ کتاب معاون ومددگار اور مشعل راہ ثابت ہو سکتے ہیں، اس کتاب میں شامل بیشتر تحریریں مختلف کتابوں، رسائل وجرائد میں باقاعدہ شائع ہو چکے ہیں، مگر دور حاضر میں قدیم کتابوں یا رسالوں کی ورق گردانی کرنا کسی مشکل امر سے کم نہیں ہے، مگر ڈاکٹر فاروق اعظم نے بہت سے تشنگان علم وادب کا خیال رکھتے ہوئے وقت کے ضیاع کے بغیر مطلوبہ مواد تک رسائی کو آسان بنا دیا ہے۔ اس کے لیے ڈاکٹر فاروق اعظم قاسمی مبارکباد کے مستحق ہیں، امید ہے کہ ان کی یہ کاوش اہل علم کی ذوق کتاب بینی کی سیرابی کا سامان فراہم کرے گی اور علمی و ادبی حلقوں میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھی جائے گی اور خاطر خواہ پذیرائی بھی ملے گی۔

کتاب کی طباعت دیدہ زیب ہونے کے ساتھ ساتھ بہت ہی دلکش اور جاذب نظر ہے۔ کتاب کی اشاعت قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے مالی تعاون اور مرکزی پبلی کیشنز کے زیر اہتمام عمل میں آئی۔

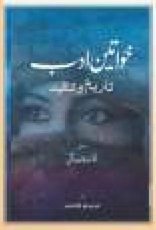

خواتین ادب :تاریخ و تنقید

مصنفہ: ڈاکٹر صالحہ صدیقی

صفحات: 1016 قیمت: 500 روپے، سنہ اشاعت: 2021

ناشر: ضیائے حق فاؤنڈیشن پبلشنگ ہاؤس، پریاگ راج

مبصر: ڈاکٹر اجے مالوی (ممبر ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی)

اردو ادب میں خواتین کی خدمات کا بھی طویل سلسلہ رہا ہے، لیکن افسوس کہ اردو ادب کی خواتین کی خدمات کو تحقیق وتنقید کا موضوع سنجیدگی سے کم ہی بنایا گیا، جس کے نتیجے میں آج بھی تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن زیر تبصرہ کتاب ایک خوش آئند قدم ہے۔ اس کتاب کو منظر عام پر لانے اور اس کی ضرورت پر روشنی ڈالتے ہوئے مصنفہ لکھتی ہیں:

''اس کتاب میں خواتین کی نثری، غیر نثری اور شعری اصناف میں کی گئی خدمات کا بھرپور جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں خواتین کی خدمات کو دس ابواب میں منقسم کیا گیا ہے۔ تاکہ خواتین کی خدمات کا اعتراف مختلف زاویوں سے بھرپور انداز میں کیا جا سکے۔ جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا کہ خواتین نے خصوصا اردو ادب میں آزادی کے بعد اپنے نام سے لکھنا شروع کیا تھا اور انھوں نے تقریبا تمام اصناف میں طبع آزمائی کی۔ خواتین نے ان خدمات سے اردو کے دامن کو گرانبار کیا لیکن افسوس کہ خواتین کی ان کاوشوں کو سوائے چند اہم ناموں کے نظر انداز کر دیا گیا وہ گوشۂ گمنامی میں رہیں۔ ان کو تحقیق وتدریس کا موضوع بھی نہیں بنایا گیا۔ آج بھی بے شمار خواتین قلمکاروں پر تحقیق کرنے کی ضرورت ہے۔ خواتین کی شعری اصناف میں غزل اور نظم پر اسی طرح نثر میں ناول، افسانہ پر تو مواد کی کوئی کمی نہیں ملتی اس کے برعکس خواتین کی غیر نثری اصناف پر توجہ اس طرح

نہیں کی گئی یا تحقیق کا موضوع نہیں بنایا گیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خواتین کی خدمات کا یہ حصہ گوشۂ گمنامی میں رہا۔ انھیں کمیوں کو دیکھتے ہوئے میں نے 'اردو ادب میں خواتین ہند کی خدمات' پر یہ کتاب 'خواتین ادب تحقیق و تنقید' لانے کا فیصلہ کیا اور کوشش کی ہے کہ تمام اصناف میں خواتین کی خدمات کا جائزہ لے سکوں اور ان کے ساتھ انصاف کرسکوں۔''

اس کتاب کو دیکھ کر ہی اندازہ لگ جاتا ہے کہ ڈاکٹر صالحہ صدیقی نے خواتین کی خدمات پر ایک بھرپور کتاب لکھی ہے۔ اس کتاب کی ابواب بندی قابل تعریف ہے۔

اس کتاب میں نثری، غیر نثری، شعری، تنقیدی، تحقیقی اور دیگر اصناف میں اردو ادب کی خواتین قلمکاروں پر مبنی ڈاکٹر صالحہ صدیقی کے اکتالیس مضامین شامل ہیں جن میں سے بیشتر مضامین ہندستان و بیرون ممالک کے مختلف رسائل و جرائد کی زینت بن چکے ہیں۔ اس کتاب میں ڈاکٹر صالحہ صدیقی کے سوانحی کوائف کے ساتھ ساتھ ان کی تخلیقات پر ہندستان کے مفکرین و دانشوروں کے تاثرات بھی شامل ہیں، جس سے اس کتاب کی اہمیت کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر صالحہ صدیقی کی کاوشوں پر بھی بھرپور روشنی پڑتی ہے۔ اس کتاب کا انتساب اکیسویں صدی کے معروف و مقبول ناول نگار مشرف عالم ذوقی اور ان کی اہلیہ تبسم فاطمہ صاحبہ کے نام کیا گیا ہے، چونکہ اس کتاب کی تیاری کرونا سے قبل ہی کی جا رہی تھی، مشرف عالم ذوقی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا، جو اس کتاب کی زینت ہیں، وہ لکھتے ہیں: ''صالحہ صدیقی کو میں نے آگے بڑھتے ہوئے دیکھا ہے، وہ ایک متحرک اور فعال قلمکار ہے جو بہت تیزی سے اپنی پہچان اردو ادب میں بنا رہی ہے، ان کی کئی تصنیفات جس میں علامہ اقبال پر لکھا ڈراما اور فیمنزم پر ان کی کتاب کو میں اہم مانتا ہوں۔ یہ خوش آئند بات ہے کہ نوجوان قلمکار بدلتے وقت کی آہٹ کو محسوس کر رہا ہے۔''

اس کتاب میں شامل ہر مضمون اپنی انفرادی حیثیت رکھتا ہے، ہر مضمون اہم موضوع پر مشتمل ہے، جس سے تحقیق و تنقید کے نئے باب روشن ہوتے ہے، اس کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ خواتین نے شعر و ادب کا شاید ہی کوئی گوشہ ہوگا جہاں اپنے علم و فن کا مظاہرہ نہ کیا ہو۔ یہ کتاب نسائی ادب میں بلاشبہ اہم اضافہ ہے، یقیناً خواتین ادب پر کیا گیا یہ کام ڈاکٹر صالحہ صدیقی کا ایک بڑا کارنامہ ہے جس کی آج ضرورت بھی ہے۔ یہ کتاب ان طلباء کے لیے بھی انتہائی اہم ہے جو نسائی ادب یا تانیثیت پر کام کر رہے ہیں۔

مجھے خوشی ہے کہ نوجوان خواتین قلمکاروں میں اس وقت اہم ناموں میں ان کا نام بھی شامل ہے۔ انھوں نے ان موضوعات پر قلم اٹھایا ہے جن پر آج اردو ادب میں بہت کم توجہ دی جا رہی ہے، خصوصاً اردو میں غیر نثری اصناف ڈراما اور بچوں کے ادب پر ان کی تخلیقات خاص طور پر قابل ذکر ہے، مجھے بہت خوشی ہے کہ وہ ان اچھوتے پہلوؤں پر خامہ فرسائی کر رہی ہیں، میری دعا ہے کہ یہ سلسلہ یونہی جاری و ساری رہے، مجھے امید ہے کہ ان کی دیگر تصنیفات کی طرح اس کتاب کا بھی اردو ادب میں بھرپور استقبال کیا جائے گا اور داد و تحسین سے نوازا جائیگا جس کی یہ کتاب مستحق ہے۔

ابلاغیات

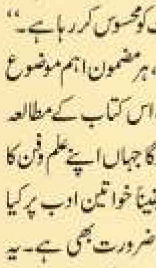

اردو صحافت اور جنگ آزادی 1857

مصنف: معصوم مرادآبادی

صفحات: 208، قیمت: 250 روپے، اشاعت سوم: 2021

ناشر: خبردار پبلی کیشنز، 1/45، للتا پارک، لکشمی نگر، دہلی 110092

مبصر: عبدالحی، سی ایم کالج، دربھنگہ

اردو زبان نے اپنے آغاز سے ہی مختلف نشیب و فراز کا سامنا کیا ہے اور ملک کی سیاست اور تہذیب و تمدن کے ساتھ شانہ سے شانہ ملا کر چلتی رہی ہے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ملک کی آزادی میں اردو زبان اور اردو صحافت کا قائدانہ رول رہا ہے۔ یہ کہنا صد فیصد درست ہوگا کہ ملک کی جنگ آزادی اردو زبان میں لڑی گئی تھی۔ 1857 کی پہلی جنگ آزادی جسے انگریزوں نے غدر کا نام دیا تھا تاریخ کا وہ خونیں باب ہے جس نے ایک طرف انگریزوں کو مکمل اقتدار عطا کیا تو دوسری طرف ملک کی عوام کے دلوں میں انگریز حکومت کے خلاف ایسا غم و غصہ پیدا کیا کہ پورے ملک میں آگ بھڑک اٹھی۔ شعر و ادب کے موضوعات تبدیل ہوگئے اور لوگوں کے جذبات و احساسات کو جذبہ حریت اور حب الوطنی میں بدل دیا گیا۔ اس غم و غصہ اور انگریز حکومت کی مخالفت کے لیے ہزاروں لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اردو کے شاعر و ادیب بھی ایسے لوگوں میں شامل تھے۔ اس دور میں جنگ آزادی دو محاذ پر لڑی جا رہی تھی ایک تو شمشیر و سنان سے اور دوسرے انگریز قلم رو کے خلاف قلم برداری سے۔ یہ دوسرا محاذ زیادہ طاقتور تھا کہ اس جنگ آزادی نے اردو صحافت کی ایک سمت مقرر کی اور اسے سرخروئی عطا کی۔ اردو اخبارات نے پورے ملک میں انگریزوں کے خلاف نفرت بھڑکانے میں ممتاز کردار ادا کیا تھا۔

ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی اور اردو صحافت پر کافی مواد موجود ہے۔ اس حوالے سے امداد صابری، عبدالسلام خورشید، نادر علی خاں، طاہر مسعود اور گربچن چندن، نازش انصاری پروانہ رودولوی وغیرہ کی کتابوں کا ذکر کیا جاسکتا ہے لیکن جنگ آزادی 1857 اور اردو صحافت کے موضوع پر کہیں ایک جگہ کچھ نہیں ملتا۔ اس معاملے میں معروف صحافی معصوم مرادآبادی قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اس موضوع پر اردو میں پہلا باضابطہ کام کیا ہے۔ 2007 میں جب پورے ملک میں جنگ آزادی 1857 کے ڈیڑھ سو سال پورے ہونے پر جشن منایا جا رہا تھا تو اسی دوران معصوم صاحب نے اس موضوع کی اہمیت و افادیت کے مدنظر یہ تحقیقی کام کیا اور اس کتاب کا پہلا ایڈیشن 2008 میں منظر عام پر آیا۔ زیر تبصرہ ایڈیشن اس کتاب کی اشاعت سوم ہے۔ کتاب کا مقدمہ معروف صحافی گربچن چندن نے تحریر کیا ہے جبکہ پروفیسر محمد ہاشم قدوائی، سعید سہروردی اور پروفیسر محسن عثمانی کے تبصراتی مضامین بھی کتاب میں شامل ہیں۔ کتاب میں اردو صحافت کے آغاز و ارتقا، 1857 اور اردو صحافت، دہلی اردو اخبار، مولوی محمد باقر وغیرہ پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔

جنگ آزادی کو مہمیز کرنے میں پیش پیش رہے دہلی اردو اخبار، صادق الاخبار، پیام آزادی، سراج الاخبار، طلسم لکھنؤ، سحر سامری، رسالہ بغاوت ہند، عمدۃ الاخبار، چشمہ فیض وغیرہ پر بھی تعارفی مضامین دیے گئے ہیں۔ کتاب میں جہاں اردو اخبارات کے کردار و افکار پر روشنی ڈالی گئی ہے وہیں اس دور کے صحافیوں کی مختصر حیات و خدمات کا بھی خاکہ دیا گیا ہے۔ 1857 کی جنگ آزادی سے متعلق واقعات کو دلچسپ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے جس سے قاری کو کتاب پڑھتے ہوئے بوریت کا احساس نہیں ہوتا۔ یہ کتاب اپنے موضوع پر نقش اول کا درجہ رکھتی ہے۔ کتاب کے دیباچہ میں معصوم مرادآبادی لکھتے ہیں:

میں نے اس کتاب میں موضوع سے انصاف کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ لیکن خامیوں اور کوتاہیوں کی گنجائش ہر کام میں باقی رہتی ہے مگر یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ اس موضوع پر بعض چیزیں پہلی بار منظر عام پر آرہی ہیں۔ مثال کے طور پر پہلی جنگ آزادی کے ترجمان کہے جانے والے اخبار پیام آزادی کا تذکرہ اس سے پہلے کسی اردو کتاب میں شامل نہیں ہے۔ جس کے ایڈیٹر مرزا بیدار بخت کے جسم پر سور کی چربی مل کر سولی پر چڑھا دیا گیا تھا۔ (ص 8)

جہاں اردو اخبارات ملک کی آزادی کے لیے ہر ممکن جد و جہد کر رہے تھے وہیں کوہ نور جیسا ایک اخبار بھی تھا جو انگریزوں کی حمایت کرتا تھا اور مجاہدین آزادی کو نمک حرام

کہتا تھا۔ یہاں تک کہ اس اخبار کو انگریزوں کے دہلی پر دوبارہ قابض ہونے سے خوشی ہوئی تھی۔ اس اخبار کا ایک نامہ نگار انگریزوں کی جاسوسی بھی کرتا تھا۔ انگریزوں کی حمایت کی وجہ سے اس اخبار نے خوب ترقی کی۔ ان باتوں سے قطع نظر اس اخبار کی بھی خدمات رہی ہیں اور اسی وجہ سے کوہ نور پر بھی ایک تفصیلی مضمون کتاب میں شامل ہے۔

معصوم مرادآبادی نے صحافت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے۔ ان کے قلم میں بڑی تابانی اور روانی ہے۔ صحافت سے متعلق موضوعات پر ان کی تقریباً ڈیڑھ درجن کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ یہ کتاب جنگ آزادی 1857 میں اردو صحافت کے کلیدی کردار پر بھرپور روشنی ڈالتی ہے اور اردو کے صحافتی ادب میں اس کتاب کو ایک بیش بہا خزانہ تصور کیا جانا چاہیے۔

فکشن

گومتی سے ٹیمز تک

مصنف: قیصر تمکین، مرتب: ڈاکٹر احسن ایوبی

صفحات: 232، قیمت: 350

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: محمد حنیف خان، شعبہ اردو، اے ایم یو، علی گڑھ

قیصر تمکین اردو کے ایک اچھے افسانہ نگار تھے، جن کا تعلق کاکوری کے علوی خاندان سے تھا، انھوں نے اردو ادب کو 'ژینت' جیسا لازوال افسانہ دیا، اس کے باوجود ان پر گفتگو بہت کم ہوئی، جس کے اسباب بہت سے ہیں مگر سر دست ان سے احتراز کرتے ہوئے ان کے افسانوں کے ایک نئے انتخاب کا تعارف مقصود ہے۔ ان کے نو افسانوی مجموعے منظر عام پر آئے۔ ان کے علاوہ ناولٹ نارسیدہ، اور خدا خدا صنم صنم شائع ہوئے۔ اسی طرح تنقیدی مضامین پر مبنی مجموعے شعر و نظر، تنقید کی موت اور اے دانش حاضر سمیت آپ بیتی 'خبر گیر' بھی شائع ہوئی۔ مگر اب ڈاکٹر احسن ایوبی نے ان نو افسانوی مجموعوں میں سے ان کی سترہ ایسی کہانیاں منتخب کرکے 'گومتی سے ٹیمز تک' کے نام سے شائع کیا ہے۔ ان کہانیوں کو ان کی نمائندہ کہانیاں کہا جا سکتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر کسی فرد واحد کے انتخاب کو اس قدر اہمیت کیوں دی جائے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ڈاکٹر احسن ایوبی نے چونکہ قیصر تمکین کی ادبی خدمات پر ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھا ہے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ان کو پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی ہے، اس لیے ان سے بہتر کوئی دوسرا شخص یہ کام نہیں انجام دے سکتا تھا۔ دراصل ڈاکٹر احسن ایوبی نے دوران پی ایچ ڈی ان کے سبھی افسانوی مجموعوں اور بکھرے ہوئے افسانوں کو نہ صرف تلاش کیا بلکہ ان کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے، جس کے بعد نہ صرف ان کی خدمات پر ایک قابل قدر پہلا منظم کام کیا ہے بلکہ انھوں نے رطب و یابس افسانوں میں سے سترہ ایسے افسانے منتخب کیے ہیں جو قیصر تمکین کے نمائندہ افسانے کہے جا سکتے ہیں، ان میں سواستکا، باب الابواب، مرحبا، سیر گل خوب نہ دیدیم، خدا حافظ ابوالحسن، پس نوشت، یہودن، کفارہ، یروشلم یروشلم، درگاہ شریف، عہد گل ختم ہوا، اللہ اکبر، ایک کہانی گنگا جمنی، سر مقتل، نو جیون اور ژینت شامل ہیں۔

مندرجہ بالا افسانوں کی قرات سے قیصر تمکین کے فنی امتیازات اور موضوعاتی تنوع کے ساتھ تکنیکی اور ہیئتی تجربات کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ ان کہانیوں میں ان کا حاوی رنگ موجود ہے۔ ڈاکٹر احسن ایوبی کا یہ انتخاب دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے بہت سوچ سمجھ کر انتخاب کیا ہے کیوں کہ ہر کہانی الگ نوعیت کی ہے، جس کا رنگ جدا ہے۔ اس میں علامتی کہانیاں بھی ہیں، صنعتی نظام کی زائیدہ مادیت پرستی اور ماضی پرستی بھی ہے، اساطیر کے ذریعہ بیان کی جانے والی کہانیاں بھی ہیں، تکنیک کا تجربہ اور اودھی زبان کا برجستہ استعمال بھی ان کہانیوں میں ملتا ہے۔ خود ساختہ ہجرت کا درد، اپنوں سے دوری و مجبوری کا کرب بھی ہے۔ قدیم انسانی اقدار کی زوال آمادگی اور تہذیب و ثقافت کی پراگندگی بھی ان کہانیوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اسی طرح دور جدید کی آسائشیں، انسان کی تقلیب ماہیت، انسانی زندگی میں جدت کے فوائد اور اس کے نقصانات کے نقوش بھی ان کہانیوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

قیصر تمکین کے افسانوں میں لکھنؤ ہر آن زندہ رہتا ہے جس میں وہ برملا اودھی لب و لہجہ بھی استعمال کر لیتے ہیں۔ یہ خصوصیت اودھ کے اہم افسانہ نگار قاضی عبدالستار کے یہاں دیکھنے کو ملتی ہے جب وہ اودھی کا برمحل استعمال کرتے ہیں۔ یہی وصف قیصر تمکین کے یہاں بھی پایا جاتا ہے کہ وہ حالات اور کردار کے مطابق زبان کا استعمال کرتے ہیں:

"ہائے رام غضب ہوئے گوا، کئی لوگوں نے سنسنی خیز لہجوں میں آوازیں لگائیں، لالہ گوپی چند دھوتی سنبھالتے ہوئے آگے بڑھے مگر تب تک مرزا بیدار بخت نے دو ہاتھ اور جڑ دیے۔ بندر کا بھیجا پھٹ گیا اور وہ وہیں تڑپ کر مر گیا۔

ہائے رے، دیا رے۔ کا کردیو مرجاتی، گلی کی کھنک عورتیں سنانے میں آگئیں۔

باپ رے باپ ہتیا ہوگئی۔ صرافوں کے شیطان لڑکے وحشت زدہ لہجوں میں چلائے۔ (گومتی سے ٹیمز تک: ڈاکٹر احسن ایوبی، ص 159)

مندرجہ بالا عبارت میں اودھی کو قیصر تمکین نے برملا اور برمحل استعمال کیا ہے۔ یہ اودھی کے وہ نشانات ہیں جن کے توسط سے کہیں بھی وہ پہچانے جا سکتے ہیں۔ انھوں نے زبان کا اسی طرح خلاقانہ اور ماہرانہ طور پر استعمال کیا ہے، جس کے نمونے ان کی کہانیوں میں جا بجا دیکھے جا سکتے ہیں۔

افسانوی انتخاب کے نام 'گومتی سے ٹیمز تک' میں نہ صرف ندرت ہے بلکہ اس میں معنویت بھی ہے۔ اس سے قیصر تمکین کی زندگی اور ان کے افسانوی سفر کی جانب بھرپور اشارہ بھی ملتا ہے۔ چونکہ وہ پیدا تو لکھنؤ میں ہوئے مگر جا کر لندن میں بس گئے تھے۔ لکھنؤ کے بیچ شہر سے نکلی گومتی ندی اگر یہاں کی لائف لائن ہے تو لندن میں واقع دریائے ٹیمز اس کا حسن ہے۔ ایک دریا سے دوسرے دریا تک کے سفر میں جو کہانیاں معرض وجود میں آئی ہیں، ان کا انتخاب اس میں موجود ہے۔ یوں بھی یہ زمانہ قدیم سے وطیرہ رہا ہے کہ زندہ قومیں دریا کے کنارے بستی اور آباد ہوتی رہی ہیں کیونکہ زندگی کے سوتے ان ہی دریاؤں سے پھوٹتے ہیں اور قیصر تمکین ایک دریا کے کنارے سے دوسرے دریا کے کنارے تک گئے اور ان پھوٹتے سوتوں سے سیراب ہوئے۔ ڈاکٹر احسن ایوبی نے بھی ان دونوں دریاؤں سے کچھ جرعے لے کر قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ اب قارئین کو فیصلہ کرنا ہے کہ ان میں آب حیات جیسا کچھ ہے۔ مجموعے کی ابتدا میں ڈاکٹر احسن ایوبی نے ایک طویل مقدمہ بھی تحریر کیا ہے جو قیصر تمکین کے افسانوں کی تفہیم کے لیے کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ امید ہے کہ اس مجموعہ کو قارئین کی توجہ ملے گی اور قیصر تمکین کے فنی اکتسابات سے واقفیت ملے گی۔

سوانح / شخصیات

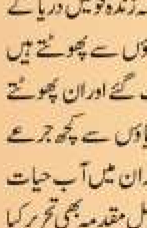

حفیظ نعمانی: ایک عہد - ایک تاریخ

مرتب: محمد اویس سنبھلی

صفحات: 552، قیمت: 500/روپے

ناشر: احساس ایجوکیشنل اینڈ سوشل ویلفیئر فاؤنڈیشن لکھنؤ

مبصر: محمد علیم اسماعیل (مہاراشٹر)

محمد اویس سنبھلی نوجوان ادیب اور صحافی ہیں۔ وہ ادب اور صحافت دونوں میدانوں میں کافی سرگرم ہیں۔ ان کی مرتب کردہ کتاب 'حفیظ نعمانی: ایک عہد - ایک تاریخ' ایک

عقیدت مند بھانجے کی جانب سے اپنے ماموں کو بہترین خراجِ عقیدت ہے۔ حفیظ نعمانی گھر والوں کی نظر میں، حفیظ نعمانی اربابِ علم وادب کی نظر میں، حفیظ نعمانی کی رحلت پر تعزیاتی نامے اور غم نامے، اردو صحافت اور حفیظ نعمانی، رودادِ قفس اور حفیظ نعمانی، بجھے دیوں کی قطار اور حفیظ نعمانی، قلم کا سپاہی حفیظ نعمانی۔ اس طرح کتاب میں کُل چھ ابواب ہیں اور ہر باب میں مختلف مضامین شامل ہیں۔

زیرِ نظر کتاب حفیظ نعمانی پر پہلا حوالہ جاتی اور دستاویزی نوعیت کا کارنامہ ہے۔ محمد اویس سنبھلی نے اسے ترتیب دینے میں خوب توانائی خرچ کی ہے، کڑی محنت کی ہے۔ محنت لگن اور دیوانگی کے بغیر ایسا کارنامہ انجام دیا ہی نہیں جا سکتا۔ اس ضخیم کتاب میں مختلف اور متنوع مضامین شامل ہیں۔ جو حفیظ نعمانی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا بھرپور احاطہ کرتے ہیں اور اس کے علاوہ ان کے عہد کی معلومات بھی فراہم کرتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ اس کتاب میں حفیظ نعمانی کی ادب دوستی، بیباک صحافت، ان کی دو کتابیں، رودادِ قفس اور بجھے دیوں کی قطار پر بھی اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ حفیظ صاحب کے انتقال کے بعد مختلف تعزیتی پیغامات کو بھی کتاب میں جگہ دی گئی ہے۔ کتاب میں شامل مواد کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں حفیظ نعمانی سے متعلق کوئی گوشہ تشنہ نہیں رہا۔

کتاب کے دوسرے باب 'حفیظ نعمانی اربابِ علم وادب کی نظر میں' میں کُل 33 مضامین شامل ہیں۔ جس میں پروفیسر شارب ردولوی، مشرف عالم ذوقی، معصوم مرادآبادی، سہیل انجم، انور جلال پوری، شاہنواز قریشی اور دیگر 30 اربابِ علم وادب کے مضامین کتاب کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ مجموعی طور سے دیکھا جائے تو اس کتاب میں اردو ادب وصحافت کے کئی آفتاب ومہتاب کے مضامین موجود ہیں۔ جنھوں نے حفیظ نعمانی کی علمی وادبی شخصیت پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔

حفیظ نعمانی میں خدمتِ خلق کا بھرپور جذبہ تھا۔ وہ ہر کسی کے کام آتے۔ ان کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا۔ ادب، صحافت، سیاست، علمی، ملی، سماجی اور سرکاری ہر طبقے کے افراد سے ان کے تعلقات تھے۔ خدا نے انھیں بھرپور صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ پہلے باب 'حفیظ نعمانی گھر والوں کی نظر میں' میں کُل چھ مضامین شامل ہیں۔ ان مضامین سے حفیظ نعمانی کی شخصیت کا ایسا کونسا حصہ ہے جو روشن نہیں ہوتا۔ اسی کے ساتھ ساتھ ان کے گھریلو معاملات اور سماجی زندگی پر بھی بھرپور روشنی پڑتی ہے۔

تیسرے باب 'اردو صحافت اور حفیظ نعمانی' میں پروفیسر شارب ردولوی، پروفیسر جمال نصرت، ندیم صدیقی، ڈاکٹر رضوان انصاری، ڈاکٹر رضاء الرحمٰن عاکف، راشد خان ندوی، محمد اویس سنبھلی اور محمد سعید اختر کے مضامین شامل ہیں۔

انجنا ایک شخصیت ایک شاعرہ

مرتب: ڈاکٹر فرقان سردھنوی
صفحات: 247، قیمت: 350 روپے
مطبع: روشان پرنٹرس، دہلی۔ 6
مبصر: حبیب سیفی، E-12/51B، فرسٹ فلور، حوض رانی، مالویہ نگر، نئی دہلی 17

زیرِ تبصرہ کتاب ڈاکٹر انجنا کی شخصیت اور فن شاعری پر مشتمل ہے۔ آپ ایک کلاس ون آفیسر ہونے کے باوجود اُردو شعر وادب کی دنیا میں آئیں، اور جس عزم وہمت اور لگن سے قدم اٹھائے تھے اس میں اردو والوں کی طرف سے پذیرائی کے بعد لگاتار اضافہ ہوتا چلا گیا، آج اردو شعر وادب کی دنیا میں ڈاکٹر انجنا سنگھ سینگر کا نام معروف ومقبول ہونے والوں کی فہرست میں شامل ہے۔ ان کی شاعری کے بہت سے لوگ معترف ہیں، جنھیں واقعی اُردو سے عشق ہے، جس کی نظیر اُردو زبان سیکھنے لکھنے پڑھنے سے ملتی ہے۔ اتر پردیش کے جالون ضلع میں قصبہ لٹاؤلی میں جنمی انجنا سنگھ سینگر کے ارادے بلند ہیں، اشعار کے ذریعے زمانے کو باور کرایا ہے کہ عورت کو صرف وفا کی دیوی، چکی، چوکا، چولہا اور چہار دیواری تک محدود نہ سمجھا جائے وہ عزم واستقامت سے حیات کے ہر شعبے میں مردوں کے شانہ بہ شانہ چلنے کی ہمت رکھتی ہے، اور دنیا میں اس کی مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں۔

مضامین کی فہرست دیکھ کر ایسا ہی اندازہ 'انجنا ایک شخصیت ایک شاعرہ' کتاب کے حوالے سے ہوتا ہے۔ کتاب کا مقدمہ اور شاعرہ کی شخصیت وشاعری پر مبنی سوانحی خاکہ دونوں ہی مرتب ڈاکٹر فرقان سردھنوی نے قلم بند کیے ہیں۔

انتساب سینئر آئی اے ایس (IAS) آفیسر شاعرہ کے رفیق حیات چندر بھوشن سنگھ حال کے مجسٹریٹ علی گڑھ کے نام اور مرتب نے اپنی بیٹیوں ماہبہ مرزا اور نائلہ مرزا کے نام کیا ہے۔ کتاب مرتب کرنے میں ڈاکٹر فرقان کی معاونت ڈاکٹر محمد مستمر نے کی ہے، آپ ہریانہ اردو اکامی سے وابستہ تھے، لیکن ان دنوں دہلی میں درس وتدریس سے منسلک ہیں۔

شیخ الجامعہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پروفیسر طارق منصور کا ماننا ہے کہ انجنا کی شاعری سادہ اور پرکاری کی بہترین ترجمان ہے۔ پروفیسر شافع قدوائی کے مطابق انجنا سنگھ کی شاعری میں دیہی ماحول میں عورت کی شبیہ مستحکم ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ سابق صدر شعبۂ اردو اے ایم یو پروفیسر ظفر احمد صدیقی کا خیال ہے ڈاکٹر انجنا کا اُردو مجموعۂ کلام بھی معیاری مضمون کے زمرے میں آتا ہے۔

پدم شری اختر الواسع نے نسائی لہجے کی قابل فخر شاعرہ کے القاب سے نوازا ہے۔ وجیندر سنگھ پرواز نے اس شاعری کو نایاب پھولوں کا بے نظیر گلدستہ قرار دیا ہے۔ منور رانا کی زبانی ان کی اکثر غزلوں سے پرانی یادوں کی خوشبو آتی ہے۔ ڈاکٹر محمد مستمر نے اپنے مضمون میں انجنا کی شاعری کے نفسیاتی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ پروفیسر عبدالعلیم، اور پروفیسر شمبھو ناتھ تواری نے زندگی کے گہرے احساس اور جذبات سے بھری انجنا کی غزلوں اور نظموں کی نہ صرف ستائش کی ہے بلکہ ڈاکٹر انجنا کے اُردو سے عشق کی بنیاد پر ذات سے نکلنے والے شعری جوہر بھی تلاشے ہیں، یہ وہ جوہر ہیں جو آئندہ نسلوں کی اُردو دوستی کی مثال ثابت ہوں گے، اور شعر وادب میں رہنمائی کریں گے۔

ہندی کے (آلوچک) نقاد ڈاکٹر راجیش کمار نے انجنا کی شاعری کو تخلیقی بیان کی فنی خصوصیات سے حامل قرار دیا ہے۔ دیگر نے بھی اپنی علمی استعداد کے اعتبار سے ڈاکٹر انجنا کے کلام کا محاسبہ کیا ہے اور اشعار کی تہوں میں اتر کر شاعری کا تجزیہ کیا ہے، سمجھنے کے بعد قارئین کو سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ کس طریقے کی شاعری بہترین شاعری کا درجہ رکھتی ہے۔ اپنے تبصرہ میں دو شعر نقل کر کے ذرا تحریر کا رنگ کسی قدر مزید رنگین کرتا ہوں۔

یہی میں خدا سے دعا کر رہی ہوں　　زباں سے کروں میں سدا حق بیانی
اب خواب بھی دیکھوں تو حقیقت کی نظر سے　　ہو خواب مرا چشمِ بصیرت بھی تم ہی ہو

کتاب کے مرتب ڈاکٹر فرقان احمد سردھنوی شاعری کے رموز سے پوری طرح واقف ہیں، زبان وبیان بھی انتہائی شگفتہ اور دلکش ہے۔

عام فہم انداز واسلوب کی سادگی طبیعت کو متاثر کرتی ہے، فروغ اُردو کے اس اقدام کے لیے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ سوانحی کوائف میں ڈاکٹر انجنا سنگھ سینگر کی تعلیمی، ادبی، فلاحی اور روزمرہ کی مشغولیات کے ساتھ ساتھ تصانیف کی اشاعت کے حوالوں کا اختصار سے ذکر کیا ہے۔

ڈاکٹر انجنا سنگھ سینگر کا تصور قومی یکجہتی، فرقہ وارانہ ہم آہنگی، نئی نسل کی ذہن سازی اور فروغ اردو کے تناظر میں شاعری پر لکھے گئے مضامین کی معرفت انجنا کی مقبولیت وشہرت میں مزید اضافہ ہوگا اور ڈاکٹر فرقان احمد سردھنوی کی یہ علمی کوشش بھی قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

سائنس

قرآن اور تخلیق انسانی

مصنف: (کیپٹن) ڈاکٹر ایم ایم شیخ
صفحات: 136، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2019
ناشر: ڈاکٹر ایم ایم شیخ
مبصر: آصفہ زینب، ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، 110025

زیرِ نظر کتاب ڈاکٹر ایم ایم شیخ کی تازہ ترین تخلیق ہے۔ اس میں قرآن اور حدیث سے استدلال کرتے ہوئے ان نشانیوں کے بارے میں مفید سائنسی معلومات کو یکجا کیا ہے۔ اس میں انھوں نے بعض اہم موضوعات جیسے وجود کائنات، وحدت نسل انسانی، اللہ تبارک تعالیٰ کا طریقہ تخلیق، رائج نظریات تخلیق، تخلیق انسانی میں مٹی اور پانی کا کردار، حضرت آدم علیہ السلام، حوا علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہا السلام کی پیدائش، تخلیق انسانی میں خلیہ کی اہمیت، اس کی ساخت، اس کے اندر موجود جینی مادہ کروموزومس اور ڈی۔ این۔ اے وغیرہ پر بھی مفید سائنسی معلومات پیش کی ہیں۔

اس کتاب میں تقریباً چھبیس عنوانات کے تحت مختلف سائنسی موضوعات پر قرآن کی روشنی میں مدلل بحث اور علم جینیات پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ اس کا پہلا باب کائنات کے وجود کے متعلق ہے اور آخری انسان میں جنس کا تعین، اس سے قبل رحم مادر کے تین پردوں پر تحقیقی معلومات افزا باب ہیں۔ جہاں جہاں ضرورت محسوس ہوئی ہے، وہاں انھوں نے اشکال کے ذریعے وضاحت بھی کی ہے۔ اس میں قاری کا دھیان اس بات کی طرف کھینچنے کی کوشش کی ہے کہ دنیا میں انسان کی پیدائش کا عمل چار طریقوں سے ظہور میں آیا ہے، جو سلسلہ وار اس طرح ہے:

پہلا طریقہ:- حضرت آدم علیہ السلام بغیر والد اور والدہ کے آئے۔ دوسرا طریقہ: ماں حوا علیہا السلام کی والدہ نہیں تھیں۔ تیسرا طریقہ: عام انسانی تخلیق ہے، جس میں والد اور والدہ دونوں اس ذمہ داری کے حامل ہیں۔ چوتھا طریقہ: عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش ہے، جن کے والد نہیں تھے۔ اس میں انھوں نے مختصراً طب کی تاریخ بیان کرتے ہوئے ان تمام سائنسدانوں یعنی اطبا کے نظریات کا بھی احاطہ کیا ہے جو وہ انسانی تخلیق کے بارے میں رکھتے ہیں۔ جن میں انھوں نے تخلیق انسانی کے سلسلے میں قرآن کریم کے سائنسی اعجاز اور حقانیت کا اعتراف کیا ہے نیز اس میں مصنف نے انسانی تخلیق کے وہ تمام مراحل، جن کی طرف قرآن حکیم نے اشارے کیے ہیں، انھیں سلسلے وار طریقے سے بیان کیا ہے اور ان کی تشریح کو مزید واضح اور قابل فہم بنانے کے لیے مختلف اشکال کا سہارا لیا ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ قرآن پاک کوئی سائنسی کتاب نہیں لیکن اس میں جن تخلیقی و دیگر علمی نکات کا اشارہ دیا گیا اور حیاتیاتی ارتقا کے نظریے پر روشنی ڈالی گئی ہے وہ موجودہ سائنس سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں۔

اس کتاب میں قرآن کی مختلف آیات کی روشنی میں انسانی تخلیق کے مراحل کا سلسلہ وار ذکر مندرجہ ذیل ہے: نطفہ، علقہ، مضغہ، عظم، لحم

پہلا مرحلہ: نطفہ: جو حقیر پانی کی بوند پر مشتمل ہے۔ رحم مادر میں ٹپکایا جاتا ہے۔
دوسرا مرحلہ: علقہ: جو جونک نما پھٹکی جس میں گہری سرخی ہو اور سوکھا ہوا نہ ہو۔
تیسرا مرحلہ: مضغہ: (بوٹی) گوشت کا اتنا بڑا ٹکڑا جسے چبایا جا سکے۔
چوتھا مرحلہ: عظم: پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائی۔
پانچواں مرحلہ: لحم: پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا۔ اسی طرح ریڑھ کی ہڈی اور پسلیوں کے درمیان سے خارج ہونے والا قطرہ بھی اہمیت رکھتا ہے۔

اس کتاب میں مختلف تصاویر کی مدد سے نفس مضمون پر تفصیلی معلومات دی گئی ہیں اور رحم مادر کے تین پردوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ جو اس طرح ہے۔

ایک رحم مادر کی اگلی دیوار، دوسرا رحم مادر کی دیوار، اور تیسرا غلاف جو جنین اور اس کے گرد لپٹی ہوئی جھلی پر مشتمل ہے۔ آخر میں انسان میں جنس کا تعین بھی بتایا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ بچے کے جنس کی تعین میں مردانہ تولیدی مواد ہی ذمہ دار ہے، عورت کا اس میں کوئی قصور نہیں۔

بہرکیف یہ بات بڑے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ مصنف نے اس کتاب کے ذریعے نہایت علمی انداز میں اس حقیقت کو مثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قرآن پاک گو کہ کوئی سائنسی کتاب نہیں لیکن اس میں جن تخلیقی و دیگر علمی نکات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ موجودہ سائنس سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں۔

شاعری

عکس گم گشتہ

شاعر: شعیب نظام
صفحات 148 قیمت 600 روپے، سن اشاعت 2021
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی
مبصر: رفعت عزمی، بی 314، سول لائنس، بارہ بنکی۔ 225001

اس حقیقت کو اردو شاعری کا طربیہ کہا جائے یا المیہ کہ مختلف اصناف سخن کی موجودگی کے ہوتے ہوئے اردو شعرا عموماً غزل جیسی نیم مہذب صنف سخن (کلیم الدین احمد نے غزل کو نیم وحشی صنف سے تعبیر کیا تھا) پر کثرت سے طبع آزمائی کیا کرتے ہیں۔ میر تقی میر کو اپنا پیر تسلیم کرنے والے شعیب نظام اس روایت سے کیسے منحرف ہونے کی جسارت کر سکتے تھے۔

'عکس گم گشتہ' کے مطالعے کے بعد پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر قاضی جمال حسین، انیس اشفاق، فرحت احساس، شافع قدوائی اور پروفیسر احمد محفوظ کے ناقدانہ خیالات کا ادراک ہونا اور ان کی روشنی میں شعیب نظام کی غزلوں کا جائزہ پیش کرنا خاصا دشوار تھا۔

آیئے شعری مجموعے 'عکس گم گشتہ' کے حوالے سے شعیب نظام کے کلام پر گفتگو کی جائے۔

اگر سنے تو کسی کو یقیں نہیں آئے ۔۔۔ مکاں بلاتے رہے اور مکیں نہیں آئے

شعر میں اپنا گھر چھوڑ کے جانے والوں کا المیہ صاف صاف ظاہر ہوتا ہے، اس کے علاوہ ہجرت کے محرکات کی جانب بھی توجہ کی گئی ہے کہ کن اسباب سے مکینوں نے مراجعت کو ترجیح نہیں دی 'نہیں آئے' ردیف نے مطلع کو اجتماعی معنویت کے پہلو سے ہمکنار کر دیا ہے، مستزاد یہ کہ زبان کے اعتبار سے 'اگر' لفظ کے استعمال نے شعر کا لطف بڑھا دیا ہے۔

بظاہر ساکت و جامد کھڑے تھے ۔۔۔ سفر اندر سفر دیکھا تو جانا

بتایا گیا ہے کہ سفر صرف قدم رنجہ ہونے کا نام نہیں، ظاہر اور باطن میں فرق ہوتا ہے۔ سفر ذہنی کیفیت کے سہارے بھی ممکن ہے، زندگی سفر میں پوشیدہ ہے، ایک سفر ختم ہوتا ہے تو دوسرے سفر کی فکر لاحق ہو جاتی ہے اور پھر منزل در منزل سفر کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ روح بیدار ہو تو ایسا ہوا کرتا ہے۔ کچھ شعر صدا اور آواز کے حوالے سے دیکھتے ہیں۔

کیا میسر آ گیا مجھ کو ہوا کا التفات ۔۔۔ اب مری آواز شاید دور تک جانے لگی
میں تو بڑھتا جا رہا ہوں کوہ کی آواز پر ۔۔۔ دیکھنا یہ ہے کہاں تک یہ صدا لے جائے گی
پھر تو اک دن ڈوب جائے گی صدائے احتجاج ۔۔۔ ہم اگر آواز کی لے روز کم کرتے رہے

شاعر کو اس بات کا علم ہو گیا ہے کہ اس کی بات دور تک پہنچنے لگی ہے لیکن اسے حیرانی بھی ہے کہ یہ کیسے ممکن ہوا؟ پھر خود کلامی کے انداز میں وہ ہوا ساز گار ہونے کے یقین کا متحمل ہو جاتا ہے کہ آثار اچھے نظر آ رہے ہیں، پھر بھی شاید کی خلش موجود رہتی ہے۔

دوسرا شعر اس اعتبار سے مختلف ہے کہ کوہستانی علاقوں میں نکتۂ ارتعاش (Echo Point) ہوا کرتا ہے یا ہوا کرتے ہیں جہاں سے پکارنے پر آواز گونجنے لگتی ہے اور پھر وہ رفتہ رفتہ پوری وادی میں پھیل جاتی ہے۔ یہ مرحلہ سلسلے وار جاری رہتا ہے، غالباً اسی لیے

شاعر نے ساعت کے لطف کی بنیاد پر سفر کی حد کا تعین نہیں کیا ہے۔

اس ضمن کا آخری شعر بالکل جداگانہ نوعیت کا حامل ہے، جس میں ایک تشویش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فکرمندی کا اظہار کیا گیا ہے کہ آواز کی لے کو بلند کیے بغیر مسئلہ حل ہونے والا نہیں، یہ دنیا گراں گوش ہے۔ اگر آواز میں دم نہیں رہا تو صدائے احتجاج توانائی سے محروم ہو جائے گی اور پھر تحریک کا مستقبل عدم استحکام کی زد میں آجائے گا۔

شعر میں رجائیت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جو ترقی پسندی سے یکسر مختلف ہے۔

مستعار رنگوں کا جب خیال آتا ہے گل سے تتلیوں کے پر التماس کرتے ہیں

یہ شعر اپنی رعنائی، رنگینی اور جدت طرازی کی وجہ سے مخصوص جمالیاتی احساس کے پیکر کا آئینہ دار ہے، مستعار رنگوں کی بات غور کرنے پر مجبور کرتی ہے کہ یہ رنگ کہاں سے لیے گئے ہیں اور پھر ایک بھرے پرے شاداب چمن کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ یہ شعر دیکھتے ہیں۔

اگر یہ طے ہے کہ گلبرگ ٹوٹ بکھریں گے تو کیوں سموم سے باد صبا غنیمت ہے

شعر میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ اگر چمن کی تباہی یقینی ہے تو پھر باد صبا کو سموم پر کیوں ترجیح دی جائے۔ مثبت اور منفی فکر رکھنے والے ہر دو طرح کے افراد اپنا جواز پیش کرنے کے لیے آزاد ہیں۔

جب آپ 'عکس گم گشتہ' کا از خود مطالعہ کریں گے تو یہ بات سمجھ میں آجائے گی کہ یہاں شعیب نظام کے جستہ جستہ اشعار ہی پیش کیے ہیں۔

تمام عمر اسی احتیاط میں گزری کہ مرحلے ہیں بہت عاشقی سے پہلے بھی

اسے دیکھتے ہی محشر لکھنوی کا یہ شعر یاد آگیا۔

تمام عمر اسی احتیاط میں گزری کہ آشیانہ کسی شاخ گل پہ بار نہ ہو

اس سلسلے میں کسی قسم کے تبصرے سے گریز کرتے ہوئے یہ بتانا ہے کہ ایسا ہو جایا کرتا ہے۔ اب اس مصرعے کو لیجیے۔

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

فانی بدایونی نے جسے غزل کے مطلع میں مصرع اولیٰ بنایا ہے۔

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم

شاد عظیم آبادی کے ہاں اس کا استعمال مصرع ثانی کے طور پر کیا گیا ہے۔

سنی حکایت ہستی تو درمیاں سے سنی نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

عکس گم گشتہ کا ایک اور شعر دیکھتے ہیں۔

دنیا سے دنیا میں رہ کر کیسے کنارہ کر رکھا ہے
دیکھ تو آکر کس صورت سے ہم نے گزارہ کر رکھا ہے

پرانی بات نئے انداز سے کہی گئی ہے۔ اکبر الہ آبادی کا شعر تصدیق کے لیے حاضر ہے۔

دنیا میں ہوں دنیا کا طلبگار نہیں ہوں بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں

کچھ اور اشعار بلا تبصرہ تحریر کرنے کے بعد مختصراً موقف ظاہر کیا جائے گا کہ شعیب نظام کے شعری مجموعے عکس گم گشتہ کے بارے میں تبصرہ نگار کی کیا رائے ہو سکتی ہے۔

سیر لاسمتی سے بھی لاحاصلی کا لطف لے ریگ صحرا بے صدا و بے شجر ہے بھی تو کیا

خوشی میں غم ملا لیتے ہیں تھوڑا یہ سرمایہ بڑھا لیتے ہیں تھوڑا

پھر در دل پر ہوئی ہیں روشنی کی دستکیں پھر ستارہ سا کوئی بالائے بام آتا ہوا

شوق جب حد سے سوا ہو تو کسے سوجھتی ہے کتنی پونجی لگی اور کتنا کمایا اس نے

زہر کی کہنہ روایت ہی کا ڈر ڈس جائے گا جسم سے لپٹی یہ ناگن بے ضرر ہے بھی تو کیا

یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ شعیب نظام کا نام جدید لب و لہجہ رکھنے والے شاعروں کی فہرست میں جگہ پانے کا مستحق ہے، لیکن منچندا بانی، ظفر اقبال، زیب غوری، عرفان صدیقی اور شہریار کی تیار کردہ شعری فضا سے باہر آنے کے لیے انھیں کافی محنت کرنی پڑے گی۔ اگر وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو ان کا آئندہ شعری مجموعہ اس کی گواہی میں ضروری معاون ثابت ہوگا۔ شعیب نظام کا شعری مجموعہ 'عکس گم گشتہ' عمدہ شاعری اور معیاری طباعت سے آراستہ ہے۔

تشکیل (شعری مجموعہ)

شاعر و ناشر: اختر شاہجہاں پوری

صفحات: 352، قیمت: 300 روپے

مبصر: ڈاکٹر حمیرا حیات، 1033، حویلی بختاور خاں، بازار ضیا محل، دہلی 6

زیر تبصرہ کتاب بعنوان 'تشکیل' اختر شاہجہاں پوری کا پانچواں شعری مجموعہ ہے۔ اختر شاہجہاں پوری اپنے معاصرین کے درمیان ایک معتبر مقام رکھتے ہیں۔ چار شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان مجموعوں کو اتر پردیش اردو اکادمی اور بہار اردو اکادمی نے انعام اور اوارڈ سے نوازا۔ اختر شاہجہاں پوری کا کلام نہ صرف ہندوستان بلکہ کشمیر سے کنیا کماری تک کے رسائل میں شائع ہو چکا ہے۔ علاوہ ازیں پاکستان، امریکہ، انگلینڈ، جرمنی، اسپین، سویڈن، کویت وغیرہ ممالک کے مختلف رسائل و جرائد میں ان کی غزلیں شائع ہو چکی ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب تشکیل ان کی ہزاروں غزلوں سے انتخاب ہے۔

کتاب میں تیرہ مضامین کے علاوہ حمد، نعت، نظمیں اور منتخب غزلیں موجود ہیں۔ زیادہ تر مضامین تنقیدی و تاثراتی ہیں۔ مختلف ادبا نے شاعر کے کلام پر اپنے خیالات پیش کیے ہیں۔ ان مضامین میں ڈاکٹر قمر رئیس کا 'اختر جہاں پوری کی شاعری پر ایک نظر' تسنیم فاروقی کا 'شاعر کی ذات خود تحریک ساز' ڈاکٹر اشفاق محمد خاں' قابل قدر جدید شاعر' بیکل اتساہی کا 'کلاسکی غزل میں تشکیل نو کا کامیاب رہگیر اختر شاہجہاں پوری' عشرت ظفر کا 'غزل میں نئے موسموں کی تجسیم'، خالد یوسف کا 'اختر شاہجہاں پوری: اجالوں کا سلسلہ'، احسن امام احسن کا 'فکر و احساس کا شاعر'، تسنیم فاروقی کا 'شاعر کی ذات خود تحریک ساز'، وغیرہ اہم مضامین شامل ہیں۔ ان مضامین سے شاعر کی شخصیت و شاعری فنی بصیرت، اسلوب و انداز بیان کا تفصیلی جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر قمر رئیس رقمطراز ہیں کہ "اختر شاہجہاں پوری اپنے وطن کے ان گنے چنے شعرا کی صف سے تعلق رکھتے ہیں جنھوں نے روایتی شاعری کے نازک ہنر سے کسب فیض تو کیا لیکن جنھوں نے اپنی روشنی طبع پر اعتماد کر کے فکر سخن کی وادی میں قدم بڑھایا۔ روایتی شاعری سے انھوں نے وہی لفظیات اور اظہار ادا کے صرف وہی انداز سیکھے جو ان کی اپنی بساط فکر و احساس سے مناسبت رکھتے تھے یا ان کے تخلیقی عمل میں ایک مثبت کردار ادا کر سکتے تھے۔" (ص 12)

بلا شبہ ان کی غزلوں میں فکر و احساس کی ندرت کو ایسے شعری پیکروں میں پیش کیا گیا ہے جو روایت اور جدید اظہار و ادا کے لطیف امتزاج سے عبارت ہوتے ہیں۔ داخلی اور خارجی دنیا کے حوادث و حقائق کو اکثر کھلے ذہن سے دیکھتے اور کسی اشتعال کے بغیر ان کی کیفیت کو دھیمے دھیمے محسوس کرتے ہیں۔ وہ مضمون آفرینی کے بجائے پیکر آفرینی پر زور دیتے ہیں۔ مثلاً

ریت کی طرح مٹھیوں میں بند لمحہ لمحہ بکھر رہا ہوں میں

ہوا مجھ کو بہت بھٹکا رہی ہے سمجھتی ہے کہ صحرا کی صدا ہوں

غزل کے حسن کو نکھارنے میں انھوں نے سادہ لفظی، سلاست و روانی اور تشبیہات کا خوبصورت استعمال کیا ہے۔ جو ان کی شاعری کی جان ہے۔ مثلاً

ہوا کے دوش پہ اڑتا ہے اختر جو پتہ شاخ سے ٹوٹا ہوا ہے

اختر یہ کیا تضاد مری زندگی میں ہے پوشیدہ آنسوؤں کی طرح قہقہے میں ہوں

ان کی غزلوں میں اختصار کے ساتھ گفتگو ان کے کلام کی جان ہے۔ اختر شاہجہاں پوری کی زیادہ تر غزلیں چھوٹی بحروں میں نظر آتی ہیں جن سے شعری قرات اور نغمہ پردازی میں روانی اور آسانی میسر آتی ہے۔ نرم اور دھیمے لہجے میں الفاظ الگ سے جادو بیانی

کرتے نظر آتے ہیں۔مثلاً

میری آواز ہے میری آواز ــــ چاروں اطراف فسوں ہے میرا
کب صدائے جرس سنائی دے ــــ قافلہ کب روانہ ہو جائے

احسن امام احسن لکھتے ہیں:"اب ایسا بھی نہیں کہ وہ روایت سے انحراف کرتے ہیں یا جدیدیت کو پسند نہیں کرتے ہاں ان دونوں کے بیچ ایک نئی راہ نکال لیتے ہیں۔ان کے اشعار میں احساس وشعور کا اظہار خوبصورت طریقے سے ہوتا ہے۔ان کے اشعار دل کو چھوتے ہیں۔ص(78) مثلاً

کہیں اس میں نہ کوئی مصلحت ہو ــــ وہ میرا ہم زباں لگنے لگا ہے
خیال وفکر میں خدشہ نئے عذاب کا ہے ــــ ارادہ اس لیے اپنے بھی احتساب کا ہے

ہر شاعر کی اپنی الگ دنیا ہوتی ہے اسے اپنی ذمہ داریوں کا احساس رہتا ہے۔ تجربے اور مشاہدے کی مضبوطی اور بلند حوصلہ اسے آگے بڑھنے کا وجدان عطا کرتا ہے۔ اختر شاہجہاں پوری کی بھی شاعر کی حیثیت سے ایک الگ دنیا ہے۔تجربے اور مشاہدے کی مضبوطی اور بلند حوصلہ انھیں آگے بڑھاتا ہے۔وہ خود فرماتے ہیں ۔

میں تو اک ایسا مسافر ہوں جو تھکتا ہی نہیں ــــ اپنی منزل سے بھی آگے کوئی جادہ چاہوں

اختر شاہجہاں پوری کے کلام کا جائزہ لینے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اختر کی شاعری میں ابہام نہیں بلکہ حقیقت پسندی ہے۔ان کے کلام میں ایسے بہت سے اشعار مل جاتے ہیں جن میں احساسات وجذبات کے ساتھ ساتھ فکر وعمل بھی موجود ہے۔مثلاً

اک صدی کا عذاب دیکھ لیا ــــ ہم نے گنتی کے چند سالوں میں
ہوا کے دوش پہ اڑتا ہے لیکن ــــ میں گھر کا راستہ بھولا نہیں ہوں

جہاں تک کتاب میں موجود نظموں کی بات ہے تو کل سات آزاد نظمیں مختلف عنوانوں جیسے 'پاسبانی کر خدا'،'بندگی ہے تیری آواز'،'بنت حوا'،'دشت بدن'،'ہوا خوشبو'،'اردو زبان'، 'اسرار ناروی' ہیں۔ان نظموں میں سادگی ،اختصار، گہرائی وگیرائی کے ساتھ ایک تسلسل ہے۔

مختصر یہ کہ زیر تبصرہ کتاب اردو شائقین کے لیے تو دلچسپی کا باعث ہوگی ساتھ ہی اردو ادب میں شاعری کے حوالے سے ایک اہم اضافہ بھی ہے۔اختر شاہجہاں پوری کو اس ادبی کوشش کے لیے ڈھیروں مبارکباد۔

رسائل و جرائد

ہندوستانی زبان (جنوری تا مارچ 2022 :اکبرالہ آبادی نمبر)

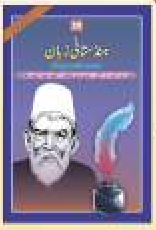

مدیر اعلیٰ: سنجیو نگم ،نائب مدیر: ڈاکٹر شیخ احرار احمد

قیمت 70 روپے ،سالانہ: 250 روپے

ناشر: مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سینٹر،مہاتما گاندھی میموریل بلڈنگ 7 نیتاجی سبھاش روڈ، چرنی روڈ، ممبئی۔ 400002 (مہاراشٹر)

موبائل: 22812871

مبصر: حقانی القاسمی، B-145/8 ،فورتھ فلور،ٹھوکر نمبر 8،شاہین باغ، نئی دہلی۔ 25

سہ ماہی 'ہندوستانی زبان' ہندوستانی پرچار سبھا،مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سینٹر ممبئی سے شائع ہونے والا مجلہ ہے۔اس کا پہلا شمارہ اکتوبر 1969 میں لسانیات کے محقق پروفیسر عبدالستار دلوی کی ادارت میں شائع ہوا تھا۔پہلے یہ دولسانی (ہندی اور دیوناگری) سالانہ مجلہ تھا جس میں گاندھی جی کے تصور 'ہندوستانی' کا صحیح عکس نظر آتا تھا۔بعد میں یہ دو الگ الگ رسم الخط میں شائع ہونے لگا۔اس کی ادارت سے اہم شخصیات وابستہ رہی ہیں۔سید علی عباس نے بھی ایک عرصے تک اس رسالے کی ادارت کی ہے۔جولائی -ستمبر 2019 سے یہ رسالہ ہندوستانی پرچار سبھا کے ڈائرکٹر سنجیو نگم کی ادارت اور نگرانی میں شائع ہوتا ہے اور نائب مدیر کی حیثیت سے ڈاکٹر شیخ احرار احمد اس مجلے سے وابستہ ہیں۔ ہندوستانی زبان کے کئی خصوصی شمارے شائع ہو چکے ہیں جن میں مہاتما گاندھی نمبر، احتجاج نمبر،شمس الرحمن فاروقی نمبراور تازہ اشاعت اکبرالہ آبادی نمبر قابل ذکر ہے۔

اکبرالہ آبادی (پ:16 نومبر 1846،و:9 ستمبر 1921) اردو کے ایسے شاعر ہیں جن کے افکار واقدار کے حوالے سے بہت سے تنقیدی اور تحقیقی مطالعات سامنے آچکے ہیں جن میں حیات اکبرالہ آبادی (عشرت حسین)، بزم اکبر (قمر بدایونی)، لسان العصر (عبدالرحمن طارق)، اکبرالہ آبادی: تحقیقی وتنقیدی مطالعہ (ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا)، اکبرالہ آبادی: ایک سماجی وسیاسی مطالعہ (فصیح ظفر)، اکبر کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ (صغرا مہدی)، اکبرالہ آبادی (طالب الہ آبادی)، اکبرالہ آبادی اوران کا کلام (نورالرحمٰن)، اکبر اس دور میں (اختر انصاری اکبرآبادی)، ذکر وفکر اکبرالہ آبادی (عبدالماجد دریابادی، مرتب: حبیب احمد قدوائی)، اکبرالہ آبادی اپنے کلام کی روشنی میں (پنڈت پدم کانت مالویہ)، اکبرالہ آبادی نئی تہذیبی سیاست اور بدلتے اقدار (شمس الرحمن فاروقی)، اکبرالہ آبادی: اپنی شکست کی آواز (اسیم کاویانی) قابل ذکر ہیں۔ان میں اسیم کاویانی کی 2021 میں شائع شدہ تازہ ترین کتاب اس لحاظ سے بہت وقیع ہے کہ انھوں نے اکبر کے تعلق سے بہت سے عالمانہ بیانات کو دلائل کے ذریعے مسترد کیا ہے اور اکبرالہ آبادی کی شاعری اور شخصیت کے تعلق سے الگ زاویہ نظر پیش کیا ہے۔اکبرالہ آبادی پر بہت سے رسائل کے خصوصی شمارے بھی شائع ہو چکے ہیں جن میں علی گڑھ میگزین کا اکبر نمبر (1950) اور سہ ماہی 'فکر وتحقیق' کا اکبرالہ آبادی نمبر (جنوری-مارچ 2009) خاص ہیں۔ 1921 میں اکبرالہ آبادی کی وفات کے 100 سال پورے ہونے پر اخبارات ورسائل میں ان پر خصوصی تحریریں شائع کی گئیں۔سہ ماہی 'ہندوستانی زبان' کی یہ تازہ اشاعت بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جس میں اکبرالہ آبادی سے متعلق سیفی سرونجی، سلیم محی الدین، عرشیہ جبین، عبداللہ امتیاز احمد، پرویز احمد اعظمی، قاضی نوید، مامون رشید، علی بیات، شیخ احرار احمد، آفتاب عالم اعظمی، صالحہ صدیقی، محمد تابش خان، مقتدار احمد میر، شاہجہاں کے مضامین ہیں۔ان تمام قلمکاروں نے اکبرالہ آبادی کی شخصیت اور شاعری کے مختلف زاویوں اور جہات پر روشنی ڈالی ہے اور اکبر کے فکری اور لسانی امتیازات کو بھی روشن کیا ہے۔لسان العصر اکبرالہ آبادی کے بہت سے ایسے افکار وتصورات ہیں جو پہلے بھی تنقیدی ڈسکورس کا حصہ بن چکے ہیں، خاص طور پر سامراجی نوآبادیاتی نظام پر تنقید اور مشرق کی تہذیبی، ثقافتی اقدار کے تحفظ اور تعلیم نسواں کے تعلق سے گفتگو کی جاتی رہی ہے۔ انھیں مغربی تہذیب اور طرز تعلیم کا مخالف بھی کہا جاتا رہا ہے۔روایت پرست، رجعت پسند بھی قرار دیا جاتا رہا ہے۔انھوں نے اپنی طنزیہ شاعری کے ذریعے بہت سے کرداروں کو طنز کا نشانہ بھی بنایا ہے جن میں اعلیٰ اور پست دونوں طبقات کے کردار شامل ہیں۔انھوں نے اپنی شاعری میں جو علامات اور لفظیات استعمال کی ہیں، ان پر بھی کئی زاویوں سے گفتگو ہوتی رہی ہے۔اکبرالہ آبادی کے بہت سے اشعار بھی زبان زد خاص وعام ہیں۔جیسے

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام ــــ وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا
قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکام کے ساتھ ــــ رنج لیڈر کو بہت ہے مگر آرام کے ساتھ
رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں ــــ کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

اس طرح اکبرالہ آبادی کی شاعری سے عوامی ذہن کا رشتہ اب بھی قائم ہے۔ادبی اور علمی حلقوں نے بھی اکبرالہ آبادی کو فراموش نہیں کیا ہے، اس لیے رسائل ومجلات میں ان کی شخصیت اور شاعری کے حوالے سے نئے زاویے بھی سامنے آتے رہتے ہیں۔ 'ہندوستانی زبان' کے اکبرالہ آبادی نمبر میں بھی کچھ وقیع تحریریں شامل ہیں جن سے اکبر شناسی میں قارئین کو مدد مل سکتی ہے۔ ■

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

’ہندوستانی معاشرے کے کثیر لسانی موزیک میں مادری زبان کا استعمال‘ کے عنوان سے آن لائن مذاکرہ

نئی دھلی: بین الاقوامی یوم مادری زبان کی مناسبت سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے زیر اہتمام ’ہندوستانی معاشرے کے کثیر لسانی موزیک میں مادری زبان کا استعمال‘ کے عنوان سے ایک آن لائن مذاکرے کا اہتمام کیا گیا، جس میں کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے عالمی یوم مادری زبان کے پس منظر و اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ہم خوش قسمت ہیں کہ ہمارے ملک میں ایک عظیم لسانی روایت پائی جاتی ہے اور ہم لسانی و تہذیبی تنوع کے اعتبار سے ایک غیر معمولی قوم ہیں۔ شیخ عقیل نے کہا کہ اگر ہم اپنی مادری زبان کی حفاظت کرتے اور اسے فروغ دیتے ہیں، تو اس سے ہندوستان کے لسانی و تہذیبی تنوع کا بھی تحفظ ہوگا اور اسے ترقی بھی حاصل ہوگی۔ انھوں نے زور دیا کہ مادری زبان میں مہارت حاصل کرکے ہی ہم اپنی تہذیب کو سمجھ سکتے ہیں۔ پروفیسر عقیل نے مزید کہا کہ بھارت سرکار نے مختلف زبانوں کے الگ الگ ادارے بنائے ہیں تاکہ ان زبانوں کو فروغ دیا جائے اور یہ ادارے اس سلسلے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان بھی بھارت سرکار کے زیر سرپرستی سرگرم عمل ادارہ ہے، جو اردو زبان کی نشر و اشاعت اور اس کی ترقی کے لیے کام کرتا ہے۔ اس کی اسکیمیں اور پروگرام پورے ملک میں چلتے ہیں جن کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ اس زبان کے علمی و ادبی ذخیرے میں اضافہ کرنے کے ساتھ اس کا دائرہ وسیع کیا جائے۔ انھوں نے قومی تعلیمی پالیسی 2020 کے حوالے سے کہا کہ وزیر اعظم نریندر مودی کی سربراہی میں تیار کی گئی جامع اور مفید تعلیمی پالیسی میں آٹھویں شیڈول میں درج تمام زبانوں کے تحفظ اور فروغ کی ضمانت دی گئی ہے، جن میں اردو بھی شامل ہے۔ اس پالیسی میں مادری زبان کے فروغ اور تعلیم پر خاص توجہ دی گئی ہے۔

مذاکرے میں حصہ لیتے ہوئے مہاتما گاندھی انتر راشٹریہ ہندی وشو ودیالیہ کے سابق وائس چانسلر پروفیسر گریشور مشرا نے کہا کہ آزادی کے طویل عرصے بعد بھی ہم لوگ ذہنی غلامی کے شکار ہیں اور اپنی علمی و عملی زندگی میں مادری زبان کے بجائے انگریزی کے استعمال کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہم سوچتے کسی زبان میں ہیں اور بولتے کسی اور زبان

میں ہیں، اس سے ہماری انفرادی و اجتماعی ترقی پر منفی اثر ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ نئی تعلیمی پالیسی میں مادری زبان کو تعلیمی سطح پر لاگو کرنے کی جو تجویز ہے اسے سنجیدگی سے نافذ کرنے پر توجہ دینی چاہیے، اگر ہم ایسا کرتے ہیں تو گھر اور اسکول کے بیچ کا فاصلہ دور ہوگا، بچوں میں اپنی زبان کی قدر و قیمت کا احساس پیدا ہوگا اور اس کی علمی و تخلیقی صلاحیت میں خاطر خواہ اضافہ ہوگا۔ دہلی یونیورسٹی کی پروفیسر پونم بترا نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ بلاشبہ لسانی تنوع ہمارے ملک کی خوبصورتی ہے اور اس کا تحفظ ہمیں ہر حال میں کرنا ہوگا۔ مگر ابتدائی مرحلے میں بچے کو غیر مادری زبان میں پڑھانا لسانی تفریق اور غیر برابری ہے، جس کا خصوصاً اقلیتی اور آدی واسی زبانوں کو سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہر زبان ایک کلچر اور شناخت سے جڑی ہے اور جب ہم اس زبان کو بچے سے الگ کر دیتے ہیں تو گویا ہم اسے اس کے کلچر اور شناخت سے محروم کر دیتے ہیں جس کے منفی نتائج بہت خطرناک ہیں اور اس طرح پوری ایک قوم کی شناخت اور ثقافت کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ روزنامہ انقلاب ممبئی کے ایڈیٹر شاہد لطیف نے کہا کہ بچہ مادری زبان ماں کی گود اور گھر کے ماحول سے سیکھتا ہے، یہ اس کی بنیادوں

میں شامل ہوتی ہے۔لہٰذا مادری زبان سے محبت پیدا کرنا سب سے پہلے والدین اور سرپرستوں کا کام ہے۔ اگر ایسا ہوتا ہے تو اس کا خاطر خواہ فائدہ ہوگا، مگر افسوس ہے کہ اب ہمارے گھروں میں ایسا نہیں ہوتا، ہماری ثقافت بدل گئی ہے جس کے نقصان دہ نتائج کا ہمیں سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ شاہد لطیف نے کہا کہ کئی زبانیں سیکھنا اور ان میں مہارت حاصل کرنا اچھی بات ہے مگر یہ مادری زبان کی قیمت پر نہیں ہونا چاہیے۔

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کی پروفیسر گلفشاں حبیب نے کہا کہ اگر مادری زبان میں اعلیٰ تعلیم یا سائنس و ٹکنالوجی کی تعلیم دینی ہے تو پہلے اس زبان میں لٹریچر فراہم کرنا ضروری ہے۔ ایسے کئی ملک ہیں جنھوں نے اپنی زبان میں لٹریچر تیار کیا اور وہ اب انگریزی پر منحصر نہیں ہیں، اگر ہم بھی اپنی زبان کو ثروت مند بنائیں تو انگریزی یا کسی بھی دوسری زبان کو سیکھنا ہماری مجبوری نہیں ہوگی بلکہ ہمارے اختیار میں ہوگا۔ اسی طرح مادری زبان کے فروغ میں دوسری زبانوں کے الفاظ اور ماحول کو قبول کرنے کا مزاج بنانا بھی نہایت اہم ہے۔

پروگرام کی نظامت کے فرائض ٹی آئی ایس ایس، حیدرآباد سے وابستہ ڈاکٹر ساجدہ سلطانہ نے بحسن وخوبی انجام دیے۔ کونسل کے ڈائرکٹر شیخ عقیل احمد کے اظہار تشکر کے ساتھ پروگرام اختتام پذیر ہوا۔ اس موقعے پر کونسل سے ڈاکٹر کلیم اللہ (ریسرچ آفیسر) و دیگر اسٹاف بھی شریک رہے۔ ٹیکنکل سپورٹ افضل حسین خان اور نوشاد منظر نے فراہم کی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 21 فروری 2022

نیچرل سائنس پینل کی میٹنگ

نئی دهلی: آج قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے نیچرل سائنس پینل کی میٹنگ کا انعقاد ہوا، جس کی صدارت جامعہ ملیہ اسلامیہ کی پروفیسر تسنیم فاطمہ نے کی۔ میٹنگ کے آغاز میں کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے تمام شرکا کا استقبال کیا۔

افتتاحی خطاب میں انھوں نے کہا کہ کونسل کا مقصد اردو زبان وادب کے فروغ کے علاوہ دیگر اہم تاریخی، سماجی و سائنسی موضوعات پر بھی اردو زبان میں کتابیں شائع کرنا اور طلبہ وطالبات کو ضروری مواد فراہم کرنا ہے۔ نیچرل سائنس پینل بھی اسی لیے تشکیل دیا گیا ہے تاکہ خصوصاً سائنسی موضوعات پر ضروری اور اہم کتابیں شائع کی جائیں اور طلبا کی تعلیمی ضرورتیں پوری ہوں، چنانچہ اب تک کونسل سے سائنسی موضوعات پر درجنوں کتابیں شائع کی جاچکی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ قومی اردو کونسل اس سلسلے میں ماہرین کے مشوروں اور تجاویز کا خیر مقدم کرتی ہے اور طلبا و طالبات کو ہر ممکن مدد فراہم کرنے کے لیے پابند عہد ہے۔ انھوں نے کہا کہ خصوصاً بچوں کو آسان اردو زبان میں کیسے سائنسی مواد فراہم کیا جائے اس سلسلے میں ہمیں ماہرین اور اساتذہ و مصنفین کے زیادہ سے زیادہ تعاون اور تجاویز کی ضرورت ہے۔ آج کی میٹنگ کے دوران گزشتہ میٹنگ کی تجاویز کو بہ اتفاق رائے منظور کیا گیا۔ اس کے علاوہ نیچرل سائنس کے مختلف پہلوؤں پر کونسل کے زیر اہتمام جاری اشاعتی پروجیکٹس پر غور وخوض کیا گیا اور مختلف سائنسی کتابوں کی تیاری و اشاعت کو منظوری دی گئی۔ اس موقعے پر کورونا کے زمانے میں ویکسین کی ضرورت کو مد نظر رکھتے ہوئے اردو دنیا کو اس کی اہمیت و افادیت سے روشناس کرانے کے لیے ویکسین سے متعلق ضروری معلومات اور اس کے فوائد پر ایک کتاب کی تیاری کا فیصلہ کیا گیا۔ ساتھ ہی ماحولیات کو درپیش مسائل اور آلودگی کی مختلف شکلوں کو پیش نظر رکھ کر بچوں کے لیے ایک اشاعتی منصوبے کو منظوری دی گئی تاکہ انھیں ماحولیات کے تعلق سے بیدار کیا جائے اور بتایا جائے کہ کیا کیا چیزیں ماحولیات کو آلودہ کرتی ہیں، جن سے احتراز کرنے کی ضرورت ہے۔ پروفیسر تسنیم فاطمہ کے اختتامی کلمات کے ساتھ میٹنگ اختتام پذیر ہوئی۔

میٹنگ میں پروفیسر رئیس الدین، ڈاکٹر احمد علی، پروفیسر اسد خان، پروفیسر سہیل پرویز، ڈاکٹر عزیر عزیز، پروفیسر ایس ایم اے شبلی اور ڈاکٹر رضا رفیق الحق کے علاوہ کونسل سے ڈاکٹر کلیم اللہ (ریسرچ آفیسر)، ذیشان فاطمہ (ریسرچ اسسٹنٹ) وغیرہ نے شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 23 فروری 2022

قومی تعلیمی پالیسی ہندوستان کی تقدیر اور تصویر بدل دے گی: پروفیسر عقیل احمد

نئی دهلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور سندھی کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے جموں و کشمیر کے نامہ نگاروں سے قومی تعلیمی پالیسی پر بات کرتے ہوئے بتایا کہ یہ پالیسی ہندوستان کی تقدیر اور تصویر بدل دے گی کیونکہ اس پالیسی میں ہندوستان کی تمام زبانوں کی ترویج وترقی اور ان کے احیا کی تجویز رکھی گئی ہے۔ ہندوستان کا ہر طالب علم پانچویں کلاس تک لازمی اور آٹھویں کلاس تک اختیاری طور پر مادری زبان میں تعلیم حاصل کرپائے گا۔ اس کے علاوہ کسی بھی تعلیمی سطح پر اپنی مادری زبان کو ایک مضمون کے طور پر وہ اختیار کرسکتا ہے۔ ساتھ ہی اس پالیسی میں یہ تجویز بھی ہے کہ تمام ریاستوں میں اور مرکز میں بھی تمام زبانوں کے فروغ کے لیے اکیڈمیاں قائم کی جائیں گی۔ شیخ عقیل نے کہا کہ دراصل وزیراعظم عالی جناب نریندر مودی کا خیال ہے کہ کوئی بھی ترقی پسند ملک اگر مادری زبان کا تحفظ نہیں کرے گا تو اس ملک کا زوال لازمی ہے۔ کیونکہ آواز سے شبد اور شبدوں سے بھاشا یا زبان کی تخلیق ہوتی ہے اور آواز ہی اس کائنات کی اصل اور جوہر ہے، اس لیے تمام زبانیں قابل احترام ہیں اور مودی سرکار بھی زبانوں کے تحفظ کے لیے پرعزم ہے۔ پروفیسر شیخ عقیل نے کہا کہ قومی تعلیمی پالیسی میں تعلیم میں تنوع پیدا کیا گیا ہے جس سے تعلیمی نظام کی توسیع ہوگی اور نئے نئے کورس اور سبجیکٹ کو متعارف کیا جائے گا۔ جس سے روزگار اور ملازمتوں کے نئے مواقع پیدا ہوں گے اور ہندوستان میں کوئی بھی نوجوان بے روزگار نہیں رہے گا۔ اس پالیسی کے اندر تمام مضامین کو اسکل ڈیولپمنٹ کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ نوجوان تعلیم حاصل کرکے بیکار نہ رہیں۔ اگر نوجوان برسر روزگار ہوں گے اور سبھی کو ملازمتیں ملیں گی تو یہ ملک ترقی کی نئی بلندیوں تک پہنچے گا۔ انھوں نے کہا کہ قومی تعلیمی پالیسی کی ایک اور خاص خوبی یہ ہے کہ اس میں یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ ہزاروں سال پرانا گروکل کا جو ماحول تھا اسے تمام تعلیمی اداروں میں پیدا کیا جائے اور تمام اساتذہ کو ایسی تربیت دی جائے کہ ان کا مقام ماضی کے ان نابغۂ روزگار اساتذہ جیسا ہو جن کی شاگرد بڑی تعظیم کرتے تھے۔ شیخ عقیل نے کہا کہ دراصل ہمارے وزیراعظم عالی جناب نریندر مودی یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں میں سب سے آگے نظر

آئے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی جو اخلاقی قدریں اور ہزاروں سال پرانی جو تہذیب ہے وہ ہمیشہ زندہ رہے اور ہندوستان کا ہر شخص اور ہر نوجوان موڈرن ہونے کے ساتھ ساتھ روحانیت سے بھی اپنا رشتہ استوار رکھے، یعنی ترقی اور روحانیت ساتھ ساتھ پروان چڑھیں۔ پروفیسر عقیل نے کہا کہ اگر ہندوستان میں ایسا ہوتا ہے تو پوری دنیا میں ہندوستان انقلاب برپا کردے گا اور ہمارا ملک حقیقی معنوں میں وشو گرو سمجھا جائے گا، اس لیے میں ہندوستان کے تمام تعلیمی اداروں، اساتذہ اور طالب علموں سے اپیل کرتا ہوں کہ نئی قومی تعلیمی پالیسی 2020 کو نافذ کرنے کے لیے آگے آئیں اور وزیر اعظم نریندر مودی کے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کریں۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 18 فروری 2022

غزالہ قمر اعجاز کے افسانوی مجموعے 'مجھے بھی' کی رونمائی

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے صدر دفتر میں مشہور افسانہ نگار غزالہ قمر اعجاز کے افسانوی مجموعہ 'مجھے بھی...' کا اجرا کونسل کے ڈائریکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد اور دیگر مہمانوں کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس موقعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے

پروفیسر عقیل احمد نے مصنفہ کو مبارکباد پیش کی اور کہا کہ ایک زمانہ تھا جب خواتین کی تخلیقات کم منظر عام پر آتی تھیں اور انھیں اس راہ میں دشواریاں درپیش تھیں، مگر اب عورتیں کسی بھی میدان اور کسی بھی شعبے میں مردوں سے کمتر اور پیچھے نہیں ہیں۔ انھوں نے کہا کہ آج نسائی اور تانیثی تحریک کے زیر اثر بہت سی تخلیقات شائع ہو رہی ہیں، جن میں عام سماجی معاملات کے علاوہ خالص خواتین سے متعلق موضوعات کا بھی احاطہ کیا جارہا ہے۔ شیخ عقیل نے کہا کہ غزالہ قمر اعجاز کے افسانے بہت عمدہ ہیں اور انھوں نے تمام سماجی پہلوؤں کو اپنی تخلیقات میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے، فنی اعتبار سے بھی انھوں نے افسانے کے تمام لوازمات وشعریات کو ملحوظ رکھا ہے، ان کی زبان بھی رواں اور سادہ ہے۔

معروف ادیب و ناقد حقانی القاسمی نے کہا کہ غزالہ قمر نئے عہد کی تخلیق کار ہیں۔ اس لیے انھیں نئے سماجی و ادبی تقاضوں کا ادراک ہے اور ان کا اسلوب بیان بھی دلکش ہے۔ ان کے افسانوں میں سماجی نفسیات کا زاویہ بہت اہم ہے، انھوں نے فرد اور سماج کی نفسیات کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور اسی کا اظہار اپنی تخلیقات میں کیا ہے۔ انھوں نے غزالہ قمر کے افسانوں کی لسانی واسلوبی خوبیوں کی نشان دہی کرتے ہوئے کہا کہ ان کے افسانوں کو پڑھتے ہوئے بوریت اور اکتاہٹ کے بجائے ارتعاش کا احساس ہوتا ہے۔

مشہور افسانہ نگار اور محقق ڈاکٹر نعیمہ جعفری نے کہا کہ غزالہ تانیثیت کی ایک معتبر آواز کے طور پر اپنی شناخت رکھتی ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں عورتوں کے مسائل اور درد کو بیان کیا ہے۔ انھوں نے غزالہ کے متعدد افسانوں کے کرداروں کی روشنی میں موجودہ سماجی معاملات ومشکلات پر بھی روشنی ڈالی۔

معروف افسانہ نگار اور نسائی ادبی تنظیم 'بنات' کی سربراہ ڈاکٹر نگار عظیم نے کہا کہ غزالہ بے حد حساس خاتون ہیں اور اس کا اثر ان کی کہانیوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اب خاتون تخلیق کاروں کے موضوعات، کردار اور کینوس و احساس بدل رہے ہیں، جس کی نمائندگی غزالہ قمر کے افسانے کرتے ہیں۔ خواتین کے درد کو انھوں نے کما حقہ محسوس کیا اور اس کی بھرپور نمائندگی کی ہے۔

ڈاکٹر یوسف رامپوری نے غزالہ قمر کے افسانے 'سرگوشی' کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ اس میں انھوں نے بدلتے ہوئے سماجی منظر نامے کا بخوبی نقشہ کھینچا ہے۔ سرگوشی میں انھوں نے خواتین کے حوالے سے بدلتے ہوئے انفرادی وسماجی خیالات وتصورات کی نشان دہی کی ہے۔ انھوں نے بیرونی و خانگی زندگی میں خواتین کو درپیش مسائل اور پیچیدگیوں کی بہت عمدگی سے عکاسی کی ہے۔

'بیسویں صدی' کی مدیرہ شمع افروز زیدی نے بھی غزالہ قمر کے تخلیقی امتیازات اور فنی کمالات کی نشان دہی کی۔ انھوں نے کہا کہ تخلیق کی سطح پر مرد وخواتین میں کوئی علاحدگی نہیں، دونوں ایک دوسرے کے مسائل کو جانتے ہیں اور ان پر اظہار خیال بھی کر سکتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ غزالہ کی کہانیوں میں موضوعات کا بھرپور تنوع پایا جاتا ہے۔

ان کے علاوہ مشہور افسانہ نگار رخشندہ روحی، پروفیسر ممتاز احمد، چشمہ فاروقی اور سفینہ نے بھی افسانوی مجموعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے مصنفہ کو مبارکباد پیش کی۔ غزالہ قمر اعجاز نے کتاب کے تعلق سے مختصر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اس مجموعے میں چھبیس افسانے ہیں جو آج کے حالات وواقعات کی عکاسی کرتے ہیں۔ اور سماج، خصوصاً خواتین کو مختلف سطحوں پر جن مشکلات کا سامنا ہے، انھیں اپنے محسوسات کی روشنی میں افسانے کا جامہ پہنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ آخر میں غزالہ قمر اعجاز کے شوہر اعجاز عالم نے کتاب پر اظہار خیال کرنے والے تمام مہمانوں اور کتاب کی رونمائی کے لیے ایک موقر پلیٹ فارم مہیا کرنے پر اردو کونسل کے ڈائریکٹر شیخ عقیل احمد کا خصوصی شکریہ ادا کیا۔ اس موقعے پر کونسل کا تمام عملہ موجود رہا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 4 مارچ 2022

پہلی تخلیق پہلا تاثر

کسی بھی رسالے میں جب آپ کی تخلیق شائع ہوتی ہے تو آپ کو بے انتہا مسرت کے ساتھ ایک نئی تحریک بھی ملتی ہے۔ ماہنامہ 'اردو دنیا' میں جب آپ کی تخلیق پہلی بار شائع ہوئی تو آپ کو کیسا محسوس ہوا؟ آپ اپنے خیالات لکھ کر ہمیں بھیجیں اور یہ بھی ضرور لکھیں کہ آپ کی ذہنی اور تحریری تربیت میں ادبی رسائل کتنا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ذرا سوچیے! اگر یہ رسالے نہ ہوتے تو...؟

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے سینٹر میں جلسہ تقسیم اسناد

سی۔عبدالحکیم کالج [خودمختار] میل وشارم، تامل ناڈو، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کا ایک فعال اور سرگرم مرکز ہے۔ اس سنٹر کے زیر اہتمام این سی پی یو ایل

کے چار اہم کورس ڈپلوما ان عربک، ڈپلوما ان اردو، سرٹیفکیٹ ان اردو اینڈ فارسی کی بھی تعلیم دی جاتی ہے۔ امسال تقسیم اسناد کا ایک شاندار اجلاس کالج سیمنار ہال میں بروز پیر 21 فروری 2022 کو منعقد کیا گیا۔

امسال کل 455 طلبا وطالبات کے مابین ڈپلوما اور سرٹیفکیٹ کی اسناد تقسیم کی گئیں۔ جلسہ کی صدارت جناب ایس۔ زیڈ۔ ابرار احمد صاحب، سکریٹری وکرسپانڈنٹ، سی۔عبدالحکیم کالج، میل وشارم نے کی۔ سینئر فیکلٹی جناب ارشد باشاہ نے استقبالیہ پیش کیا۔ اس کے بعد مدعو مہمانوں کا تعارف صدر، شعبۂ اردو اور کوآرڈی نیٹر، این سی پی یو ایل، ڈاکٹر ایس۔ محمد یاسر نے کیا۔ پرنسپل ڈاکٹر ایس اے ساجد نے افتتاحی کلمات میں اس کورس کی اہمیت اور افادیت بتاتے ہوئے طلبا کو Value added کورسز میں داخلہ لینے اور اپنا مستقبل سنوارنے کی نصیحت کی۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر ایس بشیر احمد (پرنسپل نیو کالج، چنائی) نے اپنے خطاب میں قومی کونسل کی کاوشوں کی قدر کرتے ہوئے ان کی ستائش کی اور کہا کہ کونسل اس ذولسانی ریاست میں اردو، عربی اور فارسی کی آبیاری کے لیے جو کوششیں کر رہی ہے وہ سنہرے حروف میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔ بعد ازاں جین کالج برائے خواتین، وانمباڑی کی پرنسپل ڈاکٹر انباولی نے اپنے خطاب میں اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ ان کورسوں میں اردو زبان سے ناواقف طلبا کی ایک بڑی تعداد قابل تحسین ہے۔ مزید انھوں نے کہا کہ ان کورسوں کو معمولی نہ سمجھیں، آپ نے مختلف مثالوں کے ذریعے واضح کیا کہ کس طرح یہ کورس ملازمتوں وغیرہ میں مفید اور کارگر ثابت ہوئے ہیں۔ اس کے بعد کامیاب طلبا وطالبات میں اسناد کی تقسیم عمل میں آئی۔ جلسہ کی نظامت افتخار احمد استاد، این سی پی یو ایل سینٹر نے کی۔ جلسہ میں عمائدین شہر، اخبار ورسائل اور الکٹرانک میڈیا کے صحافی اور نامہ نگار خاصی تعداد میں شامل رہے۔ ہدیۂ تشکر مولانا محمد سیفی عمری نے پیش کیا۔ قومی ترانہ پر جلسہ کا اختتام ہو۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر ایس محمد یاسر، شعبۂ اردو، سی عبدالحکیم کالج میل وشارم، 22 فروری 2022

تقسیم اسناد پروگرام

بسکھاری، امبیڈکرنگر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے زیر اہتمام ایم ایچ ایم نسواں اسکول سلطانپور کبیر پور کے اسٹڈی سینٹر میں ایک سالہ اردو ڈپلومہ کورس کا تقسیم اسناد پروگرام جمال اختر خان کی صدارت و منصور احمد کی نظامت میں منعقد کیا گیا۔ پروگرام میں ستارہ اردو ایوارڈ سے سرفراز محمد شفیع نیشنل انٹر کالج ہنسور کے استاد محمد اسلم خان نے بطور مہمان خصوصی خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اردو ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کا نام ہے۔ کسی بھی زبان کی ترقی و ترویج کے لیے ضروری ہے کہ وہ کثرت سے بولی اور لکھی جائے۔ اردو زبان کو اس مقام تک پہنچانے میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان سمیت کئی سماجی اداروں نے اہم کردار نبھایا ہے۔ انھوں نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اردو ڈپلومہ حاصل کرنے والوں میں دیگر مذہب کے بچے بھی پیچھے نہیں رہے ہیں۔ جمال اختر خان نے کہا کہ زبانیں ہمارے درمیان دوریوں کو کم کرتی ہیں۔ ساتھ ہی ایک دوسرے کو سمجھنے کا وسیلہ بنتی ہیں۔ پرنسپل اشتیاق احمد نے کہا کہ اردو کو فروغ دینے کے لیے والدین اپنے بچوں کو اردو کو ایک مضمون کی حیثیت سے ضرور پڑھوائیں۔ اس موقعے پر 50 طلبا وطالبات کو ایک سالہ ڈپلومہ کورس سرٹیفکیٹ مہمان خصوصی محمد اسلم خان نے تقسیم کیے۔ اس موقعے پر پون کمار، منا کمار، پھول کمار، منصور احمد، مادھری دیوی، غوث محمد، گائتری دیوی وغیرہ لوگ شریک تھے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 2 مارچ 2022

جن کتابوں نے متاثر کیا

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا نیا سلسلہ

ہزاروں کتابوں میں چند ہی کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو آپ کے ذہن و دل کی دنیا بدل دیتی ہیں۔ ایسی کتابوں کی قوت، اہمیت و معنویت کو قارئین سے شیئر کرنے کے لیے 'اردو دنیا' میں ایک نیا سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے جس میں مختلف اصناف پر مشتمل نئی اور پرانی کتابوں کے بارے میں صاحبانِ علم و ہنر یہ بتائیں گے کہ کن کتابوں نے انھیں متاثر کیا ہے۔

صاحبانِ ذوق کتاب کے اسلوب، موضوع اور دیگر تلازمات کے علاوہ یہ بھی بتائیں گے کہ یہ کتابیں کیوں پڑھنی چاہئیں۔ آپ نے ابھی تک جتنی کتابیں پڑھی ہیں ان میں سے چند کا انتخاب کیجیے اور اپنے مطالعاتی سفر میں ان افراد کو بھی شامل کیجیے جن تک شاید ان کتابوں کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے۔ منتخب کتابوں کے تعلق سے اپنے منطقی و معروضی خیالات اور تاثرات ہمیں لکھ بھیجیے۔

قومی اردو کونسل کے مالی تعاون سے

مولانا ابوالکلام آزاد اور اردو صحافت

مراد آباد: ایس آر پبلک اسکول خواجہ نگر میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تعاون سے نہرو یوا میلا کمیتی ہاتھی پور چتو کے زیر اہتمام مولانا ابوالکلام آزاد اور اردو صحافت کے موضوع پر سمینار کا انعقاد کیا گیا۔ صدارت مسلم فیڈریشن کے صدر بابر خان نے کی اور نظامت سید آصف حسن نے کی۔ سمینار کو خطاب کرتے ہوئے مقررین نے کہا کہ مولانا ابوالکلام آزاد نہ صرف ماہر تعلیم اور سیاست دان تھے بلکہ ایک اچھے صحافی بھی تھے جنھوں نے 1912 میں اردو

اخبار الہلال نکالا تھا، مولانا آزاد کو 1952 میں نمایاں کارکردگی پر بھارت رتن ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ممبر پارلیمنٹ ڈاکٹر ایس ٹی حسن نے کہا کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے ملک کے لیے جو قربانیاں دی ہیں انھیں فراموش نہیں کیا جاسکتا، انھوں نے تعلیم کے فروغ اور قوم کی بقا و ترقی کے لیے کام کیے ہیں۔ سپریم کورٹ کے ایڈوکیٹ ناصر عزیز نے کہا کہ مولانا آزاد جہاں معروف مسلم اسکالر تھے، وہیں ایک شاعر، ادیب، سیاست دان، آزادی پسند کے ساتھ ساتھ ایک اچھے صحافی بھی تھے۔ انھوں نے ہندو مسلم اتحاد کی تحریک خلافت میں اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے کہا کہ مولانا کو اردو، فارسی، عربی اور انگریزی زبانوں پر مکمل عبور حاصل تھا۔ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر شفیع ایوب نے مقالہ میں کہا کہ اگر ہم اردو کی بات کریں اور مولانا آزاد کا نام نہ لیں تو یہ ان کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ اس موقعے پر ہمارانی ایڈوکیٹ، ایم اے معروف، ربیع بہار، ایس فضیلت، مشرفی انجم نے مولانا ابوالکلام آزاد پر مقالے پیش کیے۔ سمینار کی صدارت کرتے ہوئے بابر خان نے کہا کہ مولانا آزاد ایسی شخصیت تھے جن کی قربانی کو فراموش نہیں کیا جاسکتا، انھوں نے رامپور کے پہلے ایم پی بن کر رامپور کے عوام کو فخر کا احساس دلایا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 1 مارچ 2022

ادب اطفال اور دہلی

نئی دھلی: وزڈم ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ کے زیر اہتمام اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے 'ادب اطفال اور دہلی' عنوان سے گرین ٹریز پبلک اسکول شاہین باغ میں یک روزہ سمینار کا انعقاد عمل میں آیا جس میں مختلف اسکالرز اور مقالہ نگاروں نے دہلی کی سطح پر بچوں کے ادب کے پس منظر، اس کے معاصر منظر نامہ اور اس حوالے سے انجام دی جانے والی نثری و شعری خدمات کا جائزہ لیا۔ اس سمینار کی صدارت شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر ابوبکر عباد نے کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطاب میں سمینار میں پیش کردہ مقالات کا جائزہ پیش کرتے ہوئے ان کے اہم نکات کی نشاندہی کی اور ان کے اطراف و مباحث پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ مجموعی

طور پر مقالہ نگاروں نے محنت کی ہے، انھوں نے اپنے موضوع سے انصاف کیا اور مختصر وقت میں اپنی باتیں پیش کرنے کی اچھی کوششیں کی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ادب اطفال کی غیر معمولی اہمیت ہے اور اچھا شہری بننے کے لیے بچپن میں کہانیاں پڑھنا اور حکایات و واقعات کو سننا اور پڑھنا نہایت ضروری ہے، اس سے ہم آداب زندگی بھی سیکھتے ہیں اور اپنا مستقبل سنوارنے کا سبق بھی ملتا ہے۔

معروف ادیب و ناقد حقانی القاسمی نے کہا کہ بچوں کے ادب میں بنیادی چیز یہ ہے کہ وہ عصری ضروریات اور تقاضوں سے ہم آہنگ ہو، اگر وہ عصری تقاضوں سے میل نہیں کھاتا تو اس کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی۔ انھوں نے دہلی میں بچوں کے رسائل پر اپنا پر مغز مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ بچوں کے رسائل ایک ویژن اور مشن کے تحت نکالے جائیں تبھی ان کے مثبت نتائج سامنے آئیں گے۔ انھوں نے بچوں کی صحافت کے کچھ اہم تاریخی پہلوؤں پر بھی خصوصی گفتگو کی۔ دہلی یونیورسٹی کے استاذ ڈاکٹر ارشاد نیازی نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے سمینار کے ذمے داران اور مقالہ نگاروں کو مبارکباد پیش کی اور کہا کہ بچوں کی تعلیم میں اخلاقیات کا شمول اور ان کی تربیت پر توجہ دینا نہایت ضروری ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس زمانے میں جس قدر تعلیم پر زور دیا جا رہا ہے اس قدر تربیت کا اہتمام نہیں کیا جاتا، جس کے نہایت نقصان دہ نتائج برآمد ہو رہے ہیں۔ ادب اطفال میں اخلاقیات اور بچوں کی تربیت کے عنصر پر توجہ دیے بغیر ہم اسے مفید نہیں بنا سکتے۔ اسی طرح اس صنف میں دوسری زبانوں اور ان کے تراجم کا جو کردار ہے، اس پر بھی کام کرنے کی ضرورت ہے۔

اس سمینار میں ڈاکٹر یوسف رامپوری (بچوں کا ادب اور لسانیات)، ڈاکٹر نوشاد منظر (ادب اطفال کے فروغ میں ماہنامہ امنگ کا کردار)، ڈاکٹر امیر حمزہ (دہلی میں ادب اطفال کے اشاعتی مراکز)، نایاب حسن (بچوں میں مطالعے کا شوق کیسے پیدا کریں؟) تجمل حسین (دہلی میں بچوں کے شاعر)، عظمت النساء (ادب اطفال کے محقق خوشحال زیدی)، ساجدہ خاتون (شفیع الدین نیر کی نگارشات)، محمد نجم الدین (بچوں کے ادب پر قومی کونسل کی مطبوعات: ایک جائزہ)، محمد امانت اللہ (کھلونا: ادب اطفال کا سنگ

میل)، ڈاکٹر گلزیدہ خان (بچوں کا ادب اور دہلی کی خواتین تخلیق کار) اور محمد حفظ الرحمٰن (بچوں کا سائنسی ادب اور محمد خلیل) نے مقالے پیش کیے۔ قبل ازاں وزڈم ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ کے صدر ابواللیث قاسمی نے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا اور تمام مہمانوں کا گلدستے کے ذریعے خیر مقدم کیا گیا۔ سمینار کی نظامت دہلی یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر عبدالباری قاسمی نے بحسن وخوبی انجام دی۔ اس موقعے پر قاری صدر عالم، قاری اسعد انور صدیقی، عبدالعلیم، سمیر، توحید حقانی، مناظر، مفتی ابوالخیر، شہلا پروین، شاہ جہاں، مہتاب، دلشاد، افضال احمد سیفی، ثقلین رضا رحمانی، حسنین رضا، محمد انس سمیت بڑی تعداد میں اہل علم ودانش وران شریک رہے۔

بحوالہ qindeelonline.com، 13 فروری 2022

اردو ادب کے فروغ میں کتب خانوں کا حصہ

لکھنؤ: اردو زبان ہمارے ملک کی امتیازی شناخت ہے جس نے ہر قدم پر اتحاد و سالمیت کا پیغام دیا ہے۔ اردو زبان ایک مہذب زبان ہے۔ ملک کی آزادی میں اس

زبان کے کردار کو کوئی بھی فراموش نہیں کرسکتا۔ یہ زبان ہندوستان اور بیرون ملک کے کتب خانوں کی ہمیشہ زینت رہی ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر درگیش منی ترپاٹھی نے نرودیشور ڈگری کالج چھٹ لکھنؤ میں منعقد اپنے صدارتی کلمات میں کیا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے مالی تعاون سے انت سیوا سمیتی کے زیر اہتمام یک روزہ سمینار بعنوان اردو کے فروغ میں کتب خانوں کا حصہ میں شریک بطور مہمان خصوصی ڈاکٹر دیپتی منی ترپاٹھی نے کہا کہ اردو زبان کے فروغ میں کتب خانوں کا بے حد اہم رول ہے۔ ایک اچھے اور اعلیٰ درجے کا کتب خانہ وہی ہے جس میں دنیا کی ہر زبان کی کتابیں مہیا ہوں۔ کوئی بھی کتب خانہ بغیر اردو زبان و ادب کی کتابوں کے نامکمل ہے۔ انت سیوا سمیتی کی سکریٹری سمن جیسوال نے مہمانوں کو گلدستہ پیش کرکے ان کا استقبال کیا۔ سمینار کی نظامت ڈاکٹر مسیح الدین خان نے کرتے ہوئے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے ڈائریکٹر شیخ عقیل کی جانب سے ارسال کردہ پیغام کو پڑھ کر سنایا۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے لائبریرین ڈاکٹر مسیح الدین خان نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ڈیجیٹل دور میں کتب خانوں کی اہمیت میں اضافہ ہوا ہے۔ ایک کتاب دوست انسان کتب خانوں کی اہمیت وافادیت کو کبھی بھی فراموش نہیں کرسکتا ہے۔ ڈاکٹر یاسر جمال نے اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ کتب خانے علمی سرمایے کے ساتھ ساتھ زبان وتہذیب کے محافظ ہوتے ہیں۔ اس موقع پر نرودیشور لاء کالج کے پرنسپل ڈاکٹر وی کے شکلا اور نرودیشور ڈگری کالج کے پرنسپل ڈاکٹر دیویندر بہادر سریواستو نے بھی اردو زبان اور کتب خانوں کے حوالے سے اظہار خیال کیا۔ انت سیوا سمیتی کی جانب سے کالج کے پرنسپل ڈاکٹر دیویندر بہادر سریواستو کو اعزاز سے سرفراز کرتے ہوئے شال پیش کی گئی۔ اس موقع پر کالج کے طلبا انیا چودھری، محمد جاوید، لیش گپتا وغیرہ کو سرٹیفکٹ پیش کیا گیا۔ دیگر مقالہ نگاران میں ڈاکٹر کرن، صائمہ انصاری، عائشہ صدیقی، ایوشی ورما، روی چوہان، دیکشا گپتا، انیشہ کریل وغیرہ شامل ہیں۔

پریس ریلیز: گلوبل اردو نیوز سروس، لکھنؤ 12 فروری 2022

پروفیسر شمیم حنفی شخصیت اور خدمات

لکھنؤ: شمیم حنفی کا تعلق دانشوری کی اس روایت سے رہا ہے جس میں لکھنؤ اور دہلی کی تہذیب کی آمیزش تھی۔ ان کی کثیر الجہات شخصیت نے ان کے قد کو ہندی و اردو ادب

میں یکساں مقبولیت عطا کی۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر خواجہ اکرام نے کرامت حسین مسلم گرلس پی جی کالج لکھنؤ کے زیر اہتمام پروفیسر شمیم حنفی کی شخصیت اور خدمات پر ایک روزہ سمینار میں کیا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے اشتراک سے آل انڈیا کیفی اعظمی اکیڈمی میں منعقد اس سمینار کے صدارتی خطبے میں پروفیسر خواجہ اکرام نے مزید کہا کہ شمیم حنفی جدید دور کے گراں قدر نقادوں میں سے ہیں۔ سمینار کے آغاز میں بی اے کی طالبہ ام ہانی نے ایک خیر مقدمی نظم پیش کی۔ پرگرام کی کوآرڈینیٹر ڈاکٹر نزہت فاطمہ نے سبھی مہمانان کا استقبال کیا۔ کرامت پی جی کالج کی جانب سے اس سمینار میں مہمانان کو گلدستہ اور مومنٹو پیش کیا گیا۔ سمینار میں مہمان خصوصی کے طور پر شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ کے سابق صدر پروفیسر انیس اشفاق نے پروفیسر شمیم حنفی کی گراں قدر شخصیت اور خدمات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا کہ پروفیسر شمیم حنفی کی ادبی وعلمی عبقریت کا عالم یہ تھا کہ وہ اردو زبان وادب کی بے لوث خدمت کرتے رہے۔ بطور مہمان اعزازی ہندی اردو ساہتیہ ایوارڈ کمیٹی کے جنرل سکریٹری سید اطہر نبی ایڈوکیٹ نے کہا کہ پروفیسر شمیم حنفی تنقید اور تحقیق کے دائروں سے الگ ایک بالیدہ تخلیقی ذہن کے مالک تھے۔ سمینار میں ڈاکٹر عمیر منظر، ڈاکٹر مجاہد الاسلام، ڈاکٹر اسریٰ بی بی صدیقی، ڈاکٹر گلشن مسرت، شاہد حبیب فلاحی، حمیرا عالیہ، ام ہانی نے اپنے مقالے پیش کیے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر عمیر منظر نے ادا کیے۔ سمینار کی کنوینر اور کرامت حسین مسلم گرلس پی جی کالج کی پرنسپل محترمہ سحر حسین نے سبھی مہمانان کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 20 فروری 2022

فروغ اردو میں علما کا کردار

نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان حکومت ہند کے مالی تعاون سے مدرسہ احمدیہ سید العلوم انتظامیہ ایجوکیشنل سوسائٹی کے زیر اہتمام وزیر پور جے جے کالونی میں 'فروغ اردو میں علما کا کردار' کے عنوان سے ایک سمینار کا انعقاد کیا گیا، جس کی سرپرستی مفتی عتیق

الرحمٰن، صدارت پروفیسر خواجہ اکرام الدین اور نظامت محمد چاند رضا و غلام سرور نے مشترکہ طور پر کی۔ اس موقعے پر خطبۂ صدارت پیش کرتے ہوئے پروفیسر خواجہ اکرام الدین نے کہا کہ زبان کا دوسرا نام تہذیب و ثقافت ہے۔ صوفیائے کرام نے اردو زبان و ادب کو عوام تک پہنچانے میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ مولانا مقبول احمد سالک مصباحی نے کہا کہ اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت میں علمائے کرام اور مدارس اسلامیہ کا جو کردار ہے وہ سنہرے حرفوں سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ ماہنامہ کنزالایمان دہلی کے ایڈیٹر مولانا ظفرالدین برکاتی نے کہا کہ اردو کی بقا میں مدارس اسلامیہ کا جو کردار ہے وہ غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ دہلی یونیورسٹی میں اردو کے استاذ ڈاکٹر علی احمد ادریسی نے کہا کہ اردو کی نشر و اشاعت میں علمائے کرام اور ہمارے اکابرین نے بیش بہا خدمات انجام دیں۔ اگر ہم صرف مولانا عبدالماجد دریابادی کی زندگی کا ہی مطالعہ کرلیں تو معلوم ہوجائے گا کہ ہم لوگوں تک اردو کو پہنچانے اور بچانے میں اکابرین کا کیا کردار رہا ہے۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر جسیم الدین، مفتی مکرم علی شاد سمنانی، مولانا فردوس الرحمٰن، مولانا تصور علی نظامی، مولانا حجۃ الاسلام برکاتی نے بھی مقالے پیش کیے۔ مفتی عتیق الرحمٰن منظری نے تمام مہمانان کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 21 فروری 2022

فارسی اور اردو شاعری

نئی دهلی: غالب اکیڈمی کے زیراہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے مالی تعاون سے یک روزہ سمینار کا انعقاد کیا گیا۔ سمینار میں مختلف یونیورسٹیوں کے پروفیسروں اور اسکالروں نے اپنے مقالات میں چند فارسی اور اردو شعرا کی شاعری اور ان کے فکر و فن کا جائزہ پیش کیا۔ پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے ملا نفیس الدین ثانی کی شاعری پر مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان میں ایسے فارسی نوادرات موجود ہیں اس کے لیے ہمیں خانقاہوں اور مدرسوں تک جانا ہوگا۔ پروفیسر شریف حسین قاسمی نے کہا کہ ایران میں اب فارسی ادب کی قدر ہوتی ہے پہلے اسے نظرانداز کیا گیا تھا لیکن اب صورت حال بدل رہی ہے۔ پروفیسر قاسمی نے عہد غالب کے تذکرہ نگار صادق اختر کے تذکرے آفتاب عالم پر ایک تحقیقی مقالہ پڑھا۔ پروفیسر علیم اشرف نے حالی کی فارسی شاعری پر مقالہ پڑھتے ہوئے کہا کہ حالی ایک مصلح ہیں، انھوں نے شاعری میں سہل پسندی کا خیال رکھا۔ قائم چاندپوری پر ڈاکٹر خالد علوی نے کہا کہ قائم چاندپوری نے محمد شاہ رنگیلے کی ہجو لکھی تھی۔ ان کی غزلوں میں روایتی مضامین ہیں لیکن سادگی ان کا امتیاز ہے۔ پروفیسر قمر غفار نے عندلیب گلشن ناآفریدہ کے عنوان سے ایک مقالہ پڑھا۔ انھوں نے کہا کہ غالب کلاسیکی عہد کا آخری اور نئے دور کا پہلا شاعر تھا۔ غالب کی شاعری پر بیدل کے علاوہ دوسرے فارسی شعرا کے اثرات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ڈاکٹر جی آر کنول نے کہا کہ کریما کا میرے دل پر بہت اثر ہوا۔ فارسی ادبیات کا مطالعہ انگریزی کے ذریعے کیا۔ پروفیسر قاضی جمال حسین نے خواجہ میر درد کی فارسی شاعری پر اپنا مقالہ پڑھتے ہوئے کہا کہ آج کا سمینار اردو اور فارسی کو قریب لانے کی اچھی کوشش ہے۔ انھوں نے کہا کہ مضمون تو پرانے ہوتے ہیں معنی آفرینی سب سے اہم ہے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 24 فروری 2022

امیر خسرو: بحیثیت ایک مورخ

شاهجهاں پور: گاندھی فیض عام کالج میں شعبۂ تاریخ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیراہتمام 'امیر خسرو- بحیثیت ایک مورخ' موضوع پر ایک روزہ قومی

سمینار کا انعقاد کیا گیا۔ پروگرام کی صدارت کالج منتظمہ کمیٹی کے صدر سید معین الدین نے کی۔ مہمان خصوصی کے طور پر پی سنگھ وائس چانسلر ایم جے پی روہیلکھنڈ یونیورسٹی بریلی نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ تاریخ کو بچانا ہمارے لیے بہت ضروری ہے۔ جو نسل اپنی تاریخ کو نہیں بچاتی اس کا مستقبل تاریک ہوجاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ امیر خسرو عوام کے ادیب تھے۔ مختلف بادشاہوں کے درباروں میں رہتے ہوئے بھی انھوں نے اپنے عوامی شعور کو مرنے نہیں دیا۔ انھوں نے امیر خسرو کے ادب کے حوالے سے کہا کہ ان کے ادب میں تاریخ کے تمام واقعات کو ان کی لازوال شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ تاریخ کے طلبا کے لیے یہ بات ضروری ہے کہ وہ ان کے ادب میں ایسے حقائق اور واقعات کی چھان بین کریں۔ خصوصی مقرر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پروفیسر سید جمال الدین نے کہا کہ امیر خسرو نے دنیا کو ادب اور ثقافت کی زبان سکھانے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ادب احساسات و جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ خسرو نے اس اظہار میں موسیقی، تصوف اور فلسفے کو یکجا کرکے اسے انسانی حس کی سطح تک پہنچایا۔ امیر خسرو کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے مطلق العنان بادشاہوں کو اپنا آئیڈیل نہ مان کر اپنے استاد شیخ نظام الدین اولیا کو آئیڈیل مانا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ادب میں تمام عناصر عوام کو متاثر کرتے ہیں۔ پرنسپل ڈاکٹر محمد طارق نے مہمانان کو گلدستہ، شال مومنٹو دے کر استقبال کیا۔ دوسرے سیشن میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر وسیم راجا نے کہا کہ خسرو نے مختلف بادشاہوں کے دور اقتدار میں اپنی زندگی گزارتے ہوئے ہندوستان کا دورہ کیا اور حقائق کا باریک بینی سے مشاہدہ کرتے ہوئے انھیں اپنے ادب میں جگہ دی۔ علی گڑھ کے پروفیسر پرویز نے امیر خسرو کی تاریخ پر بات کرتے ہوئے کہا کہ ان کے پاس تاریخ کو پرکھنے کی ایک شاندار نظر تھی۔ اودھ ڈگری کالج کے پروفیسر انوپ کمار نے کہا کہ امیر خسرو بھی مذہبی بندھنوں سے بالاتر محبت کا مجسمہ تھے۔ رشی کیش اتراکھنڈ کے پروفیسر سراج محمد نے کہا کہ ابتدائی اور وسطی ہند کی تاریخ خسرو کے ادب کو پڑھے بغیر نہیں لکھی جاسکتی۔ جامعہ کالج کے ڈاکٹر نوشاد عالم نے امیر خسرو کے ادب کا تعارف کراتے ہوئے اس میں تاریخی عناصر کی جانچ کی۔ سمینار کی نظامت ڈاکٹر منصور احمد صدیقی نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 فروری 2022

اردو کے فروغ میں مذہبی ادب کا کردار

میل وشارم: اردو زبان و ادب کی ابتداء مذہب اور مذہبی ادب سے ہوتی ہے۔ شمالی ہند سے جب کھڑی بولی نے جنوبی ہند کا سفر کیا تو اس کو پروان چڑھانے میں صوفیا اور علما کی خدمات ناقابل فراموش رہیں۔ صوفیائے عظام نے اس زبان کو اپنے مواعظ اور اقوال میں ڈھالا تو علمائے کرام نے تصنیف و تالیف اور خطبات کے ذریعہ اردو زبان کو آگے بڑھایا۔ معراج العاشقین جو اردو کی پہلی تصنیف ہے، وہ ایک صوفی اور عالم ہی کی تصنیف تھی۔ ہم نے کبھی مذہبی ادب کے رول پر کھل کر گفتگو نہیں کی۔ ضرورت ہے کہ ہم مذہبی ادب کو تقدیسی ادب کا درجہ دے کر اس پر گفتگو کریں اور مباحث کا انعقاد کریں۔

ان خیالات کا اظہار پروفیسر خواجہ اکرام الدین نے دو روزہ قومی سیمینار کی افتتاحی نشست میں اپنے کلیدی خطاب میں کیا۔

کالج پرنسپل ڈاکٹر ایس اے ساجد نے استقبالیہ کلمات پیش کیے۔ ایم ایم ای ایس کے صدر جناب ملک شرف الدین، جنرل سکریٹری جناب ایس ضیاء الدین اور کالج سکریٹری و کرسپانڈنٹ جناب ایس زیڈ ابرار احمد نے مہمانوں کی تکریم اور شال پوشی کی۔

کلیدی خطاب کے بعد پروفیسر قاضی حبیب احمد (ڈائرکٹر اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، مدراس یونیورسٹی) نے اپنے خصوصی خطاب میں، سی عبدالحکیم کالج میل وشارم کی انتظامیہ اور سیمینار کے کنوینر ڈاکٹر ایس محمد یاسر (صدر شعبہ اردو، سی عبدالحکیم کالج، میل وشارم) کی خدمت میں ہدیہ تبریک و تہنیت پیش کرتے ہوئے کہا کہ جب تک ہم اردو ادب میں مذہبی ادب کی حیثیت کو تسلیم نہیں کرتے، اس وقت تک اردو ادب کی کہانی ادھوری رہے گی۔ ایم ایس یونیورسٹی، راجستھان کے شعبہ اردو کے صدر پروفیسر حدیث انصاری نے اپنے خطاب میں کہا کہ ادب اور مذہب کا تعلق لازم وملزوم جیسا ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ادب کی تحدید کردی ہے کہ ادب کیسا ہو۔ اس افتتاحی نشست کا آخری خطاب پروفیسر قاضی ضیاء اللہ (ریجنل ڈائرکٹر، مانو، بنگلور مرکز) کا رہا۔ آپ نے اپنے خطاب میں کہا کہ زبان وادب کسی علاقہ یا مذہب کی جاگیر نہیں، ہر مذہب کا سرمایہ اردو ادب میں موجود ہے۔ ڈاکٹر ایس محمد یاسر کے ہدیہ تشکر کے ساتھ اس نشست کا اختتام ہوا۔ نظامت محمد سیفی عمری اور ڈاکٹر ابوبکر ابراہیم عمری نے کی۔

پہلا تکنیکی سیشن پروفیسر حدیث انصاری کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مقالہ نگار ڈاکٹر ریس فاطمہ (حیدرآباد)، ڈاکٹر امان اللہ (مدراس یونیورسٹی)، ڈاکٹر امین اللہ (ایس وی یونیورسٹی تروپتی)، شیخ کلیم اللہ عمری (جامعہ دارالسلام عمرآباد) اور اعظم شاہد (بنگلور) نے مختلف عناوین پر اپنے مقالے پیش کیے، سیشن کے آخر میں پروفیسر حدیث انصاری نے تمام مقالوں پر تبصرہ پیش کرتے ہوئے مقالہ نگاروں کو مبارکباد پیش کی۔ ظہرانے کے بعد دوسرے تکنیکی سیشن کا آغاز ہوا، جس کی صدارت پروفیسر ڈاکٹر قاضی حبیب احمد نے کی۔ مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر ابوبکر ابراہیم عمری (جامعہ دارالسلام عمرآباد)، ڈاکٹر سعید الدین (اسلامیہ کالج وانمباڑی)، زبیدہ موشیکل (کیرلہ)، ڈاکٹر منظور دکنی (گلبرگہ یونیورسٹی)، ڈاکٹر محمد مدثر (جمال محمد کالج، ترچی) اور ڈاکٹر مسعودہ تسکین (قائد ملت کالج، چنئی) نے مقالے پڑھے۔ ڈاکٹر قاضی حبیب احمد نے ان کے مقالوں پر تبصرہ پیش کیا۔

تیسری نشست کی صدارت پروفیسر قاضی ضیاء اللہ نے کی۔ مقالہ نگاروں میں سید انور ہادی (کڈپہ)، محبوب خان محبوب (کڈپہ)، سید امداد (ریسرچ اسکالر، مدراس یونیورسٹی)، غوثیہ بیگم (جمال محمد کالج، ترچی) اور سردار خواجہ معین الدین (کڈپہ) نے مقالے پڑھے جن پر پروفیسر قاضی ضیاء اللہ نے تبصرہ کیا۔

دوسرے دن کی پہلی نشست کی صدارت پروفیسر خواجہ اکرام الدین نے کی۔ مقالہ نگاروں میں محمد سیفی عمری (جامعہ دارالسلام عمرآباد)، ڈاکٹر شیخ سعید احمد عمری (وانمباڑی)، ڈاکٹر نشاط احمد عمری (سنٹرل یونیورسٹی، حیدرآباد)، ڈاکٹر فاروق باشاہ عمری (کدری)، نذیر احمد عمری (جامعہ دارالسلام عمرآباد)، سید وصی اللہ بختیاری عمری (کڈپہ)، ظہیر دانش عمری (ریسرچ اسکالر، مانو) اور ڈاکٹر شمس الہدیٰ دریاآبادی (مانو، حیدرآباد) نے مختلف عناوین پر اپنے مقالے پیش کیے۔ آخر میں پروفیسر خواجہ اکرام الدین نے مقالوں پر گراں قدر تبصرہ کرتے ہوئے، مقالہ نگاروں کو ان کی تحقیق پر مبارکباد پیش کی اور اس سمت میں مزید کام کرنے پر ابھارا۔

آخری دو نشستوں کی صدارت پروفیسر قاسم علی خان اور پروفیسر شمس الہدیٰ نے کی۔ مقالہ نگاروں میں ستار فیضی (کڈپہ)، ڈاکٹر نثار احمد (ایس وی یونیورسٹی)، ڈاکٹر کلیم اللہ (مظہر العلوم کالج آمبور)، ڈاکٹر نقی اللہ خان (رائچوٹی)، نور اللہ (ریسرچ اسکالر مدراس یونیورسٹی)، تزئین جمال (جیین کالج، وانمباڑی)، ڈاکٹر بشیرہ سلطانہ (ایس آئی ای ٹی کالج، چنئی)، راقیہ نازنین (ایم ایم ای ایس کالج میل وشارم)، ڈاکٹر ابرار احمد (سی عبدالحکیم کالج میل وشارم)، نظیر احمد اور سردار ساحل (کڈپہ) نے پیش کیے۔ صدر نشین کے تبصرے پر آخری نشست اختتام کو پہنچی۔

ظہرانے کے بعد اختتامی نشست کا آغاز ہوا۔ پروفیسر شمس الہدیٰ اور پروفیسر قاسم علی خان نے خصوصی خطابات پیش کیے۔ تاثرات ڈاکٹر امین اللہ، ڈاکٹر منظور دکنی اور زبیدہ موشیکل کے رہے۔ نظامت کے فرائض شعبہ اردو کے استاذ فیضان احمد نے انجام دیے۔

مقالہ نگاروں کے مابین معزز مہمانوں کے ہاتھوں اسناد تقسیم کی گئیں۔ مولانا محمد سیفی عمری نے ہدیہ تشکر پیش کیا اور ترانہ ہندی کے ساتھ اس دو روزہ قومی سیمینار کا اختتام ہوا، جو شعبہ سی عبدالحکیم کالج (خودمختار) میل وشارا اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے اشتراک سے منعقد ہوا تھا۔ اس سیمینار میں پروفیسرز، طلبا کے علاوہ عمائدین شہر کی ایک بڑی تعداد شریک رہی۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر ایس محمد یاسر، شعبہ اردو، سی عبدالحکیم کالج، میل وشارم، 7 مارچ 2022

بہادر شاہ ظفر: فن وشخصیت

برھانپور: شعبہ اردو گورنمنٹ کالج برہان پور مدھیہ پردیش کے زیرِ اہتمام وانتظام 26 فروری 2022 بروز سنیچر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے اشتراک سے بہادر شاہ ظفر فن وشخصیت موضوع پر ایک روزہ صوبائی سیمینار کا انعقاد کیا گیا جس میں

صوبے کے مختلف شہروں کے مقالہ نگاروں نے شرکت کی اور بہادر شاہ ظفر کی زندگی، شاعری اور خدمات سے متعلق مختلف موضوعات پر اپنے مقالے پیش کیے۔ کلیدی خطبہ مدھیہ پردیش کے معروف شاعر وادیب، ڈرامہ نگار، متعدد کتابوں کے مصنف اور بہادر شاہ ظفر پر اہم تحقیقی وتنقیدی کام کرنے والے ادیب جناب رشید انجم نے پیش کیا۔

پروگرام کا افتتاح گورنمنٹ مادھو کالج کے شعبہ اردو کے صدر پروفیسر غلام حسین

صاحب کے ہاتھوں شمع افروزی کے ذریعے انجام پایا۔ نظامت کے فرائض انجام دیے، اس سمینار کے مہمان خصوصی سیوا سدن کالج کے شعبہ اردو کے صدر پروفیسر ایس ایم شکیل، گورنمنٹ کالج نیا نگر کے پرنسپل ڈاکٹر راجو سپکالے، گورنمنٹ کالج برہان پور کے سابق پرنسپل ڈاکٹر سشیل سوم ونشی اور سرونج مدھیہ پردیش کے معروف شاعر فرمان ضیائی رہے۔

افتتاحی اجلاس میں فاضلی اردو سوسائٹی (برہان پور) کی جانب سے شائع کردہ اور ڈاکٹر عارف انصاری اور ڈاکٹر اسرار اللہ انصاری کی مرتب کردہ کتاب 'فاضل انصاری فن اور شخصیت' کا اجرا برہان پور کے استاد شاعر جناب فیض خلیقی کے دستِ مبارک سے عمل میں آیا۔ فاضل انصاری فن اور شخصیت پر محترمہ فرزانہ انصاری نے اور فیض خلیقی برہان پوری نے اپنا تبصرہ بھی پیش کیا۔

افتتاحی اجلاس کے بعد سمینار کے پہلے ادبی سیشن کا آغاز ہوا جس کی صدارت پروفیسر غلام حسین (اجین) اور پروفیسر عثمان انصاری (برہان پور) نے کی۔ اس میں چھ مقالے پڑھے گئے، مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر وسیم انور (ساگر)، ڈاکٹر محمد صادق (کروائی ودیشہ)، فرمان ضیائی (سرونج)، ڈاکٹر نازنین منصوری (اندور)، اور بھوپال سے تشریف لائیں ڈاکٹر صبیحہ اختر اور ڈاکٹر صبیحہ آفاق صاحبہ نے اپنے پرچے پیش کیے۔ بعد ازاں ان مقالوں کا تجزیہ اور صدارتی خطبہ پروفیسر غلام حسین صاحب نے پیش کیا۔ اس سیشن کی نظامت کھنڈوہ سے تشریف لائے مہمان پروفیسر اور سمینار کے کنوینر محمد رفیق انصاری نے کی۔

تین بجے دوسرے ادبی سیشن میں کل سات مقالے پیش کیے گئے، جن مقالہ نگاروں نے اپنے پرچے پڑھے ان میں بطور خاص پروفیسر فہمیدہ منصوری (اندور)، پروفیسر عثمان انصاری، ڈاکٹر عارف انصاری، جاوید رانا، محمد الطاف انصاری اور فرزانہ انصاری صاحبہ کے نام اہم ہیں۔ اس سیشن کی صدر پروفیسر فہمیدہ منصوری صاحبہ کے تجزیہ کے ساتھ یہ سیشن تکمیل کو پہنچا۔

پریس ریلیز: شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج، برہان پور (ایم پی) 27 فروری 2022

راجستھان میں اردو تحقیق کے پروردہ: ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی

جے پور: ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی کی حیات و خدمات اور تحقیقی کاموں پر روشنی ڈالتے ہوئے عربک پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ٹونک کے فاؤنڈر ڈائرکٹر صاحبزادہ شوکت علی

خاں نے کہا کہ عثمانی صاحب جیسی شخصیت صدیوں میں جنم لیتی ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، حکومت ہند کے مالی تعاون سے آزاد ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر سوسائٹی، جے پور کے زیر اہتمام 27 فروری کو منعقدہ یک روزہ سمینار بعنوان 'راجستھان میں اردو تحقیق کے پروردہ: ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی' کی صدارت کرتے ہوئے انھوں نے مزید کہا کہ بابائے اُردو راجستھان ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی میرے ساتھی میرے دوست اور میرے ہمنوا تھے۔ وہ تاریخ ساز شخصیت تھے، ان کی خدمات کے اعتراف میں آج کا یہ سمینار بھی یقیناً اہمیت کا حامل ہے۔

سمینار میں جے پور، چورو، بیکانیر، اجمیر ٹونک، جودھپور و دیگر مقامات سے تشریف لائے اسکالرس نے شرکت کی۔ ادارے کے سکریٹری محمد محمود خان نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، حکومت ہند کے ڈائریکٹر ڈاکٹر عقیل احمد کا پیغام پڑھا جس میں انہوں نے سمینار کے انعقاد کے لیے تنظیم کا شکریہ ادا کیا اور اردو والوں کو اردو کی ترقی کے لیے حکومت ہند کی جانب سے شروع کیے گئے اردو کمپیوٹر سینٹر اور دیگر اسکیموں سے فائدہ اٹھانے کا پیغام دیا۔ ڈاکٹر زیبا زینت نے نظامت کرتے ہوئے کہا کہ ابوالفیض عثمانی صاحب کا نام محتاج تعارف نہیں۔ جہاں جہاں راجستھان کے علمی، ادبی، تحقیقی، تصنیفی تاریخی، حلقوں میں ذکر کیا جائے گا وہاں ہر شعبہ میں ہر گوشہ میں ابوالفیض عثمانی صاحب کا نام لازمی طور پر لیا جائے گا۔ عثمانی صاحب جے پور کے بڑے علمی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ابوالفیض عثمانی صاحب کے اسلاف نے جے پور میں علم و ادب کے چراغ روشن کیے یہ بھی قابل ذکر ہے کہ مختلف طلبا نے آپ کے خاندان کی تین پشتوں کے تقریباً 6 شخصیات کی حیات و کارناموں پر تحقیقی مقالے مرتب کرکے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ آپ کی حیات اور ادبی خدمات پر بھی لکھے گئے مقالے پر محترمہ شگفتہ نسرین کو پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی ہے۔

سمینار میں مولانا آزاد یونیورسٹی جودھپور سے تشریف لائے پروفیسر عزیز اللہ شیرانی نے کہا کہ عثمانی صاحب نے اردو پڑھنے والوں اور اسکالروں کی بے لوث خدمت کی ہے۔ آپ ہمہ وقت اردو اسکالر کے لیے حاضر رہتے تھے۔ شعبۂ اردو راجستھان یونیورسٹی کی صدر محترمہ ناصرہ بصری نے کہا کہ اردو ریسرچ کے ذریعہ ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی صاحب نے ہندو مسلم ایکتا اور قومی یکجہتی کے میدان میں اہم رول ادا کیا ہے۔

مذکورہ سمینار میں آل انڈیا یونانی طبی کانگریس، نئی دہلی کے سکریٹری جنرل ڈاکٹر سیّد احمد خاں نے بطور مہمان ذی وقار شرکت کی۔ انھوں نے کہا کہ آج سے تیس سال پہلے جناب انعام الحق علیگ مسکینی صاحب نے اردو اکادمی راجستھان کو جو اعزاز بخشا تھا اس میں ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی صاحب کی بہترین کارکردگی کی شمولیت خاص اہمیت کی حامل تھی۔

آل انڈیا ریڈیو کی ایگزیکیوٹیو محترمہ ریشما خان نے کہا کہ اردو قومی یکجہتی کی زبان ہے۔ آکاشوانی سے بہت پروگرام اردو زبان میں نشر ہوتے ہیں۔ آپ نے کہا کہ عثمانی صاحب آکاشوانی کے اردو پروگراموں سے بہت عرصہ تک جڑے رہے۔ درگاہ خواجہ صاحب اجمیر کے نائب ناظم ڈاکٹر محمد عادل نے عثمانی صاحب کی زندگی سے متعلق ایک دستاویز 'ڈاکٹر ابوالفیض ایٹ اے گلانس' فولڈر کی شکل میں پیش کیا۔

ڈاکٹر امبیڈکر لا یونیورسٹی کے کنٹرولر آف ایگزامنیشن ڈاکٹر ای اے حیدری نے کہا کہ راجستھان میں اردو کی کوئی بھی تحقیق عثمانی صاحب کی کتابوں کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ راجستھان اردو لیکچرر سنگھ کے صوبائی صدر و اردو اسکالر ڈاکٹر شمشاد علی نے کہا کہ ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی کی راجستھان سے متعلق اردو تحقیق بے مثال ہے جس کی نظیر مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ شاہد پٹھان نے بھی اپنا مقالہ پڑھ کر عثمانی صاحب کو خراج عقیدت پیش کیا۔ ڈاکٹر شگفتہ نسرین نے عثمانی صاحب کی زندگی کے گوشوں، علمی و تحقیقی سفر پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر شگفتہ نے 'ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی کامل کی شعری خدمات' موضوع پر مقالہ پیش کیا۔ سمینار میں بیکانیر سے تشریف لائے ڈاکٹر ضیاالحسن قادری نے 'قومی ایکتا

کوفروغ دینے والے محقق: ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی' راجپوتانہ ریسرچ اکیڈمی کے ڈائریکٹر ڈاکٹر شاہد جمالی نے 'ڈاکٹر عثمانی میری نظر میں' موضوعات پر مقالے پڑھے۔

پہلے اور اختتامی اجلاس کی نظامت کے فرائض بحسن وخوبی ڈاکٹر زیبا زینت (آل انڈیا ریڈیو، جے پور) نے انجام دیے اور دوسرے اجلاس کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر شگفتہ نسرین نے بخوبی انجام دیے۔

پریس ریلیز: محمد محمود خان، جے پور، 3 مارچ 2022

فروغ اردو زبان اور ہماری ذمے داریاں

رانچی: سحر فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے مالی تعاون سے بمقام معہد الفاروق، فاروق نگر دیوری پسکا نگری، رانچی میں یک روزہ سمینار بعنوان 'فروغ اردو زبان اور ہماری ذمہ داریاں' منعقد کیا گیا۔ سمینار میں اردو زبان و ادب اور فکشن کی معروف اور اہم شخصیات نے شرکت کی اور اپنے گراں قدر خیالات کا اظہار کیا۔ سبھی مقررین نے اردو زبان وادب کی اہمیت پر بے حد پر مغز گفتگو کی اور اردو میں ایسے موضوع پر سمینار کے لیے سحر فاؤنڈیشن کو مبارکباد دی۔ سمینار میں صدارتی کلمات ادا کرتے ہوئے پروفیسر جمشید قمر، سابق صدر شعبہ اردو، رانچی یونیورسٹی نے کہا کہ اردو زبان وادب کو آخر ہم کس طرح اپنے بچوں اور طالب علموں کے لیے دلچسپ بنا سکتے ہیں اور اردو کے عام قاری تک اس کی کس طرح رسائی کرسکتے ہیں اس پر بھی سوچنے کی ضرورت ہے۔

کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے مولانا شریف احسن مظہری (ایڈیٹر صدائے جرس) نے کہا کہ اردو زبان سے ہماری بے اعتنائی بڑھتی گئی تو دنیا ایک شیریں زبان اور اس کی تہذیب سے محروم ہوجائے گی۔ سمینار کا آغاز سحر فاؤنڈیشن کے جنرل سکریٹری اور سمینار کے کنوینر عمر بن عبدالعزیز ندوی کے خیر مقدمی کلمات سے ہوا۔ انھوں نے اردو زبان کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان بڑی سخت جان ہے۔ مصائب کے تھپیڑے اور اپنوں اور غیروں کی سازشوں کے باوجود پھل پھول رہی ہے۔ سمینار کے مہمان خصوصی ایم زیڈ خان، سکریٹری جمہوریت پسند مصنفین نے کہا کہ اردو ادب ادب عالیہ سے الگ نہیں ہے بلکہ اس کا ایک اہم اور اٹوٹ حصہ ہے۔

مہمان ذی وقار حضرت مولانا تہذیب الحسن رضوی (امام وخطیب جعفریہ مسجد) محمد کلام آزاد (سماجی کارکن) کیشو کمار بھگت (سینئر صحافی) نے کہا کہ اردو زبان وادب کے مختلف موضوعات پر یونیورسٹیوں میں تحقیق ہونی چاہیے۔ ابھی بھی کئی تخلیق کار ایسے ہیں جن کی خدمات بہت ہیں۔ ہم ابن صفی، منشی تیرتھ رام فیروز پوری کے علاوہ اور کتنے ادیبوں کو جانتے ہیں۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ایسے ادیبوں کی خدمات کو منظر عام پر لائیں۔

سمینار کے دیگر مقالہ نگاران ڈاکٹر شاکر تسنیم، اعجاز ندوی، غلام صمدانی اور ذکی اللہ مصباحی وغیرہ نے کہا کہ ہندو پاک میں تو دینی مدارس میں ذریعہ تعلیم اردو ہی ہے، لیکن امریکہ، یوروپ اور افریقی ملکوں میں بھی آزاد دینی مدارس میں تدریس کی زبان اردو ہی ہے، اس لیے مسلمانوں کے حق میں یقیناً اردو زبان کی اہمیت دوچند ہے۔ اردو ان کے مذہبی اور تہذیبی ورثہ کی امین ہے، اردو سے رشتہ کی استواری اپنی تاریخ، اپنے مذہب، اور اپنی فکری اور تہذیبی روایات سے مربوط ہونا ہے اور چند باتوں کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے کہ جب تک اردو میڈیم اسکولوں کا انتظام حکومت کی طرف سے نہیں ہوتا اپنے بچوں کو گھر پر اردو تعلیم کا انتظام کریں۔ اردو رسالے، میگزین اور کتب مفت نہ طلب کریں بلکہ خرید کر پڑھیں اور اپنے گھروں میں روزانہ ایک اردو کا اخبار ضرور منگوائیں، ایسا کرنے سے انشاء اللہ اردو کے فروغ کو کوئی نہیں روک سکتا۔

آخر میں مہمانوں اور مقالہ نگاران کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فاؤنڈیشن کے جنرل سکریٹری عمر بن عبدالعزیز نے سمینار کو کامیاب بنانے کے لیے سامعین اور منتظمین کا بھی دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کیا۔ سمینار کی نظامت شعبۂ اردو رانچی یونیورسٹی کے اسسٹنٹ پروفیسر محمد رضوان علی نے کی۔

پریس ریلیز: عمر بن عبدالعزیز، جنرل سکریٹری، سحر فاؤنڈیشن، رانچی، 2 مارچ 2022

ادب کی قرۃ العین

حیدر آباد: قرۃ العین حیدر اردو فکشن ہی نہیں بلکہ اردو ادب کے تخلیقی منظرنامے پر واقعتاً اردو ادب کی 'قرۃ العین' ہی ہیں۔ وہ اپنے زمانے میں بھی معتبر تھیں، آج بھی مقبول ہیں اور مستقبل میں بھی مستند حوالے کی حیثیت سے اپنا مقام بنائے رکھیں گی۔ ان

خیالات کا اظہار سابق ڈین آرٹس فیکلٹی، سابق صدر شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی اور سابق ڈائرکٹر قومی اردو کونسل پروفیسر ارتضی کریم نے شعبہ اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کی جانب سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے مالی تعاون سے منعقدہ توسیعی خطبہ بہ عنوان 'ادب کی قرۃ العین' میں دوران خطاب کیا۔ اس جلسے کی صدارت پروفیسر ایس ایم رحمت اللہ، نائب شیخ الجامعہ نے کی۔ اس میں بطور مہمان خصوصی ممتاز نقاد، محقق اور سابق صدر شعبہ اردو، جامعہ عثمانیہ پروفیسر اشرف رفیع نے شرکت کی۔ پروفیسر ارتضی کریم نے اپنے توسیعی لیکچر میں قرۃ العین حیدر کی گوناگوں شخصیت اور ان کے تخلیقی کارناموں کو بھرپور خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان کی تخلیقات سے پھوٹنے والی کرنیں ہمارے ادب کو ہی نہیں، ہماری زندگی کو بھی منور کرتی ہیں۔ پروفیسر اشرف رفیع نے اس موقعے پر کہا کہ قرۃ العین حیدر کے ناولوں کا کینوس بے حد وسیع ہے۔ ان میں کرداروں کی ایک وسیع دنیا آباد ہے۔ انھوں نے تاریخ کے موضوعات پر ناول ضرور لکھے لیکن انھیں تاریخی ناول نہیں کہا۔ انھوں نے سفرنامے بھی بہت اچھے لکھے۔ مہمان اعزازی پروفیسر عزیز بانو، ڈین اسکول برائے السنہ و ہندوستانیات نے کہا کہ شعبہ اردو اس بات کے لیے مبارکباد کا مستحق ہے کہ اس کی جانب سے قرۃ العین حیدر جیسی عبقری شخصیت پر توسیعی خطبات کا آغاز کیا گیا ہے۔ پروفیسر ایس ایم رحمت اللہ نے کہا کہ اہل دانش وبینش کی نظر میں اہل قلم کہلانے کے مستحق ایسے قلمکار ہوتے ہیں جن کی انگلیاں زمانے کی نبض اور وقت کے نشیب وفراز پر ہوتی ہیں۔ قرۃ العین حیدر کا شمار ایسے ہی عظیم قلمکاروں میں ہوتا ہے۔ صدر شعبہ اردو پروفیسر فاروق بخشی نے توسیعی خطبے کے آغاز میں استقبالیہ کلمات پیش کیے اور شعبے کی سرگرمیوں سے واقف کرایا۔ جلسے میں شعبے کے اساتذہ پروفیسر ابوالکلام، پروفیسر شمس الہدیٰ دریابادی، ڈاکٹر ابوشہیم خان، ڈاکٹر جابر حمزہ، ڈاکٹر بدر سلطانہ کے علاوہ طلبا کی ایک بڑی تعداد آن لائن شریک تھی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 4 مارچ 2022

پروفیسر منظر اعظمی توسیعی لیکچر

جموں: شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان حکومت ہند نئی دہلی کے اشتراک سے 'غیر افسانوی نثر کی اہمیت' کے موضوع پر پروفیسر منظر اعظمی

میموریل لیکچر کا انعقاد کیا گیا جس میں دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر ابن کنول نے موضوع سے متعلق پر مغز لیکچر دیا۔ اس دوران ڈین ریسرچ اسٹڈیز جموں یونیورسٹی پروفیسر رجنی ڈینگرا نے پروگرام کی صدارت کے فرائض انجام دیے جب کہ سابق صدر شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی پروفیسر قدوس جاوید مہمان ذی وقار تھے۔ پروگرام کے استقبالیہ خطبے میں پروفیسر محمد ریاض احمد صدر شعبہ اردو جموں یونیورسٹی نے کہا کہ اس لیکچر کے لیے مالی امداد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی نے فراہم کی ہے اور شعبہ اردو 2009 سے لگاتار ہر سال پروفیسر منظر اعظمی میموریل لیکچر کا انعقاد کرتا آرہا ہے۔ پروفیسر محمد ریاض احمد نے پروفیسر منظر اعظمی کو اردو کا ایک قد آور ادیب قرار دیتے ہوئے کہا کہ پروفیسر موصوف نے 'اردو میں تمثیل نگاری' اور 'سب رس کا تنقیدی جائزہ' سمیت درجنوں کتابیں لکھیں جو دنیا کی مختلف یونیورسٹیوں کے نصاب میں پڑھائی جاتی ہیں۔ پروفیسر ابن کنول نے کہا کہ پروفیسر منظر اعظمی کی اردو ادب میں خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ پروفیسر قدوس جاوید نے زبان، طرز اسلوب کے تناظر اور مابعد جدید نثر کی بنیادی چیزوں کے بارے میں بھی سامعین کو جانکاری دی۔ اپنے صدارتی خطاب میں ڈین ریسرچ اسٹڈیز جموں یونیورسٹی پروفیسر رجنی ڈینگرا نے ان دنوں کے بارے میں بتایا جب پروفیسر منظر اعظمی شعبہ اردو میں پروفیسر کے طور پر خدمات انجام دیتے تھے۔ پروفیسر رجنی ڈینگرا نے کہا کہ شعبہ اردو میں بہت عظیم شخصیات مثلاً پروفیسر گیان چند جین، پروفیسر شام لال کالرا، پروفیسر جگن ناتھ آزاد اور منظر اعظمی وغیرہ نے خدمات انجام دیں جو کہ شعبہ کے لیے باعث فخر ہے۔ انھوں نے کہا کہ پروفیسر منظر اعظمی میموریل لیکچر کا انعقاد حقیقی معنوں میں اس عظیم اردو ادیب کو بہترین خراج عقیدت ہے۔ پرنسپل انسٹی ٹیوٹ آف میوزک اینڈ فائن آرٹس جموں یونیورسٹی پروفیسر شہاب عنایت ملک نے بھی اپنے خطاب میں پروفیسر منظر اعظمی کی خدمات کو سراہا اور پروفیسر ابن کنول کے لیکچر کو طلبا اور اردو سے شغف رکھنے والوں کے لیے کافی معلوماتی قرار دیا۔ اس دوران ڈاکٹر فرحت شمیم، اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو جموں یونیورسٹی نے نظامت کے فرائض انجام دیے جبکہ شکریہ کی تحریک ڈاکٹر چمن لال، اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو جموں یونیورسٹی نے پیش کی۔ اس موقعے پر طلبا، فیکلٹی ممبران اور سول سوسائٹی ممبران نے پروگرام میں شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 4 مارچ 2022

تحریک آزادی میں اردو زبان وادب کا کردار

نئی دہلی: جنگ آزادی میں علمائے کرام نے سب زیادہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا اور اپنے جان و مال، آل واولاد کی قربانیاں پیش کیں، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی

خان، مولانا محمد علی جوہر، مولانا حسرت موہانی جیسے لاتعداد علمائے کرام نے جنگ آزادی میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ ان کلمات کا اظہار جناب پروفیسر غلام یحییٰ انجم نے ملی ماڈل اسکول میں منعقد ایک قومی سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے اپنی افتتاحی تقریر میں کیا۔ 'تحریک آزادی سے وابستہ علما کی اردو خدمات' پر محمد اشرف یاسین نے اپنا مقالہ پڑھا۔ روزنامہ انقلاب، نئی دہلی ایڈیشن کے سب ایڈیٹر اور جواہر لال نہرو یونیورسٹی سے تعلیم یافتہ ڈاکٹر مظہر حسنین نے 'تحریک آزادی اور اردو میں غیر افسانوی ادب' پر اپنا پیپر پیش کیا۔ ڈاکٹر نعمان قیصر نے 'تحریک آزادی اور اردو ناول' پر مقالہ پڑھا اور جامعہ ملیہ اسلامیہ شعبہ اردو کے استاد ڈاکٹر خالد مبشر نے 'تحریک آزادی میں اردو شاعری کا کردار' کے موضوع پر بہترین ریسرچ پیپر پیش کیا۔ دہلی کے معروف صحافی جناب غوث سیوانی نے 'تحریک آزادی میں تعلیمی تحریکوں کا رول' پر مقالہ قلمبند کیا تھا جب کہ 'تحریک آزادی اور اردو صحافت' پر دہلی کے مشہور اور سینئر صحافی جناب سہیل انجم نے پیپر پڑھا۔ پروگرام سے خطاب کرتے ہوئے رحمانیہ نیشنل فاؤنڈیشن کے روح رواں محمد رفیق خان نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہم سب کو اردو فروغ اور اردو کی تعلیم و ترویج اس کی نشر و اشاعت کے لیے کام کرتے رہنا چاہیے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ شعبہ اردو کے سابق پروفیسر خالد محمود نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ آج ہم اپنی نئی نسل کو اپنے اسلاف کی قربانیوں سے آگاہ کریں، ہم لوگ اردو بلکہ مختلف علوم وفنون کی کتابوں کو خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو پڑھنے کی تلقین بھی کریں۔ واضح رہے کہ نظامت کے فرائض جناب غوث سیوانی نے انجام دیے اور ڈاکٹر نعمان قیصر نے تمام سامعین و منتظمین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 28 فروری 2022

اردو کا فروغ اور انٹرنیٹ

کھتولی: مظفر نگر میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے تعاون سے گولڈن پیکاک فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام تعمیر ملت سیمینار ہال مملانا روڈ مظفر نگر میں 'اردو کا فروغ اور انٹرنیٹ' کے عنوان پر ایک روزہ سیمینار کا انعقاد کیا گیا جس میں راجیش کمار ضلع

پروگرام آفیسر نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی، سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے فیض عام ڈگری کالج کے پروفیسر ڈاکٹر محمد اسلم نے کہا کہ یہ خوشی کی بات ہے کہ اردو زبان نے اب وہ مقام حاصل کرلیا ہے کہ آج خود کو کمپیوٹر کی زبان بنالیا ہے، جس کی وجہ سے اب آپ کو انٹرنیٹ اور کمپیوٹر کے استعمال کے لیے کسی دوسری زبان کی ضرورت نہیں۔ مولانا محمد آصف ندوی نے ڈیجیٹل اردو پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ آج کے دور میں اردو میں ڈیجیٹل لائبریری موجود ہے اور انٹرنیٹ پر کئی اہم ادبی، ثقافتی اور تعلیمی

ویب سائٹس موجود ہیں، اس کے علاوہ آج اردو صحافت کو انٹرنیٹ کے استعمال نے بہت زیادہ بلندیوں پر پہنچا دیا ہے۔ اس موقعے پر اتر پردیش اردو اکادمی کے ایوارڈ یافتہ جناب ایاز احمد طالب نے اردو ٹیکنالوجی کے بارے میں کہا کہ جہاں تک سائبر اسپیس کے استعمال کا تعلق ہے تو یہاں وسائل بے شمار ہیں، آڈیو، ویڈیو اور ڈیجیٹل ٹیکنالوجی کی مدد سے ہم ہر مشکل پر قابو پا سکتے ہیں۔ سرکردہ صحافی قاری شاہد حسینی نے کہا کہ اردو زبان اور اردو ادب نے انٹرنیٹ پر اہم مقام حاصل کرلیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو نئی دہلی کی جانب سے اردو کی ترقی کے لیے سیمناروں کا انعقاد اپنے آپ میں ایک اہم کارنامہ ہے جو قابل ستائش ہے۔ تعمیر ملت کے منیجر مستجاب خان نے سیمنار کی صدارت و ماسٹر الطاف مشعل نے نظامت کے فرائض انجام دیے، عبدالحق سحر، راجیش کمار و مستجاب خان نے بھی اظہار خیال کیا اور ٹرسٹ کے صدر وسیم احمد نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 28 فروری 2022

اردو زبان وادب کی ترقی میں لکھنؤ کا کردار

لکھنؤ: لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے مسعود حسن رضوی ہال میں یک روزہ سیمنار بعنوان 'اردو زبان وادب کی ترقی میں لکھنؤ کا کردار' منعقد ہوا۔ اہم شخصیات نے اردو زبان وادب میں لکھنؤ کی تہذیب کے کردار پر روشنی ڈالی۔ سیمنار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان وزارت تعلیم حکومت ہند کے مالی تعاون سے ادبی تنظیم 'پریرنا' کے زیر اہتمام منعقد ہوا۔ پروفیسر عباس رضا نیر مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوئے اور کہا کہ اردو عربی کی بیٹی ہے اور فارسی کی بہن ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں مجوزہ موضوع کو جیا اور حتی المقدور اردو کی خدمت کے لیے کوشاں رہتا ہوں۔ مہمان اعزازی ڈاکٹر فاضل احسن ہاشمی نے کہا کہ اردو صرف ایک زبان نہیں تہذیب بھی ہے اور اسی تہذیب کو شہر لکھنؤ نے پروان چڑھایا۔ ملک ہندوستان جس کی شناخت مشترکہ تہذیب ہے، اس کا بہترین نمونہ سرزمین لکھنؤ ہے۔ جہاں مختلف عقائد ونظریات کے افراد ہم آہنگی کے ساتھ رہتے ہیں۔ زبان کا تعلق دراصل ماحول سے ہے، اردو کسی خاص فرقے اور مذہب کی زبان نہیں ہے۔

مہمان ذی وقار ڈاکٹر اوپی شکلا نے کہا کہ ہندوستانی تہذیب ہی ہماری شناخت ہے۔ پریرنا تنظیم کے روح رواں ڈاکٹر آر پی سنگھ نے کہا کہ اردو زبان کا شمالی ہندوستان اور بطور خاص لکھنؤ میں ایک اہم اور کلیدی کردار رہا ہے۔ یہاں کی مشترکہ تہذیب آپس میں بھائی چارے کی بہترین مثال ہے۔ ڈاکٹر اے اے اصلاحی نے کہا کہ اودھ کی تہذیب صرف زبان نہیں بلکہ ایک حسن ہے، لکھنؤ دنیا کے لیے آج بھی ادبی پناہ گاہ ہے۔ ڈاکٹر غنی احمد نے زبان کی اہمیت اور ضرورت پر روشنی ڈالی اور کہا کہ زبان کسی دباؤ کو برداشت نہیں کرتی۔ یہ تو ضرورت کے تحت وجود میں آتی ہے۔ سیمنار میں رہبر علی، غلام عباس ہلوری، عبدالقدوس گوپامئوی، سفیان احمد انصاری بہرائچی، شاہد رضا، صائمہ انصاری، نکہت زہرا اکبرپوری، افزا خاتون، محمد حسن، الماس احمد انصاری، محمد شہزاد، عون عباس، تحسین، محمد رازی، ثوبیہ صدیقی، حیدر رضا وغیرہ نے مقالات پیش کیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 فروری 2022

'عربی اردو شاعری اور خواتین: تخلیق اور محرک تحریک

نئی دہلی: شعبہ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک و تعاون سے 'عربی اردو شاعری اور خواتین: تخلیق اور محرک تحریک' کے موضوع پر دو روزہ قومی سیمنار کی افتتاحی جلسہ کا جامعہ کے سی آئی ٹی ہال میں انعقاد کیا گیا جس کی صدارت پروفیسر انیس الرحمٰن (سابق صدر شعبۂ انگریزی، جامعہ ملیہ اسلامیہ) نے کی جب کہ ڈاکٹر شمس کمال انجم (صدر شعبۂ عربی، بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی، راجوری، جموں کشمیر) نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔ سیمنار کے کوآرڈینیٹر پروفیسر فوزان احمد نے تمام مہمانوں کا استقبال کیا اور صدر جلسہ اور کلیدی خطیب کا تعارف پیش کیا۔ آپ کے بعد سیمنار کے ڈائرکٹر اور صدر شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اپنے افتتاحی خطاب میں صدر جلسہ، مہمان خطیب، اساتذہ، مہمانان گرامی اور ریسرچ اسکالرس اور طلبہ وطالبات کا استقبال کرتے ہوئے سیمنار کے موضوع کی وضاحت کی، نیز فن شعر میں عربی اور اردو کی مشہور شاعرات اور ان کی خدمات کا تذکرہ کیا اور ساتھ ہی عربی اور اردو شاعری میں عورت کے تصور پر گفتگو کی، آپ نے عربی اور اردو میں غزل، مرثیہ اور دیگر شاعری کی اصناف پر گفتگو کرتے ہوئے ان میں شاعرات کی خدمات نیز شعرا کے یہاں ان کی شاعری میں عورت کے تصور پر بھی روشنی ڈالی نیز عربی اردو شاعری میں ماں کے موضوع کا بھی تذکرہ کیا۔ صدر شعبہ کے بعد اس سیمنار کے کلیدی خطیب ڈاکٹر شمس کمال انجم نے اپنے خطبہ میں کہا کہ عورت کے وجود ہی سے سخن کی آبیاری ہوتی ہے، فاضل خطیب نے عربی اور اردو شاعری کی تمام اصناف پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اگر شعر میں عورت کی تحریک کی بات کی جائے تو یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ شاعری کا اکثر حصہ اسی کی وجہ ہی سے ہے، آپ نے اپنے خطاب میں عربی اردو شاعرات میں خنسا، ولادہ بنت مستکفی، نازک الملائکہ اور فدوی طوقان کے علاوہ اردو کی شاعرات میں کشور ناہید، پروین شاکر وغیرہ کی شاعری کی مختلف اصناف میں خدمات کا تذکرہ کیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 3 مارچ 2022

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

دھلی

طب یونانی کے فروغ اور بقا میں حکیم اجمل خان اور حکیم عبدالحمید کا کردار

نئی دھلی: طب یونانی کے فروغ اور بقا میں حکیم اجمل خان اور حکیم عبدالحمید کی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے جامعہ ہمدرد کے وائس چانسلر پروفیسر افشار عالم نے کہا کہ طب یونانی کے فروغ اور اسے مقبول بنانے میں انھوں نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ یہ بات انھوں نے جامعہ ہمدرد میں یونانی ڈے کے موقعے پر منعقدہ پروگرام سے خطاب کرتے ہوئے کہی۔ انھوں نے کہا کہ خصوصی طور پر حکیم عبدالحمید نے تعلیمی بیداری اور عوام کی صحت کے لیے نمایاں کام کیا ہے اور جامعہ ہمدرد اور ہمدرد اسکول اس کی جیتی جاگتی مثال ہے۔ نیشنل کمیشن برائے انڈین سسٹم آف میڈیسن کے صدر، ویدجینت دیو پجاری جی نے طلبا کو یونانی پیتھی کے عمیق مطالعے کی طرف راغب کیا اور ساتھ ہی سائنسی تحقیقات کو عام فہم زبان میں بیان کرنے کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے اساتذہ کو طلبا کے مستقبل کے لیے معاون ہونے پر زور دیا، ساتھ ہی گورنمنٹ کی طرف سے ہر ممکن مدد کا بھروسہ بھی دلایا۔ پروگرام کے مہمان خصوصی عاصم علی خان، ڈائرکٹر جنرل، سینٹرل کاؤنسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن، سی سی آر یو ایم، وزارت آیوش، گورنمنٹ آف انڈیا نے اپنے خطاب میں کاؤنسل کی نمایاں کارکردگیوں کو بیان کیا، ساتھ ہی اس کے ذریعے کی جانے والی ریسرچ سے عوام کو روشناس کرایا۔ انھوں نے مشترکہ ریسرچ پروجیکٹس پر جامعہ ہمدرد کے ساتھ تعاون کا بھی یقین دلایا۔ طب یونانی کی موجودہ دور میں افادیت اور معنویت کے موضوع پر کلیدی خطبہ اے اینڈ یو طبیہ کالج قرول باغ کے سابق پرنسپل اور صدر شعبہ علم الادویہ وصیدلہ پروفیسر محمد ادریس صاحب نے پیش کیا۔ پروگرام کی صدارت جامعہ ہمدرد کے چانسلر اور ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن کے چیف متولی حماد احمد نے کی۔ پروگرام کے آخر میں سید سعود اختر، رجسٹرار جامعہ ہمدرد نے تمام مہمانوں، اراکین میڈیا اور انتظامیہ کا شکریہ ادا کیا۔ خصوصی طور پر پروگرام کی آرگنائزنگ ٹیم ممبران ڈاکٹر خورشید احمد، پروفیسر محمد اکرم، ڈاکٹر عظمہ بانو اور ڈاکٹر سیما رانی کو پروگرام کی کامیابی پر مبارکباد دی۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 16 فروری 2022

دہلی کی تاریخ وثقافت

نئی دھلی: اردو اکادمی، دہلی کے زیراہتمام توسیعی خطبات سیریز بہ عنوان 'دہلی کی تاریخ وثقافت' کے تحت قمر

رئیس سلور جبلی آڈیٹوریم، کشمیری گیٹ دہلی میں پہلے خطبے کا انعقاد کیا گیا۔ اس توسیعی خطبات سیریز کا پہلا توسیعی خطبہ بعنوان 'کچھ پرانی دلی کے بارے میں' اردو فارسی کے معروف محقق واسکالر پروفیسر شریف حسین قاسمی، مشیر برائے دہلی آرکائیوز حکومت دہلی و سابق صدر، شعبۂ فارسی، دہلی یونیورسٹی نے پیش کیا۔ پروگرام کی صدارت ذاکر حسین دلی کالج کے سابق پرنسپل اور دہلی کی تاریخ و ثقافت کے اہم ستون ڈاکٹر ریاض عمر اور نظامت ڈاکٹر شفیع ایوب نے کی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر شفیع ایوب نے خطبات سیریز کے آغاز کا مقصد اس کے فوائد اور دہلی کی تاریخ وتہذیب کے حوالے سے مختصر گفتگو کی۔ پروفیسر شریف حسین قاسمی نے توسیعی خطبات سیریز کے پہلے خطبے بعنوان 'کچھ پرانی دلی کے بارے میں' پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ آج کے اس خطبے کا موضوع بنیادی طور پر ترکوں کی حکومت کے آغاز سے اس کے اختتام تک ہے۔ انھوں نے مختلف حوالوں سے درج بالا عنوان پر تفصیلی گفتگو کی اور بتایا کہ تاریخ دانوں نے ایک عہد کو سلطانی عہد قرار دیا ہے۔ بہت سے بادشاہ تھے، جو خود کو بادشاہ نہیں کہتے تھے بلکہ سلطان کہتے تھے، اس لیے ان کے زمانے کو سلطان پیریڈ کہا جاتا ہے۔ پروفیسر قاسمی نے مزید کہا کہ دنیا کے متعدد علاقوں اور خطوں سے علما، ادبا، اطبا، کاریگر اور صنعت گر آباد ہوتے رہے اور یہاں سے کبھی کوئی واپس نہیں ہوا۔ دہلی میں یا پورے ہندوستان میں اکثریت غیرمسلموں کی رہی، یہاں کے تمام باشندوں نے آنے والوں کی خوب عزت کی، سیاحوں نے واپس جا کر ہندوستان، ہندوستانیوں اور دہلی والوں کی خوب تعریفیں کیں۔ دہلی ایک مسلم شہر کی حیثیت سے پوری مسلم دنیا میں مشہور ہوگیا تھا۔ تقویم البلدان کے مصنف نے لکھا ہے کہ دہلی پتھریلی ہے اور شہر سے ایک فرسخ دور ایک دریا بہتا ہے، جو فرات سے چھوٹا ہے۔ قطب مینار دنیا کا بے نظیر مینار ہے، جو سنگ سرخ سے تعمیر کیا گیا ہے۔ شہاب الدین العمری نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ یہ سلطنت بہت وسیع ہے۔ دہلی کئی شہروں کا مجموعہ ہے۔ اگر کوئی دہلی کو ام البلاد کہے تو شاید یہ مبالغہ نہیں ہوگا۔ میرتقی میر نے دہلی کی جو تصویر کھینچی ہے اس سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔ دہلی کو اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں سب سے زیادہ کچلا گیا۔ ان سب کے باوجود یہ شہر ہر زمانے میں ممتاز رہا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے بھی دہلی کے بارے میں ایک قصیدہ لکھا ہے۔ ان کے مدرسے میں پورے عالم اسلام کے طلبا موجود تھے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 14 فروری 2022

ملاقات ایک فنکار سے

نئی دھلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کے 'ہم سب ڈراما گروپ' کے زیراہتمام آن لائن پروگرام 'ملاقات ایک فنکار سے' میں مشہور ڈراما نگار اور ڈائرکٹر جناب سلیم عارف نے شرکت فرمائی۔ اس آن لائن پروگرام میں پروفیسر محمد کاظم نے سلیم عارف کا تعارف کرایا اور ان کے فن اور تجربات سے متعلق سوالات کیے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے کہا کہ 'ہم سب ڈراما گروپ' غالب انسٹی ٹیوٹ کی ایک فعال شاخ ہے جس نے اب تک دہلی اور بیرون دہلی 200 سے زائد ڈرامے اسٹیج کیے ہیں۔ ڈاکٹر رخشندہ جلیل اس گروپ کی چیرپرسن ہیں اور پروفیسر محمد کاظم اس کی ذیلی کمیٹی کے ممبر

ہیں۔ ان کی سرپرستی میں یہ گروپ ترقی کی منزلوں کو طے کر رہا ہے۔ جناب سلیم عارف ڈراما اور اسٹیج کی دنیا میں محتاج تعارف نہیں ہیں۔ ان کے ڈرامے خصوصاً ’غالب نامہ‘ ساری دنیا میں ان کی مقبولیت کا سبب ہیں، میں شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اپنے قیمتی لمحات میں سے ہمارے لیے وقت نکالا۔ جناب سلیم عارف نے کہا کہ میں نے اپنے لیے ایسی راہ چنی جس کی ہمارے گھر میں کوئی روایت نہیں تھی۔ میں نے غالب کے تعلق سے کافی مطالعہ کیا ہے، خصوصاً ان کے خطوط میری خاص توجہ میں رہے۔ میرا خیال ہے بلکہ تمام غالب شناس اس بات پر متفق ہیں کہ خطوط غالب کے بغیر غالب کو سمجھنا ممکن نہیں ہے۔ تھیٹر ایک ایسا ذریعہ ہے جس کی تاریخ 4000 سال پرانی ہے، اسی لیے میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ صنف ہمیشہ موجود رہے گی۔ تھیٹر اس وقت تک رہے گا جب تک انسان رہے گا۔ ڈاکٹر محمد کاظم نے کہا کہ سلیم عارف صاحب کا تعارف کرانا اس لیے بہت مشکل ہے کہ ان کی شخصیت کے بہت سارے پہلو ہیں۔ انھوں نے ڈرامے کی تنقید سے متعلق نہایت عالمانہ مضامین لکھے ہیں اور فلموں میں بھی ان کا کام بہت الگ نوعیت کا ہے، ایسا کام جس کی طرف لوگ آسانی سے جانا نہیں چاہتے۔

روزنامہ ’ہندوستان ایکسپریس‘ دہلی، 19 فروری 2022

غالب انسٹی ٹیوٹ میں دہلی کی جامعات کے سینئر اساتذہ کا اعزاز

نئی دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی اور ابن سینا اکیڈمی علی گڑھ کے زیر اہتمام شعبہ عربی کے سینئر اساتذہ کو غالب انسٹی ٹیوٹ کے آڈیٹوریم میں اعزاز و اکرام سے نوازا گیا۔ اس موقعے پر منعقدہ تقریب میں ابن سینا اکیڈمی کے صدر پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن نے تمام اساتذہ کو شال اور مومنٹو پیش کیے۔ اپنی تقریر میں انھوں نے کہا کہ اساتذہ عربی اپنی گرانقدر خدمات کی وجہ سے ہندوستان کا نام پوری دنیا میں روشن کر رہے ہیں اور وہ کبھی اپنی ذمے داری سے سبکدوش نہیں ہوتے، وہ معاشرہ کی اصلاحات تا زندگی کرتے ہیں، اساتذہ کو مثالی معلم کا کردار ادا کرنا چاہیے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے کہا کہ تمام اساتذہ قابل مبارکباد ہیں کہ عربی زبان و ادب میں گرانقدر خدمات کے اعتراف میں انھیں یہ اعزاز بخشا جا رہا ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کی ہمیشہ کوشش رہتی ہے کہ عربی، فارسی، تاریخ اور دیگر شعبوں سے ہمارا علمی رشتہ مضبوط ہو۔ پروفیسر زبیر احمد فاروقی سابق صدر شعبہ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی نے اپنے خطاب میں کہا کہ ابن سینا اکیڈمی میں ہزاروں کی تعداد میں امہات الکتب موجود ہیں، جن سے عربی و طب یونانی کے طلبہ مستفید ہو رہے ہیں۔ انڈیا عرب کلچرل سینٹر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ڈائرکٹر پروفیسر محمد ایوب تاج الدین ندوی نے کہا کہ ابن سینا اکیڈمی میں اسلامی ثقافت کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے، عالمی سطح پر ایسے اداروں کا باہمی تبادلہ ہونا چاہیے، تاکہ اس کے کام کا دائرہ مزید وسیع ہو سکے۔ شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر سید حسنین اختر نے کہا کہ ابن سینا اکیڈمی کے پلیٹ فارم سے پروفیسر سید ظل الرحمٰن صاحب بہت اچھا کام کر رہے ہیں، اسلاف کے کارناموں کی طرف ہماری توجہ ہونی چاہیے۔ پروفیسر شفیق احمد خان ندوی سابق صدر شعبہ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ نے کہا کہ عہد نبوی سے پہلے بھی طب موجود تھا۔ سینٹر آف عربک اینڈ افریکن اسٹڈیز کے صدر پروفیسر رضوان الرحمٰن نے کہا کہ عربی زبان کا استعمال دنیا کے ہر حصے میں ہو رہا ہے، ضرورت ہے کہ ہم اپنے میدان کو مزید وسیع کریں اور ابن سینا اکیڈمی نے جو شروعات کی ہے اس کو آگے بڑھائیں، عربی مخطوطات پر خاطر خواہ کام نہیں ہوا ہے، اس پر توجہ کی ضرورت ہے۔ تقریب کی نظامت ڈاکٹر فخر عالم نے کی۔

روزنامہ ’ہندوستان ایکسپریس‘ دہلی، 19 فروری 2022

آپ کی مادری زبان آپ کی شناخت ہے

نئی دہلی: بین الاقوامی یوم مادری زبان کی یاد میں دفتر ڈین اسٹوڈینٹس ویلفیئر (ڈی ایس ڈبلیو) جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام مباحثہ سوسائٹی ’بول‘ نے ’آپ کی مادری زبان آپ کی شناخت ہے‘ کے موضوع پر یونیورسٹی میں مورخہ اکیس فروری دو ہزار بائیس کو دو لسانی تقریری مقابلہ منعقد کیا۔ مقابلے میں یونیورسٹی کے طلبا نے جوش و خروش کے ساتھ حصہ لیا۔ شرکا نے آدمی کی انفرادیت کی تشکیل اور ملک کو خود مختار بنانے میں مادری زبان کے تحفظ کی اہمیت کے موضوع پر اپنے افکار و خیالات کا اظہار کیا۔ تقریری مقابلے میں شریک طلبا نے ہندی اور اردو میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پروگرام کے آغاز میں پروگرام کے میزبان جناب روشن راج نے سب کے سامنے مقابلے کے قواعد و ضوابط پڑھ کر سنائے۔ پروگرام میں جج کے فرائض تین اراکین یعنی پروفیسر فوزیہ ندیم فیکلٹی آف ایجوکیشن، ڈاکٹر غلام یزدانی فیکلٹی آف لا اور ڈاکٹر صدف فاطمہ شعبہ بایو سائنس پر مشتمل پینل نے انجام دیے۔ پینل کی اہم اور ممتاز شخصیت ڈاکٹر غلام یزدانی نے ہر سال اکیس فروری کو منائے جانے والے بین الاقوامی یوم مادری زبان کے سلسلے میں اس کی اہمیت و معنویت پر روشنی ڈالی۔ ڈی ایس ڈبلیو پروفیسر ایوب خان، ججوں، کنوینر ڈاکٹر شیما علیم، کو کنوینر ڈاکٹر عصمت جہاں اور تقریری مقابلہ کو منعقد کرانے والے منتظمین کی خدمت میں شکریہ کے ساتھ پروگرام اختتام پذیر ہوا۔

تقریری مقابلہ کے نتائج کا اعلان بعد میں ہوا جس میں ہندی زبان کے زمرے میں عالیشہ خان (بی اے پروگرام) نے پہلا مقام حاصل کیا۔ انوراگ اپادھیائے (بی اے ایل ایل بی آنرس) ریگولر نے دوسری پوزیشن حاصل کی اور آشانہ علی (بی اے پروگرام) نے تیسرا مقام حاصل کیا۔ اردو زبان کے زمرے میں پہلا مقام محمد فیصل خان (بی ایس سی آنرس اپلائیڈ میتھ میٹک) نے حاصل کیا، محمد شمس تبریز (بی اے، ایل ایل بی آنرس) نے دوسرا اور مہ رخ عالیہ (ڈپلوما ان الیکٹریکل انجینئرنگ) نے تیسرا مقام حاصل کیا۔

روزنامہ ’ہندوستان ایکسپریس‘ دہلی، 24 فروری 2022

اتر پردیش

انسانی صلاحیت، زبان اور فکر

علی گڑھ: مشہور مفکر، ماہر لسانیات اور فلسفی پروفیسر نوم چومسکی نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) کے شعبہ لسانیات کے زیر اہتمام ’انسانی صلاحیت، زبان اور فکر‘ کے موضوع پر آن لائن خطبہ دیتے ہوئے یہ واضح کیا کہ انسان زبان کی صلاحیت اور اسے لامتناہی تخلیقی طریقوں سے استعمال کرنے کی صلاحیت کیوں رکھتا ہے۔ پروفیسر چومسکی نے کہا کہ لوگ زبان سیکھنے کی اہلیت کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں اور ابتدائی دنوں سے ہی ہم نے اپنے اردگرد کیا ہو رہا ہے۔ اس کے بارے میں دوسروں کو بتانے کے لیے چیزوں کے نام رکھے ہیں اور ان کے بارے میں بیان کیا ہے۔ انھوں نے زبان کے نظریات، زبان کے حصول، یونیورسل گرامر، فطری زبان اور ابتدائی عمر میں زبان سیکھنے جیسے امور پر گفتگو کرتے ہوئے یہ واضح کیا کہ کس طرح انسان زبان سیکھنے کے لیے پہلے سے تیار ہوتا ہے اور زبان کے بنیادی اصولوں کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ پروفیسر چومسکی کے مطابق انسانی دماغ نشو و نما کے عمل کے مخصوص مراحل میں زبان کو تیزی سے سیکھنے کے لیے تیار ہوتا ہے۔ زبان کے حصول اور فروغ میں ادراک کے کردار پر بات کرتے ہوئے انھوں نے لسانی عوامل پر روشنی ڈالی جو عام ذہنی

ترقی کو متاثر کرتے ہیں۔ پروفیسر چومسکی نے کہا ''زبان کو ادراک کے ایک پہلو کے طور پر اور اس کی نشو ونما کو ادراک کی نشو ونما کے ایک پہلو کے طور پر بیان کیا جاسکتا ہے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 12 فروری 2022

تملناڈو

اردو صحافت کے جدید طریق کار

مدراس: شعبہ عربی، فارسی و اردو، مدراس یونیورسٹی میں اردو صحافت کے جدید طریق کار پر تربیتی پروگرام کا انعقاد عمل میں آیا۔ اجلاس کی صدارت فرماتے ہوئے پروفیسر

قاضی حبیب احمد، ڈائرکٹر مرینا کیمپس نے طلبا کو زبان کی اہمیت و افادیت پر زور دیتے ہوئے زبان و ادب میں صلاحیت کے ساتھ ساتھ مہارت بھی پیدا کرنے کی ہدایت دی۔ انھوں نے مزید کہا کہ اس پروگرام میں جو لیکچرز پیش کیے گئے موضوعات کے لحاظ سے نہایت اہم تھے۔ شری اپورواورما IAS، سابق اڈیشنل چیف سکریٹری بحیثیت مہمان خصوصی شریک رہے۔ انھوں نے اردو صحافت کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے موجودہ دور میں اردو صحافیوں کی اہمیت وافادیت پر زور دیا۔ شری اپورواورما نے کہا کہ ان کے والد صاحب فارسی اور اردو کے عالم تھے خود انھیں بھی اردو کی تعلیم سے آراستہ ہونے کا موقع فراہم تھا۔ انھوں نے تقریباً آدھ گھنٹہ کی اپنی تقریر میں صحافت کے اصول، عصری تقاضے اور اردو صحافت کی صورت حال پر روشنی ڈالتے ہوئے طلبا کو صحافتی ذمہ داریاں اور روزگار کے حوالے سے معلومات بھی فراہم کیں۔ ڈاکٹر امان اللہ ایم بی نے اس تربیتی پروگرام کی روداد پیش کرتے ہوئے پروگرام میں شریک تمام طلبا کو ان کی کامیابی پر مبارک باد پیش کی اور نظامت کے فرائض بھی انجام دیے۔ Entrepreneurship & Career Hub کے زیر اہتمام منعقدہ یہ تربیتی پرگرام جس میں اردو اور دیگر ہندوستانی زبانوں کے طلبا نے حصہ لیا تھا۔ اس پروگرام کے شرکا کے لیے اردو صحافت کے مختلف پہلوؤں پر لیکچرز آف لائن، آن لائن اور مخلوط طریق پر دیے گئے۔ تقریباً دو ماہ پر مشتمل اس تربیتی پروگرام میں روزانہ ایک گھنٹے پر مشتمل لیکچرز ہوتے رہے۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر امان اللہ ایم بی، شعبہ اردو مدراس یونیورسٹی، 23 فروری 2022

اعزاز و اکرام

چندر بھان خیال

نئی دہلی: اردو کے ممتاز و منفرد شاعر چندر بھان خیال کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ 2021 ان کے مجموعۂ کلام 'تازہ ہوا کی تابشیں' کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ گذشتہ روز جیوری کی میٹنگ میں ہوئے فیصلے کا اعلان کرتے ہوئے اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر کے سری نیواس راؤ نے کہا کہ جیوری ممبران

پروفیسر محمد زماں آزردہ (سری نگر)، پروفیسر طارق چھتاری (علی گڑھ) اور پروفیسر صادق (نئی دہلی) نے میٹنگ کے دوران اتفاق رائے سے چندر بھان خیال کے نام پر مہر لگائی۔ صدارت ساہتیہ اکادمی اردو مشاورتی بورڈ کے کنوینر جناب شین کاف نظام نے کی۔ یہ ایوارڈ ایک لاکھ روپے نقد اور توصیف نامہ پر مشتمل ہے۔ چندر بھان خیال اردو کے ایسے شاعر ہیں جنھوں نے ترقی پسند اور جدید شعری رویوں کی مدد سے معاشرے اور فرد کی ہم رشتگی کو محسوس کیا اور اس طرح ایک نئے شعری ضابطے کی تشکیل کی طرف متوجہ ہوئے اور کامیاب رہے۔ اردو کی نظمیہ شاعری کو ایک نئی صنف سے آشنا کرانے والے چندر بھان خیال کا شمار اردو کے بہترین نظم نگاروں میں ہوتا ہے۔ پیشے سے صحافی چندر بھان خیال کا جنم باہئی (ماکھن نگر)، ضلع ہوشنگ آباد، مدھیہ پردیش میں 30 اپریل 1946 کو ہوا۔ 1966 میں دلی آگئے۔ چند برسوں تک اردو روزنامہ 'سویرا' اور روزنامہ 'تیج' نئی دہلی میں سب ایڈیٹر رہے۔ 1980 میں جب اردو روزنامہ 'قومی آواز' کی اشاعت نئی دہلی سے شروع ہوئی تو وہ اس کے شعبۂ رپورٹنگ سے وابستہ ہوگئے اور لگاتار پچیس برسوں تک خدمت انجام دینے کے بعد 2006 میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ چندر بھان خیال کا پہلا شعری مجموعہ 'شعلوں کا شجر' 1979 میں شائع ہوا جو بے حد مقبول ہوا۔ رسول اللہ حضرت محمدؐ کی سیرت مبارک پر ان کی شاہکار طویل نظم 'لولاک' 2002 میں شائع ہوئی جس کا چرچا ساری دنیا میں ہے۔ کئی شعری مجموعوں کے خالق چندر بھان خیال مدھیہ پردیش حکومت کا اقبال سمان، ساہتیہ اکادمی اور سمسنگ انڈیا کا ٹیگور لٹریچر ایوارڈ، ماکھن لال چترویدی قومی سمان، ایم پی اردو اکادمی کے شعری بھوپالی ایوارڈ اور دلی اردو اکادمی سمیت کئی ریاستی اردو اکادمیوں کی طرف سے اعزازات و انعامات سے نوازے جاچکے ہیں۔ 2004 میں ایران کے مشہد شہر میں عالمی نعتیہ کانفرنس کے دوران انھیں خصوصی اعزاز سے بھی نوازا جاچکا ہے۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ حکومت ہند کے ادارے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (NCPUL) کے وائس چیئرمین بھی رہے۔ دو مرتبہ دہلی اردو اکادمی کی گورننگ کونسل کے ممبر اور ساہتیہ اکادمی کے اردو ایڈوائزری بورڈ کے کنوینر بھی رہے۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 24 فروری 2022

پروفیسر تسنیم فاطمہ

نئی دہلی: سابق پرو وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ ممتاز سائنس داں پروفیسر تسنیم فاطمہ کو آل انڈیا یونانی طبی کانگریس، نئی دہلی نے عالمی یونانی یوم ادویہ کے موقعے پر 'پروفیسر محمد شفیع علیگ بین الاقوامی ایوارڈ 2021' سے سرفراز کیا۔ معروف سماجی و تعلیمی تنظیم فورم فار انٹلکچوئل ڈسکورس کی جانب سے ڈاکٹر خالد مبشر اور منظر امام نے انھیں مبارک باد پیش کی۔

پروفیسر تسنیم فاطمہ کا شمار ہندوستان کی ممتاز نباتاتی سائنس دانوں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تقریباً چالیس سالہ تدریسی خدمات کے دوران کئی اعلیٰ اور معیاری تحقیقی کارنامے انجام دیے۔ انھوں نے سائنو بیکٹیریا سے انسولین نکالا، بایو پلاسٹک تیار کیا، سائٹو پلازمک اسٹریمنگ ویلوسٹی پر مبنی نئی آبی پولیوشن مونیٹرنگ تکنیک دریافت کی، سائنو بیکٹیریا کی اینٹی کینسر سرگرمیوں کا پتا لگایا اور اس کے بایو میڈیکل ایپلی کیشنز کی کھوج کی۔ پروفیسر تسنیم فاطمہ نے کروڑوں کی مالیت پر مشتمل دس اہم تحقیقی منصوبوں کو بھی پایۂ تکمیل تک پہنچایا، جن میں ڈی آر ڈی او، سی سی آر یو ایم، یو جی سی، ڈی ایس ٹی اور آئی سی ایم آر جیسے موقر تحقیقاتی اور تعلیمی ادارے شامل ہیں۔ انھیں یو جی سی کی جانب سے بی ایس آر فیکلٹی فیلوشپ 2021 اور این ای ایس اے کی جانب سے فیلوشپ برائے سال

2019 بھی تفویض کی گئی ہے۔ انھیں معروف ادارے 'رولا ایوارڈس' نے ماحولیاتی بایولوجی اور سائنو بیکٹیریل بایوٹکنالوجی میں بین الاقوامی معیار کی جدید، نادر اور اعلیٰ سطحی تحقیقی خدمات کے اعتراف میں 'انٹرنیشنل ریسرچ چیمپئن ایوارڈ 2019' سے سرفراز کیا ہے۔ پروفیسر تسنیم فاطمہ کو علم نباتات کے ایلگی برانچ میں بیش بہا تحقیقی حصول یابیوں کے اعتراف میں سوسائٹی فور پلانٹ ریسرچ کی جانب سے پروفیسر وائی ایس کے شرما میموریل ایوارڈ اور 2021 میں 'مولانا محمد علی جوہر نیشنل ایوارڈ'، 2012 میں 'سروپلی رادھا کرشن نیشنل ایوارڈ' اور موقر تحقیقاتی ادارے آئی ایم آر ایف انسٹی ٹیوٹ آف ہائر ایجوکیشن اینڈ ریسرچ، انڈیا کی جانب سے '73 ویں یوم جمہوریۂ ہند ایکسی لینس ایوارڈز کے تحت 'پراؤڈ انڈین: ایمینٹ پروفیسر اینڈ ریسرچر ایوارڈ 2022 ان انوائرنمینٹل بایوٹیکنالوجی' سے بھی نوازا گیا ہے۔

ڈاکٹر خالد مبشر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، 14 فروری 2022

سید ذیشان کاظمی

جلال آباد: ضلع شاملی کے قصبہ جلال آباد کے سینئر صحافی سید ذیشان کاظمی کو ممبئی سے شائع ہونے والے اخبار فائٹ اگینسٹ کریمنل کے ہیڈ آفس میں صحافت کے میدان میں ان کی خدمات پر اعزاز سے نوازا گیا۔ اس موقعے پر فائٹ اگینسٹ کریمنل کے چیف ایڈیٹر اور انڈین جرنلسٹس ایسوی ایشن کے ریاستی صدر ایم سعید شیخ، نیوز ایڈیٹر شعیب میاں اور، سینئر کرائم رپورٹر اندرا دیو پانڈے، عظیم شیخ، انظر شیخ، افتخار کاظمی وغیرہ موجود تھے۔ FAC گروپ اور ایڈیٹر/ جرنلسٹ ایسوی ایشن آف انڈیا مہاراشٹر کے ریاستی صدر جناب ایم سعید شیخ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ذیشان کاظمی، سماجی کارکن اور جلال آباد ضلع، شاملی واتراکھنڈ کے سینئر صحافی سید ذیشان کاظمی کو، دلی مبارکباد پیش کی اور نیک خواہشات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 13 فروری 2022

رسم اجرا

دوشعری مجموعوں کا اجرا

نوح / میوات: ممتاز مورخ صادق میو نے کہا ہے کہ شاعر حالات حاضرہ کی منظوم ترجمانی کرتا ہے اور قوم و ملت کے مسائل کے حوالے سے بھی نظمیں اور غزلیں کہتا ہے۔ مورخ موصوف تنظیم فروغ اردو میوات کے زیر انتظام جامعہ صدیقیہ میں منعقد دو شعری مجموعوں کے اجرا کی تقریب کو خطاب کر رہے تھے۔ اس موقعے پر مفتی تعریف سلیم ندوی نے اردو زبان اور نظم گوئی کے تعلق سے تفصیلی مقالہ پیش کیا اور کہا کہ شاعری آمد اور آورد دونوں ہی طرح کی ہوا کرتی ہے کہ خواجہ الطاف حسین حالی جیسا بلند پایہ شاعر کسب یعنی آورد کا قائل ہے جب کہ بہت سے شعرا محض آمد کے قائل ہیں۔ انھوں نے کہا کہ قدیم شعرا کے کلام میں پیغام ہوتا ہے جب کہ نوعمر شعرا پیغام سے زیادہ حسن وعشق کی شاعری کو ترجیح دیتے ہیں۔ واضح ہو کہ مذکورہ دونوں مجموعے تلنگانہ اردو اکیڈمی نے شائع کیے ہیں۔ اس دوران ان شعرا نے سامعین کو اپنے کلام سے بھی محظوظ کیا۔ صدارتی خطاب میں مولانا حکیم الدین اشرف اٹاوڑی نے کہا کہ شاعری تو ایک قدیم فن ہے کہ عہد نبوی میں بھی اس کا وجود رہا ہے۔ ہمیں اپنی شاعری کو با مقصد بنانا چاہیے۔ تقریب کی نظامت راشد امین ندوی نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 فروری 2022

گیتانجلی سے ماخوذ حمدیہ نغموں کے اردو ترجمے کے البم کا اجرا

نئی دہلی: کلکتے کے رابندر سدن میں منعقد پروفیسر محمد زکریا کے البم کے اجرا کے موقعے پر مہمان خصوصی سہیل احمد فاروقی

کے منظوم ترجمہ 'گیتانجلی' کی پذیرائی کرتے ہوئے پروفیسر احمد بدر نے کہا کہ ٹیگور کی گیتانجلی کے جتنے تراجم اردو میں اب تک ہو چکے ہیں، اُن میں سہیل احمد فاروقی کا ترجمہ اپنی معنویت، فن ترجمہ نگاری کی خوبصورتی اور ٹیگور کے اصل متن سے ہم آہنگی کے حوالے سے یقیناً ایک قابل قدر کارنامہ ہے۔ اس جلسے کا انعقاد سوسائٹی فار پروموشن آف آرٹ اینڈ کلچر (اسپارک) کریم سٹی کالج، جمشید پور کے زیر اہتمام رابندر سدن، کولکاتا میں ہوا۔ اس موقعے پر ٹیگور کی گیتانجلی سے ماخوذ حمدیہ نغموں کے اردو ترجمے کی موسیقی سے مزین ڈاکٹر محمد زکریا کے البم کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ پروفیسر محمد ریاض نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ٹیگور کی روح کو اردو میں منتقل کرنے میں ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی اور ڈاکٹر محمد زکریا کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ اس موقعے پر ٹیگور کے نغموں کے ابتدائی بند کا اصل بنگلہ متن اور ترجمہ پنچ جھا کی موسیقی اور محمد زکریا کے ترنم کے ساتھ پیش کیا گیا۔ اس تقریب میں ناہید سلیم اور اُجنتا سرکار کو میڈیا اور موسیقی کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دینے کے لیے سراہا گیا۔ جلسے میں ف س اعجاز، فہیم انور، ڈاکٹر امام اعظم اور اقبال احمد وغیرہ شریک ہوئے۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر خالد مبشر، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی 22 فروری 2022

کشکول نسیم

لکھنؤ: رفیق حسین کے مکان واقع کشمیری محلّہ میں مشہور شاعر اصغر لکھنوی مرحوم کی بیٹی نسیم فاطمہ صاحبہ کے مرتب کردہ کتابچہ کشکول نسیم کا اجرا عمل میں آیا۔ یہ کتاب معلومات عامہ پر مبنی ہے اور قوم کے بچوں کے لیے مفید ہے۔ اس میں انھوں نے اپنی معلومات مستند حوالوں کے ساتھ جمع کی ہیں۔ اس موقعے پر مولانا ظہیر احمد افتخاری، مولانا صدف جونپوری اور شاعر اہل بیت خورشید رضا فتح پوری مولانا عباس مہدی افتخاری، ناہید عالم، ظہیر افتخاری اور رفیق الحسن کے علاوہ معززین نے شرکت کی۔ ظہیر احمد افتخاری نے نسیم فاطمہ صاحبہ کی عرق ریزی اور محنت کو سراہا، مولانا صدف جونپوری نے 'کشکول نسیم' کی افادیت پر روشنی ڈالی، شاعر اہل بیت خورشید رضا فتح پوری نے مندرجات پر سیر حاصل تبصرہ کیا۔ عباس مہدی افتخاری نے قصیدہ پڑھا۔ آخر میں نسیم فاطمہ صاحبہ کی جانب سے رفیق الحسن نے شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 28 فروری 2022

وفیات

خورشید انور عارفی

پٹنہ: معروف صحافی خورشید انور عارفی کا مختصر علالت کے بعد 22 فروری کو لندن میں انتقال ہو گیا۔ مرحوم علاج

کے سلسلے میں کچھ ماہ پہلے اپنے بیٹوں کے پاس لندن گئے تھے۔ مرحوم کی عمر تقریباً 87 سال تھی۔ ان کے پسماندگان میں دو بیٹے اور دو بیٹیاں شامل ہیں۔ دونوں بیٹے ضیا عارفی اور عمران عارفی لندن میں مقیم ہیں، جب کہ ایک بیٹی فرح عارفی کولکاتا میں اور دوسری بیٹی حنا عارفی امریکہ میں مقیم ہیں۔ مرحوم کی تجہیز و تدفین لندن میں ہی وہاں کے وقت کے مطابق بعد نماز ظہر عمل میں آئی۔ مرحوم کی پیدائش 1934 میں ہوئی اور انھوں نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز پٹنہ کے ایک روزنامہ سے 1957 میں شروع کیا تھا۔ 1963 میں اپنی ادارت میں 'صدائے ہند' نام کا ایک ہفت روزہ اخبار نکالا۔ اس کے علاوہ مومن کانفرنس کے ترجمان 'المومن' کی ادارت کی بھی ذمے داری نبھائی۔ دہلی سے نکلنے والے مشہور اخبار 'عوام' کے لیے بھی کالم لکھے۔ اس کے علاوہ مولانا عبدالوحید صدیقی کے کثیرالاشاعت ہفت روزہ 'نئی دنیا' کے لیے بھی مضامین لکھتے رہے۔ خورشید انور عارفی اردو کے ساتھ انگریزی زبان وادب میں بھی کافی مقبول تھے۔ اردو میں ان کی کتاب سفر وسیلہ ظفر، میرے شب و روز، مومن انصار برادری کافی مقبول ہوئیں۔ صحافت کے ساتھ ساتھ خورشید انور عارفی ملی کاموں میں ہمیشہ پیش پیش رہنے والوں میں سے تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی 24 فروری 2022

پروفیسر ایم محمد سہیل

ویلور: پروفیسر ایم محمد سہیل سابق صدر شعبۂ تاریخ اسلامیہ کالج وانمباڑی (تامل ناڈو) کا 17 فروری 2022 کی دوپہر چنئی کے اپولو اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ دوسرے دن بعد نماز جمعہ، شہر کی مسجد نیلی کھیت میں نماز جنازہ ادا کی گئی اور اسی مسجد کے قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ مرحوم کے شاگردان، عمائدین شہر اور کالج کے اساتذہ کرام کے علاوہ دوست و احباب کا بہت بڑا مجمع نماز جنازہ اور تدفین میں شامل رہا۔ مرحوم کے دو فرزند ہیں۔ مجلس تحفظ اردو وانمباڑی کے، سرگرم رکن اور ریاست میں اردو کا حق دلانے کے لیے مختلف انجمنوں، اداروں کے ساتھ تاحیات کوشاں رہے۔ طلبائے عزیز کو ہمہ وقت رہبری کرنا، ہمت افزائی کرنا ان کا شیوہ رہا۔ مرحوم ذیابیطس کی وجہ سے طویل عرصے تک زیر علاج رہے۔ ان کی وفات سے مذہبی، تعلیمی و ادبی حلقوں کو کافی نقصان ہوا ہے۔

پریس ریلیز: سہیل احمد، پرنام بٹ اردو اکادمی تمل ناڈو، 23 فروری 2022

امین جس پوری

جس پور: مشہور شاعر ماسٹر امین جس پوری کا 7 مارچ 2022 کو انتقال ہوگیا۔ وہ تقریباً 6 مہینے سے بیمار تھے۔ وہ سوشل

میڈیا پر متحرک اور فعال تھے۔ صبا آداب کہتی ہیں کہ ادبی فورم پر متحرک رہتے تھے۔ وہ اردو کے فروغ کے لیے ہمہ وقت مستعد رہتے تھے۔ اتراکھنڈ اردو اکادمی کے ایگزیکیٹو ممبر بھی تھے۔ انھیں کئی ایوارڈ بھی مل چکے ہیں۔ ان کے انتقال پر ادب سے جڑے ہوئے لوگوں نے انھیں خراج عقیدت پیش کیا۔

فیس بک اور دیگر ذرائع

جلیس احمد ضیا

رامپور: اردو ادب کے نامور شاعر جلیس احمد ضیا 92 سال کی عمر میں مختصر سی علالت کے بعد مالک حقیقی سے جا ملے۔ وہ 1930 میں رامپور کے قصبہ ٹانڈہ میں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم ٹانڈہ میں مکمل کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے رامپور آگئے جہاں آپ نے گورنمنٹ حامد انٹر کالج میں علامہ شرف زیدی کے زیر نگرانی تعلیم حاصل کی اور آپ کا شمار علامہ صاحب کے خاص تلامذہ میں سے تھا۔ شرف زیدی نواب رضا علی خان کے دور اقتدار میں انفارمیشن آفیسر تھے۔ جگر مرادآبادی کا شرف زیدی سے بڑا قرب تھا، جس کی وجہ سے مرحوم ضیا نے جگر مرادآبادی سے استفادہ کیا اور 1945 میں جگر صاحب کے کہنے پر پہلی بار اپنا کلام کراچی ریڈیو اسٹیشن سے پڑھا۔ آل انڈیا مشاعروں میں آپ کی شرکت باعث فخر سمجھی جاتی تھی، رامپور نمائش کے مشاعروں میں آپ کو خصوصی طور پر مدعو کیا جاتا تھا۔ آپ صبا افغانی، خیال رامپوری، وفاء الرحمٰن جامعی اشرفی کے خاص ساتھیوں میں سے تھے۔ آپ کا انتقال اردو ادب کا عظیم خسارہ ہے۔ آپ کی تدفین بعد نماز عشا ٹانڈہ کے قدیم قبرستان میں ہوئی، جس میں مقامی اور بیرونی لوگوں نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ پسماندگان میں 3 بیٹے اور 5 بیٹیاں ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 17 فروری 2022

پروفیسر شمشاد علی

نئی دھلی: پروفیسر عاصم علی خان، ڈائریکٹر جنرل، سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن، وزارت آیوش، حکومت ہند کے والد پروفیسر شمشاد علی خان کا دہلی کے ایک اسپتال میں تقریباً 83 سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ پروفیسر شمشاد علی خان نے جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی میں 1968 سے 2001 تک اپنی خدمات انجام دیں۔ وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ فزکس میں پروفیسر ہونے کے ساتھ ساتھ مختلف تعلیمی و انتظامی ذمہ داریوں سے بھی وابستہ رہے۔ گزشتہ دو ماہ سے بیمار تھے۔ بدھ کے روز انھیں اسپتال میں داخل کرایا گیا تھا۔ جامعہ برادری نے فزکس کو فروغ دینے میں ہمیشہ کوشاں رہنے والے پروفیسر شمشاد علی خان کے انتقال پر گہرے رنج وغم کا اظہار کیا ہے اور ان کے انتقال کو ناقابل تلافی نقصان قرار دیا ہے۔ پروفیسر شمشاد علی خان کے پسماندگان میں چار بیٹے ہیں۔ ان میں سے ایک پروفیسر عاصم علی خان ہیں جو کہ سی سی آر یو ایم، وزارت آیوش، حکومت ہند کے ڈائرکٹر جنرل ہیں۔ مرحوم متقی، پرہیزگار، ایماندار اور دیانتدار کے ساتھ ساتھ حسن واخلاق کے پیکر تھے۔ نماز جنازہ جماعت اسلامی ہند میں ادا کی گئی اور تدفین شاہین باغ قبرستان میں ہوئی جس میں جامعہ ہمدرد کے وائس چانسلر پروفیسر افشار عالم، ہمدرد لیبارٹریز انڈیا کے سی ای او اینڈ ٹرسٹی حامد احمد، رکن پارلیمنٹ کنور دانش علی کے علاوہ کثیر تعداد میں جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ ہمدرد، یونانی برادری اور سی سی آر یو ایم سے وابستہ افراد نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 فروری 2022

پنڈت بدھسین شرما

پریاگ راج: اردو ادب میں شمار کیے جانے والے بزرگ شاعر پنڈت بدھسین شرما کا 15 مارچ کی صبح کو انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً 85 سال تھی۔ ان کے پسماندگان میں اہلیہ کے انتقال کے بعد اب کوئی نہیں ہے۔ وہ کافی دنوں سے صاحب فراش تھے۔ پریاگ راج میں واقع کریلی کے کریلا باغ میں ان کی رہائش تھی۔ بدھسین شرما 26 دسمبر 1941 کو کانپور میں پیدا ہوئے تھے اور پریاگ راج کے کریلا باغ کالونی میں رہتے تھے۔ طویل علالت کی وجہ سے وہ اپنے شاگرد عشق سلطان پوری کے ساتھ گوری گنج رائے بریلی میں مقیم تھے۔ ان کا علاج وہیں ہو رہا تھا اور وہیں انتقال بھی کرگئے۔ واضح رہے کہ

بدھسین شرما نے آگرہ یونیورسٹی سے گریجویشن کیا تھا۔ انھوں نے روزنامہ پرتاپ، روزنامہ آج، مایا کی منورما میگزین میں بھی کام کیا تھا۔ ان کی زیادہ تر عمر صحافت میں گزری۔ اس کے علاوہ وہ مشاعروں میں شرکت کے لیے بیرون ممالک کا بھی سفر کرچکے تھے۔ انھیں صدر جمہوریہ کے ہاتھوں ساہتیہ شری کا ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔ اس کے علاوہ مقامی اداروں سے کئی ایوارڈ پا چکے تھے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 16 مارچ 2022

بپی لہری

ممبئی: سروں کی ملکہ لتا منگیشکر کی رحلت کے بعد ہندوستانی فلم انڈسٹری ابھی اس صدمے سے سنبھلی بھی نہیں تھی کہ مشہور موسیقار وگلوکار بپی لہری کے انتقال کی خبر سے وہ اور غم میں مبتلا ہوگئی۔ موصولہ اطلاعات کے مطابق منگل کی رات دیر گئے بپی لہری کا

مضافات کے ایک نجی اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ 69 سالہ بپی لہری کو فلمی صنعت میں بپی دا کے نام سے مقبولیت حاصل تھی۔ مغربی بنگال میں پیدا ہوئے، لہری نے سب سے پہلے بنگالی فلم 'دادو' کے لیے موسیقی ترتیب دی تھی اور اپنے بالی ووڈ کیریئر کا آغاز فلم 'ننھے شکاری' سے کیا تھا۔ بپی لہری نے کئی سالوں تک میوزک انڈسٹری پر راج کیا۔ آئی ایم اے ڈسکو ڈانسر، رات باقی، گھنگرو باندھ، بمبئی سے آیا میرا دوست، نینوں میں سپنا، ہم کو آج کل ہے انتظار، تما تما، یاد آرہا جیسی معروف نغمے ان ہی کی دین ہیں۔ بپی ہری کی قسمت کا ستارہ سال 1975 میں فلم 'زخمی' سے چمکا۔ اس فلم میں سنیل دت، آشا پاریکھ، رینا رائے اور راکیش روشن نے مرکزی کردار ادا کیے تھے، جس میں 'آؤ تمھیں چاند پہ لے جائیں' اور 'جلتا ہے جیا میرا بھیگی بھیگی راتوں میں' جیسے نغمے مقبول ہوئے۔ آج بھی ہولی کے موقعے پر 'زخمی دلوں کا بدلہ چکانے' جیسا نغمہ اپنا ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ سال 1976 میں بپی لہری کی میوزک ڈائریکشن میں بنی ایک اور سپرہٹ فلم 'چلتے چلتے' ریلیز ہوئی۔ فلم میں کشور کمار کی آواز میں گانا 'چلتے چلتے میرے یہ گیت یاد رکھنا' آج بھی شائقین کے درمیان اپنی انمٹ شناخت بنائے ہوئے ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 17 فروری 2022

راجکمار رضوی

جھنجھنو: بین الاقوامی غزل گلوکار راجکمار رضوی 6 مارچ کی صبح ممبئی میں انتقال کرگئے۔ وہ راجستھان کے منڈاوا قصبے کے رہنے والے تھے۔ رضوی نے فلم 'لیلیٰ مجنوں' (1976) کے ٹائٹل گانے کے علاوہ بالی ووڈ کی کئی

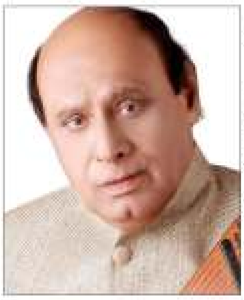

فلموں میں گانوں اور غزلوں کو اپنی آواز دی۔ یہ اطلاع ان کے بھتیجے رمضان رضوی نے دی۔ غزل گائیکی کے بادشاہ مہدی حسن کے پہلے شاگرد راجکمار رضوی آخری بار اپریل 2015 میں اپنے خاندان کے ساتھ منڈاوا آئے تھے۔ اس دوران رضوی نائٹ کا اہتمام ان کی بیٹی گلوکارہ رونا رضوی اور داماد انٹرنیشنل ڈرم آرٹسٹ شیومانی نے کیا۔ اس رات میں راج کمار رضوی ہارمونیم پر ساتھ دیتے نظر آئے۔ انھوں نے راجستھان میں میوزک اکیڈمی کھولنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ انھوں نے کہا کہ تھا کہ منڈاوا آنے سے انھیں خوشگوار احساس ہوتا ہے۔ رضوی موسیقی سے محبت کرنے والے فنکار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ موسیقی کی ابتدائی تربیت والد استاد نور محمد سے لی۔ ان کا تعلق کلاونت گھرانے سے تھا۔ کم عمری میں ہی راجکمار نے اپنے والد کے ساتھ دربار میں گانا شروع کردیا۔ 16 سال کی عمر میں انھوں نے راجستھان کے وزیر اعلیٰ کے سامنے گانا گایا اور خوب داد حاصل کی۔ صاحبزادے کو بھی ستار بہت پسند تھا۔ استاد جمال الدین بھارتی سے ستار بجانا سیکھا۔ اس کے بعد انھوں نے آکاشوانی پر ستار بجانا شروع کیا۔

روزنامہ 'تاثیر' دہلی، 7 مارچ 2022

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا رکی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

150 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر.................. بتاریخ.................. بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرتعاون سالانہ -/150 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کروا دیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

....

پتہ : ....

....

دستخط

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.:magazines@ncpul.in

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

علم البیان: اقسام نثر و نظم

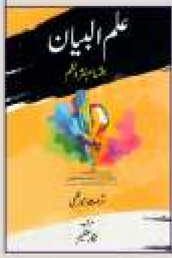

مصنف: ثروت میرٹھی، مرتب: نگار عظیم

پہلی طباعت: 2021

صفحات: 258

قیمت: 140 روپے

دیوان داراشکوہ

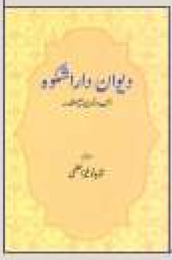

مترجم: شاہد نوخیز اعظمی

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 208

قیمت: 125 روپے

مغربی تعلیم اور مسلمان

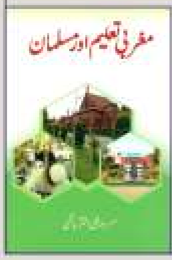

مصنف و مترجم: مسرور علی اختر ہاشمی

دوسری اشاعت: 2021

صفحات: 240

قیمت: 130 روپے

ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیم

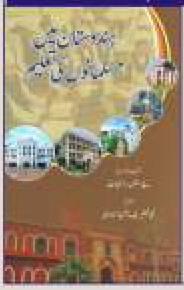

ترتیب و تدوین: جے ایس راجپوت

مترجم: محمد غطریف شہباز ندوی

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 484، قیمت 245 روپے

اچھی صحت کا راز

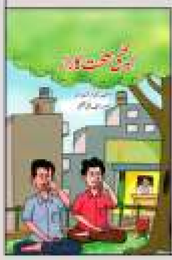

مصنف: فیروز بخت احمد

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 16

قیمت: 20 روپے

عوامی ذرائع ابلاغ ترسیل اور تعمیر و ترقی

مصنف: دیوندر اسر، مترجم: شاہد پرویز

دوسری طباعت: 2021

صفحات: 173

قیمت: 105 روپے

تیمارداری

مصنف: حسین فاروقی

چوتھی طباعت: 2021

صفحات: 262

قیمت: 135 روپے

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

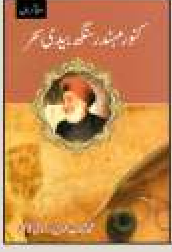

مصنف: محمد شہاب الدین رحمانی قاسمی

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 135

قیمت: 85 روپے

شعبہ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

उर्दू दुनिया, मासिक, अप्रैल-२०२२,वर्ष:२४, अंक:४
URDU DUNIYA Monthly, April-2022, Vol.24, Issue:04
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2020-22
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:**24/03/2022**
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month
Total Pages:100

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326 :A/C، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail : sales@ncpul.in
شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025
LPCDELHI,DELHIPSO,DELHIRMS,DELHI-6